

ولقد یسرنا القرآن للذکر

# آسان درس قرآن

سورہ فاتحہ

از

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خاں پوری دامت برکاتہم العالیہ  
بمقام: مسجد انوار، نشاط سوسائٹی، اڈاجن پاٹیا، سورت۔



ناشر

دارالاحمد ریسرچ انسٹیٹیوٹ

سوداگرواڑہ، سورت، گجرات۔ (الہند)

# تفصیلات

کتاب کا نام:..... آسان درس قرآن  
افادات:..... حضرت اقدس مفتی احمد خانپوری صاحب دامت برکاتہم العالیہ  
تخریج:..... عبدالاحد فلاحی  
پہلا ایڈیشن:..... رجب المرجب ۱۴۳۹ھ مطابق اپریل ۲۰۱۸ء  
دوسرا ایڈیشن: (تصحیح شدہ)..... محرم الحرام ۱۴۴۰ھ مطابق ستمبر ۲۰۱۸ء

PUBLISHERS:

DARUL HAMD RESEARCH INSTITUTE

SODAGARWADA, SURAT

+91 9173103824

darulhamd2017@gmail.com

ملنے کا پتہ

دارالحمدریسرچ انسٹیٹیوٹ، سوداگرواڑہ، سورت۔

## فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
	ابتدائیہ	۱۰
	پس منظر	۱۲
	مقدمہ	۱۳
۱	مقصد تخلیق	۱۳
۲	عبادت کے معنی	۱۴
۳	نبیوں کا سلسلہ	۱۴
۴	وحی	۱۵
۵	نزول کتاب کیسے ہوا.....؟؟؟	۱۶
۶	یہ واقعہ کب پیش آیا؟	۱۷
۷	زملونی زملونی	۱۹
۸	یہ تو وہی فرشتہ ہے	۲۰
۹	وقفہ	۲۱
۱۰	اصلی شکل میں پہلا دیدار	۲۲
۱۱	دثرونی دثرونی	۲۲

۲۳	وحی کے معنی	۱۲
۲۴	وحی کا سلسلہ	۱۳
۲۴	نزولِ وحی کے طرق	۱۴
۲۷	مکی ومدنی سورتیں	۱۵
۲۸	چابی ہمیں دے دیجیے	۱۶
۳۰	سورۃ فاتحہ (قسط-۱)	
۳۰	سب سے پہلے مکمل نازل ہونے والی	۱
۳۱	سورۃ فاتحہ کے مختلف نام	۲
۳۲	سورۃ فاتحہ کے ذریعے دم	۳
۳۵	فضائل سورۃ فاتحہ	۴
۳۵	اگر حضور ﷺ دورانِ صلوٰۃ بلائیں تو.....	۵
۳۶	دونور	۶
۳۷	تعوذ کا حکم	۷
۳۸	تسمیہ کا حکم	۸
۳۹	بسملہ تمام سورتوں کا یا سورۃ فاتحہ کا جزء ہے یا نہیں؟	۹
۴۶	ہم نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں	۱۰
۴۶	سب کا پالنے وار	۱۱



۴۸	سورہ فاتحہ (قط-۲)	
۴۸	ما قبل سے ربط	۱
۴۹	پہلی آیت عقیدہ توحید	۲
۵۰	رحمن الدنیا ورحیم الآخرۃ	۳
۵۱	اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان	۴
۵۳	إلى طاعة الله	۵
۵۴	ماں کی ممتا، ایک سچا قصہ	۶
۵۶	تو میرا بندہ، میں تیرا رب	۷
۵۷	اے میرے بندو!	۸
۵۸	ارحموا من فی الأرض	۹
۵۸	حضرت صدیق اکبرؓ کی بندگی	۱۰
۶۲	ہماری ملکیت مجازی ہے	۱۲
۶۴	جزاء و سزا دونوں ہی اعلیٰ	۱۳
۶۶	سورہ فاتحہ (قط-۳)	
۶۶	ما قبل سے ربط	۱
۶۷	توحید	۲
۶۷	رسالت	۳

۶۸	آخرت	۴
۶۹	أقرب إليه من حبل الوريد	۵
۷۰	اعضاء کی گواہی	۶
۷۱	إن تعدوا نعمة الله	۷
۷۲	پانچ سوالات، ایک نمونہ	۸
۷۴	لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق	۹
۷۵	رب چاہی یا من چاہی	۱۰
۷۶	شراب کی لت کولات	۱۱
۷۸	شراب کی حرمت	۱۲
۷۹	کوئی آپ کو دیکھ رہا ہے	۱۳
۸۱	مجھے پاک کیجیے.....!	۱۴
۸۲	ایک المیہ، کثرت معاصی	۱۵
۸۳	یقین محکم عمل پیہم	۱۶
۸۳	ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں	۱۷
۸۷	سورۃ فاتحہ (قط-۴)	
۸۷	گزشتہ سے پیوستہ	۱
۸۸	واجب الاطاعة کون؟؟؟	۲

۸۹	لکل داءِ دواء	۳
۹۰	تم نے ہم سے کیوں نہیں کہا؟؟	۴
۹۱	ایک مجرب عمل	۵
۹۱	ہر چیز اللہ ہی سے مانگیے	۶
۹۲	دعا نیک، چھپے ہوئے فارم	۷
۹۲	تعلق مع اللہ کا بہترین ذریعہ، دعاء	۸
۹۴	ہم خرماء و ہم ثواب	۹
۹۵	ایک غلط فہمی	۱۰
۹۵	کوئی دھند ہے یا نہیں.....؟؟؟	۱۱
۹۶	ہم تو مائل بہ کرم ہیں	۱۲
۹۷	اللہ کے بھکاری بن جاؤ	۱۳
۹۸	کیسا داتا!! کیسا سخی!!	۱۴
۹۹	حضرت اقدس تھانویؒ کا ایک معمول	۱۵
۹۹	عبادت صرف اللہ کی	۱۶
۱۰۰	براہِ راست	۱۷
۱۰۰	تیری ہی عبادت، اور تجھ ہی سے مدد	۱۸
۱۰۱	اثر کروں یا نہ کروں؟	۱۹

۱۰۱	نظر اللہ پر ہو	۲۰
۱۰۲	بعض کافر بعض مؤمن	۲۱
۱۰۴	سورہ فاتحہ (قط-۵)	
۱۰۴	گزشتہ سے پیوستہ	۱
۱۰۵	ہدایت کے دو معانی	۲
۱۰۶	صراط مستقیم مانگو!	۳
۱۰۷	سب کچھ اس میں آجاتا ہے	۴
۱۰۷	خلاصہ کا خلاصہ	۵
۱۰۸	یہی دعا حدیث میں	۶
۱۰۹	اس دعا سے قبل دو باتوں کا اہتمام کر لے	۷
۱۱۰	عبرة لأولی الألباب	۸
۱۱۱	..... تو دعا نہیں، مذاق ہے	۹
۱۱۴	سورہ فاتحہ (قط-۶)	
۱۱۴	آموختہ	۱
۱۱۵	حقیقی مالک، اللہ	۲
۱۱۶	اجابت از در حق بہر استقبال.....	۳
۱۱۷	آدم بر سر مطلب	۴

۱۱۸	معلومات کو معمولات بناؤ!!!	۵
۱۱۹	صراطِ مستقیم کیا ہے.....؟	۶
۱۲۰	منعم علیہ کون؟	۷
۱۲۲	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۸
۱۲۳	کتاب اللہ اور رجال اللہ	۹
۱۲۴	صحبت ضروری ہے	۱۰
۱۲۵	مثبت و منفی	۱۱
۱۲۶	مغضوب علیہم کون؟	۱۲
۱۲۶	یہود بے بہبود	۱۳
۱۲۷	آمین؛ امت محمدیہ کی خصوصیت	۱۴

## فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
	سورہ کوثر	۱۴
۱	مکی یا مدنی.....؟	۱۴
۲	شان نزول	۱۵
۳	(۱) حضرت زینبؓ	۱۶
۴	(۲) حضرت رقیہؓ	۱۶
۵	(۳) حضرت ام کلثومؓ	۱۶
۶	تین ہجرتوں کی سعادت	۱۷
۷	ذوالنورین	۱۸
۸	(۴) حضرت فاطمہؓ	۱۸
۹	(۱) حضرت قاسمؓ	۱۸
۱۰	(۲) حضرت عبداللہؓ	۱۹
۱۱	جب کوئی زینہ اولاد باقی نہ رہی	۱۹
۱۲	سب سے چھوٹی سورت	۲۰
۱۳	کوثر کیا ہے؟	۲۰

۲۱	جنت کی نہر	۱۴
۲۱	اولاد کی زیادتی	۱۵
۲۲	مجازی اولاد	۱۶
۲۲	تمام علوم پائے	۱۷
۲۳	پہلی خوش خبری	۱۸
۲۴	چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے	۱۹
۲۵	وہی دُم بریدہ ہے	۲۰
۲۶	دو حکم	۲۱
۲۶	نمازِ عید و قربانی واجب ہے	۲۲
۲۷	دشمن کی ناکامی کا غیبی نسخہ	۲۳
۲۷	چند احادیثِ حوضِ کوثر مشک کے مانند خوشبودار	۲۴
۲۸	آسمان کے تارے، کوثر کے پیالے	۲۵
۲۸	ضرور پہچانیں گے	۲۶
۲۹	دو پرنا لے، سونے اور چاندی کے	۲۷
۳۰	جامِ کوثر کس کے لیے	۲۸
۳۲	سورۃ ماعون	

۳۲	وجہ تسمیہ	۱
۳۳	مکی یادنی؟	۲
۳۳	شان نزول مع اختلاف روایات	۳
۳۴	کیا آپ نے دیکھا.....؟؟؟	۴
۳۵	دوبارہ زندگی؛ عقلی دلیل	۵
۳۶	إنمائیأکلون فی بطونہم ناراً	۶
۳۷	معاشرے کا جائزہ لینا چاہیے	۷
۳۸	یتیم کے معاملے میں احتیاط	۸
۳۹	بچوں کے ہدایا کا حکم	۹
۴۰	یتیم کا مسئلہ سنگین	۱۰
۴۰	دے دے یاد دلا دے	۱۱
۴۱	.....تو ترغیب دینا واجب ہے	۱۲
۴۱	نماز سے غفلت؛ تین صورتیں	۱۳
۴۲	بے توجہی	۱۴
۴۳	یہ ایک قدم آگے نکل گیا	۱۵
۴۳	معاون سے مراد	۱۶
۴۴	دوسرا مطلب	۱۷



۴۶	سورہ قمریش	
۴۶	قریش کون ہیں.....؟؟؟	۱
۴۷	قریش کی وجہ تسمیہ	۲
۴۸	وادی غیر ذی زرع میں آباد قوم	۳
۴۹	اہل مکہ پر بہت بڑا انعام	۴
۵۰	تجارت کے دو سفر	۵
۵۱	حرم کی نسبت پر امن و امان	۶
۵۲	تین احسانات	۷
۵۳	ایک سبق	۸
۵۴	ترجمہ	۹
۵۴	دوسرا سبق	۱۰
۵۶	سورہ فیل	
۵۶	وجہ تسمیہ	۱
۵۷	عام الفیل	۲
۵۷	واقعہ فیل	۳
۵۸	یمن میں شاہ حبشہ کی حکومت	۴
۵۸	کنیسہ کی تعمیر	۵

۵۹	ابرہہ کی قسم	۶
۵۹	کعبۃ اللہ کو ڈھانے کی پلاننگ	۷
۶۰	درمیانی طاقتوں سے مقابلہ	۸
۶۰	اہل طائف کی رہنمائی	۹
۶۱	اونٹوں پر قبضہ	۱۰
۶۱	وہ آپ کو نہیں چھوڑے گا	۱۱
۶۲	عبدالطلب کی دعا	۱۲
۶۳	ہاتھی کے کان میں کیا کہا.....؟؟؟	۱۳
۶۳	خدائی لشکر	۱۴
۶۴	ابرہہ کا عبرت ناک انجام	۱۵
۶۴	ارہاص؛ نہ کہ معجزہ	۱۶
۶۵	دفع مضرت اور جلب منفعت	۱۷
۶۶	ترجمہ و وضاحت	۱۸
۶۸	سورہ ہمزہ	
۶۸	وجہ تسمیہ	۱
۶۹	شان نزول	۲
۷۰	العبرة لعموم اللفظ	۳

۴	ہمزہ اور لمزہ کی تحقیق	۷۰
۵	اس کو اپنے مال پر اعتماد ہے	۷۱
۶	تین برائیاں	۷۲
۷	مال کے ذریعے بھی اللہ کا قرب	۷۲
۸	اللہ کی جلالتی ہوئی آگ	۷۲
۹	دلوں کو جلانے والی آگ	۷۳
۱۰	چار گرمیاں	۷۴
۱۱	نا قابل برداشت آگ	۷۵
۱۲	ایک وقت آئے گا	۷۵
۱۳	آج بھی ایسے لوگ ہیں.....!!!	۷۵
۱۴	اہل ایمان کی آزمائش	۷۶
۱۵	فیس بک کا استعمال چھوڑ دیجیے	۷۷
۱۶	یہی اصل جواب ہے	۷۸
	سورہ عصر	۷۹
۱	بقامت کہتر بہ قیمت بہتر	۷۹
۲	زندگی درست کرنے کے لیے	۸۰
۳	شان نزول	۸۰

۸۱	قسم یقین دہانی کے لیے	۴
۸۱	قسم بطور دلیل	۵
۸۲	زندگی ایک تجارت	۶
۸۳	ہو رہی ہے عمر مثل برف کم	۷
۸۴	دوسرا پیے	۸
۸۶	گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹادی	۹
۸۷	چالیس سال سے روٹی نہیں کھاتے تھے!!!	۱۰
۸۸	قرآن پاک کی پچاس آیتیں پڑھ سکتا ہوں	۱۱
۸۹	چار صفات	۱۲
۹۰	..... ہم خسارے سے نہیں بچ سکتے	۱۳
۹۱	جب کوئی برائی دیکھے تو.....	۱۴
۹۱	ہاتھ سے روکنے کا مطلب	۱۵
۹۲	ایمان کا کمزور درجہ	۱۶
۹۲	وصیت کے معنی	۱۷
۹۳	حق بات حق طریقے سے	۱۸
۹۴	سورۃ تکواثر	
۹۴	شان نزول	۱

۹۵	فضیلت	۲
۹۶	تکاثر کیا ہے؟	۳
۹۷	موت کا کوئی انکار نہ کر سکا	۴
۹۷	بڑھ رہا ہے قافلہ جانب قضا کے ہر قدم	۵
۹۸	اصل مقصد	۶
۹۹	ان کو مرنے پہ ہی جینے کا پتہ چلتا ہے	۷
۱۰۰	ترجمہ اور وضاحت	۸
۱۰۱	عین الیقین اور حق الیقین	۹
۱۰۲	تیرا مال تو وہی ہے.....	۱۰
۱۰۳	اس کا منہ قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے	۱۱
۱۰۳	حرص کی انتہا نہیں	۱۲
۱۰۴	غفلت کو دور کرنے کی ضرورت ہے	۱۳
۱۰۴	تندرستی، ہزار نعمت	۱۴
۱۰۵	کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں	۱۵
۱۰۷	پانچ سوالات	۱۶
۱۰۸	پیر آؤٹ ہو گیا ہے	۱۷
۱۰۸	تین دفتر	۱۸

۱۰۹	..... ابھی میری قیمت وصول نہیں ہوئی	۱۹
۱۱۰	میرے فضل سے جنت میں جا	۲۰
۱۱۲	خلاصہ کلام	۲۱
۱۱۳	سورۃ فاترۃ (قسط-۱)	
۱۱۳	وجہ تسمیہ	۱
۱۱۴	جرائم و مظالم سے روکنے والی	۲
۱۱۴	غفلت؛ جرائم و مظالم کا اصل محرک	۳
۱۱۵	فأین الله... فأین الله	۴
۱۱۶	منہ دل بر..... ناپائیدار	۵
۱۱۸	..... تو انسان و جانور میں فرق نہیں	۶
۱۱۸	ترجمہ	۷
۱۱۹	تفسیر	۸
۱۱۹	کوئی ادھر کوئی ادھر	۹
۱۲۰	خطرناک واقعہ	۱۰
۱۲۱	جنت کا حال	۱۱
۱۲۲	من پسند زندگی گزارنے کی جگہ	۱۲
۱۲۴	سورۃ فاترۃ (قسط-۲)	

۱۲۴	ترجمہ	۱
۱۲۵	گذشتہ سے پیوستہ	۲
۱۲۶	..... اب اشکال ختم ہو گیا	۳
۱۲۷	تراز و کیوں قائم کریں گے.....؟؟؟	۴
۱۲۸	عمل کا وزن دیکھیں	۵
۱۲۸	وزن کیسے پیدا ہو.....؟؟؟	۶
۱۲۸	(۱) ایمان	۷
۱۲۹	ایمان کے بغیر وزن نہیں	۸
۱۳۰	(۲) صدق	۹
۱۳۱	تعدیل ارکان	۱۰
۱۳۲	بدعت وزن سے خالی	۱۱
۱۳۳	کھانا تو ہمیں بھیجنا چاہیے	۱۲
۱۳۳	سنت و بدعت، عالم امثال میں	۱۳
۱۳۵	(۳) اخلاص	۱۴
۱۳۵	کتے کو پانی پلانے پر مغفرت	۱۵
۱۳۷	ٹہنی ہٹانے پر جنت کا فیصلہ	۱۶
۱۳۷	نیکی نیکی کو کھینچتی ہے	۱۷

۱۳۸	واردِ روحانی کی کرو قدردانی	۱۸
۱۳۸	ہمیں بھی کرنا چاہیے	۱۹



# فہرست مضامین

صفحہ	مضامین	نمبر شمار
۱۵	ابتدائیہ	
۱۸	سورہ فلق (قسط-۱)	
۱۸	معوذتین	۱
۱۹	بینک میں جمع کرنے کی ضرورت نہیں	۲
۲۱	شانِ نزول	۳
۲۱	بوقتِ ہجرت مدینہ منورہ میں آباد اقوام	۴
۲۲	جب یہود میں زنا کا قصہ ہوا	۵
۲۴	بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے	۶
۲۵	یہود کو حضور کی رسالت کا یقین تھا	۷
۲۵	یعرفونہ کہا یعرفون ابناء ہم	۸
۲۷	اس سے بھی زیادہ	۹
۲۷	یہ ہم میں سے نہیں	۱۰
۲۹	جانتے ہیں، مانتے نہیں	۱۱
۳۰	آپ ﷺ پر سحر	۱۲
۳۲	جادو کا اثر ذاتِ رسالت پر	۱۳

۱۴	جادو کا توڑ؛ دعا کی طاقت	۳۳
۱۵	اللہ نے حل بتلادیا	۳۴
۱۶	أحسن إلى من أساء إليك کی عملی تصویر	۳۴
۱۷	عامل کا کہنا معتبر نہیں	۳۵
۱۸	ایک سبق	۳۶
۱۹	جادو کا حکم	۳۷
	سورہ فلق (قسط-۲)	۳۹
۱	اللہ تعالیٰ کی خاص صفت	۳۹
۲	اللہ ہی کی پناہ حاصل کیجیے	۴۰
۳	تین برائیوں سے پناہ	۴۱
۴	حسی اور معنوی اندھیرا	۴۲
۵	روزِ اول سے انابت کا اہتمام ہو	۴۳
۶	گھٹن؛ حسد کا پہلا درجہ	۴۴
۷	دوسرا درجہ اور اس کا علاج	۴۴
۸	گھٹن کا علاج - (۱) توبہ و استغفار	۴۵
۹	(۲) ترقی کی دعا	۴۵
۱۰	(۳) لوگوں میں تعریف	۴۶
۱۱	یہ خطرناک ہے	۴۷

۴۷	حسد ایک آگ	۱۲
۴۸	حاسد مت پیسے	۱۳
۴۹	آسمان وزمین میں سب سے پہلا گناہ؛ حسد	۱۴
۴۹	حسد، ایک حماقت	۱۵
۵۰	دین کو مونڈنے والی	۱۶
۵۲	سورۃ ناس (قسط-۱)	
۵۲	دونوں سورتوں میں فرق	۱
۵۳	اخروی نقصان بڑا ہے	۲
۵۵	وسوسہ کیسے ڈالتا ہے؟	۳
۵۵	وسوسہ کیا ہے.....؟	۴
۵۶	انسان بھی وسوسہ ڈالتے ہیں	۵
۵۶	گھریلو جھگڑے، ایک وظیفہ	۶
۵۷	نماز کا وسوسہ	۷
۵۸	وضو کا وسوسہ	۸
۵۹	اب تو بغیر وضو کے ہی نماز پڑھوں گا	۹
۵۹	وہم کا علاج	۱۰
۶۱	[۱] پریشانی کے وقت معوذتین کا ورد	۱۱
۶۱	[۲] پریشانی کے وقت پڑھنے کا عمل	۱۲

۶۲	[۳] فرض نمازوں کے بعد پڑھنے کا معمول	۱۳
۶۲	[۴] سفر میں، نمازِ فجر میں	۱۴
۶۳	[۵] رات کا ایک عمل	۱۵
۶۳	[۷] بیماری کا ایک عمل	۱۶
۶۵	سورۃ ناس (قسط-۲)	
۶۵	گزشتہ سے پیوستہ	۱
۶۶	دین دار طبقہ کا سب سے بڑا پرابلم	۲
۶۶	روایاتِ وسوس	۳
۶۸	شیطان بے وقوف تھوڑا ہے	۴
۶۹	وسوسہ کی اقسام-(۱) ایمانیات سے متعلق	۵
۷۰	أمنت بالله	۶
۷۰	و ملئکتہ	۷
۷۱	و کتبہ	۸
۷۱	و رسلہ	۹
۷۲	یہ کھلم کھلا ایمان ہے	۱۰
۷۳	چور اسی گھر میں جاتا ہے	۱۱
۷۳	آئیل مجھے مار	۱۲
۷۴	ایمان سوز لڑپچر سے بچے	۱۳

۷۵	امام محمد بن سیرین کی احتیاط	۱۴
۷۶	ایسا نہیں کرنا چاہیے	۱۵
۷۶	ایمان سے محرومی کا سبب	۱۶
۷۷	حضور ﷺ کا غصہ	۱۷
۷۹	کھڑکی کھلی رہ گئی	۱۸
۷۹	(۲) گناہ اور فسق و فجور سے متعلق	۱۹
۸۰	..... تو کوئی گناہ نہیں	۲۰
۸۱	اللہ کا شکر ہے کہ.....	۲۱
۸۱	اثر یکساں نہیں ہوتا	۲۲
۸۳	جان تو بچ گئی	۲۳
۸۳	بانیکاں بنشیں	۲۴
۸۴	(۳) بے موقع وسوسہ	۲۵
۸۵	نماز؛ ایک شیڈیول	۲۶
۸۵	شیطان بڑا چٹورا یا ہے	۲۷
۸۶	وضو میں اسراف؛ خشوع ختم	۲۸
۸۷	لگے رہو.....	۲۹
۸۷	من جد وجد	۳۰
۸۸	ایں سعادت بزور بازو نیست	۳۱

۸۹	من آنم کہ من دامن	۳۲
۹۰	سورۃ اخلاص	
۹۱	عقیدۃ توحید	۱
۹۱	شان نزول	۲
۹۲	واحد اور احد میں فرق	۳
۹۳	عربی زبان میں مترادف نہیں	۴
۹۳	صمد کا معنی	۵
۹۵	نہ جناء نہ جنا گیا	۶
۹۵	اس کا ہمسر کوئی نہیں	۷
۹۶	فضائل سورۃ اخلاص	۸
۹۶	تہائی قرآن کے برابر	۹
۹۷	اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرماتے ہیں	۱۰
۹۹	جنت میں دو محل	۱۱
۹۹	جنت واجب ہوگئی	۱۲
۱۰۱	سورۃ لہب	
۱۰۱	لہب کے معنی	۱
۱۰۲	ترجمہ سورۃ لہب	۲
۱۰۲	شان نزول	۳

۱۰۳	یا صبا حاہ!	۴
۱۰۴	ابولہب کون تھا.....؟؟؟	۵
۱۰۵	ہر مؤمن کی دلی خواہش	۶
۱۰۶	ابولہب حضور ﷺ کے پیچھے پیچھے	۷
۱۰۸	ابولہب کی بیوی کا مشغلہ	۸
۱۰۸	مال، دولت اور اولاد	۹
۱۰۹	حمالة الحطب سے کیا مراد ہے.....؟؟؟	۱۰
۱۱۰	ام جمیل کی موت	۱۱
۱۱۰	حضور ﷺ کی بیٹیوں کو طلاق	۱۲
۱۱۲	ان سے زیادہ سچا کوئی نہیں	۱۳
۱۱۳	تین ہجرتیں	۱۴
۱۱۳	ذوالنورین	۱۵
۱۱۴	ابولہب کا عبرت ناک انجام	۱۶
۱۱۵	وہ مجھے نہیں دیکھ سکے گی	۱۷
۱۱۶	میں مذم نہیں، محمد ہوں	۱۸
۱۱۷	میں نے اللہ سے ان دونوں کو مانگ لیا ہے	۱۹
۱۱۷	ابولہب کی کنیت کیوں.....؟؟؟	۲۰
۱۱۸	درس عبرت	۲۱

۱۱۹	سورہ نصر (قسط-۱)	
۱۱۹	ترجمہ سورت	۱
۱۲۰	فتح مکہ سے قبل یا اس کے بعد؟	۲
۱۲۱	آپ ﷺ کے معمول میں تبدیلی	۳
۱۲۲	دعوت پر مخالفت و اذیت	۴
۱۲۳	میری مدد کرو.....	۵
۱۲۳	.....تب ہم تم پر غالب آئیں گے	۶
۱۲۴	بیعت عقبہ اولیٰ	۷
۱۲۵	بیعت عقبہ ثانیہ	۸
۱۲۶	ہجرت	۹
۱۲۶	آپسی لڑائی کی ہوگئی صفائی	۱۰
۱۲۷	حضور ﷺ کا خواب	۱۱
۱۲۷	صلح حدیبیہ	۱۲
۱۲۸	خدا کی قسم! یہ فتح ہے	۱۳
۱۲۹	عہد شکنی	۱۴
۱۳۰	فتح مکہ کے لیے روانگی	۱۵
۱۳۱	ابوسفیان کی گرفتاری اور قبول اسلام	۱۶
۱۳۱	اليوم يوم المرحمة	۱۷



۱۳۳	تواضع و انکساری کی لاجواب مثال	۱۸
۱۳۴	منہ کے بل گر کے.....	۱۹
۱۳۵	لا تشریب علیکم الیوم	۲۰
۱۳۷	وفود کی آمد	۲۱
۱۳۷	بشارت یا خبر	۲۲
۱۳۷	آپ نے سورت پڑھ کر سنائی تو کیا ہوا.....؟؟؟	۲۳
۱۳۸	میں بھی یہی سمجھتا ہوں.....	۲۴
۱۴۰	سورہ نصر (قسط-۲)	
۱۴۰	گذشتہ مجلس میں	۱
۱۴۱	جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے	۲
۱۴۲	انسان کے بس کی بات نہیں	۳
۱۴۳	یہ نہ کہیے	۴
۱۴۳	گا ہک کون بھیجتا ہے؟	۵
۱۴۴	کرشمہ قدرت کا	۶
۱۴۴	تانا بخشد خدائے بخشنده	۷
۱۴۵	پھر کبر پیدا نہ ہوگا	۸
۱۴۵	کامیابی کے بعد دو کام کرے	۹
۱۴۶	شیطان کبر کی راہ سے برباد کرتا ہے	۱۰

۱۴۶	جس نے زخم کھا کر پھول برسائے	۱۱
۱۴۷	رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز	۱۲
۱۴۹	ترا مال و نعمت فزاید ز شکر	۱۳
۱۵۰	بدست آوری دولت جاوداں	۱۴
۱۵۰	نفس جز بہ شکر خدا بر میار	۱۵
۱۵۱	ہماری حالت	۱۶
۱۵۱	ذرا سا بخار آگیا ہے.....	۱۷
۱۵۲	بخار بھی نعمت ہے..... کیسے؟	۱۸
۱۵۲	تو چاہتا تو.....	۱۹
۱۵۳	پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا	۲۰
۱۵۵	استغفار کیوں.....؟؟؟	۲۱
۱۵۷	<b>سورہ کافرون (قسط-۱)</b>	
۱۵۷	شانِ نزول	۱
۱۵۹	سورت کا ترجمہ	۲
۱۶۰	دونوں جملوں کا مطلب مختلف ہے	۳
۱۶۲	تقدّم کر	۴
۱۶۲	دین سے کیا مراد ہے.....؟؟	۵
۱۶۳	مجھ سے یہ امید نہ رکھنا	۶

۱۶۴	فضائل سورہ کافرون	۷
۱۶۴	فجر کی سنت میں	۸
۱۶۴	تحیۃ الطواف میں	۹
۱۶۴	مغرب کی سنت میں	۱۰
۱۶۵	خستہ حالی سے خوش حالی تک	۱۱
۱۶۶	چوتھائی قرآن	۱۳
۱۶۶	بچھو کے زہر کا تریاق	۱۴
۱۶۶	ایسی صلح ناممکن	۱۵
۱۶۷	ایک اصول	۱۶
۱۶۹	سورہ کافرون (قسط-۲)	
۱۶۹	گذشتہ سے پیوستہ	۱
۱۷۰	ترجمہ و مطلب	۲
۱۷۱	پہلا سبق؛ یہ اللہ تعالیٰ کو ماننا نہیں ہے	۳
۱۷۴	یہ بھی شرک ہے	۴
۱۷۵	حضور ﷺ کی تنبیہ	۵
۱۷۵	اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف	۶
۱۷۶	مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں	۷
۱۷۶	چو کنار ہیے !!!	۸

۱۷۷	۹	شرکیہ عمل کے لیے ہم تیار نہیں، مفکر اسلام
۱۷۸	۱۰	دوسرا سبق، شریعت کے حکم بدلے نہیں جاسکتے
۱۷۹	۱۱	لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق
۱۸۰	۱۲	کاش میری سوچائیں ہوتیں، ایک دل سوز واقعہ
۱۸۱	۱۳	اس کی اجازت ہے

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## ابتدائی

حضرت الاستاذ مرشدی و محسنی مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دام ظلہم کی ہفتہ واری مجلس سورت کی عمر الحمد للہ ۲۲ سال ہو گئی۔ اس وقفہ میں فضل و توفیق الہی سے ریاض الصالحین، الادب المفرد، شمائل ترمذی اور صحیح بخاری کی کتاب الرقاق کے دروس حضرت اقدس زید فضلہم نے دیے۔ کتاب الرقاق کے اختتام کے بعد کیا شروع کیا جائے؟ یہ مسئلہ محترم و کرم جناب الحاج بلال منیار صاحب نے بعنایت ایزدی حل فرما دیا کہ استاذ مکرم و شیخ محترم کو درس قرآن کے لیے آمادہ فرما ہی لیا، آں محترم ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

فجزاکم اللہ.

چنانچہ گزشتہ تین ماہ سے درس قرآن ہو رہا ہے۔ پہلی مجلس میں حضرت دام مجہم نے ایک پر مغزو جامع مقدمہ بیان فرمایا۔ اس کے بعد والی مجلس میں سورۃ فاتحہ کا درس شروع ہوا۔ اللہ کی توفیق سے ہر ہفتہ کا درس نیا درس ہونے سے قبل لکھوا لینے کا التزام پہلے ہی دن سے رکھا اور اسے لفظ بلفظ بلکہ حرف بحرف حضرت بھی ملاحظہ فرماتے رہے، تصحیحات کرتے رہے۔ سورۃ فاتحہ مکمل ہوئی تو وہ کتابی شکل میں بھی تیار تھی، حضرت نے اشاعت کی اجازت بھی مرحمت فرمادی، تو تخریج کا کام شروع کروایا گیا۔ جس کو مولانا عبدالاحد راندیری فلاحتی سلمہ نے بخوبی انجام دیا۔ اب الحمد للہ پریس میں جانے کو ہے۔

مولانا انور پارکھیتی سلمہ ہر ہفتے ریکارڈنگ کو عرض سے جوہر کی شکل دے دیتے ہیں، مولانا داود میمن اسے مزید نکھار کر نظر ثانی کے لیے مجھے دیتے ہیں، یہاں سے صاف

ستھری ہو کر تحریر حضرت کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے، تب یہ مجموعہ حرفِ آخر ہوتا ہے۔  
اللہ تعالیٰ ان سب ہی احباب و بزرگوں کو دارین میں اپنے شایانِ شان اجر عظیم سے مالا مال فرمادے۔ ان کی نسلوں کو دینی علمی و ملی کاموں کے لیے قبول فرمائے۔

”دارالحمز“ اس سعادت کے حصول پر سر بسجود ہے اور حمد و شکر کے جذبات سے لبریز ہے۔  
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا انْكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ وَتَبَّ عَلَيْنَا انْكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔

طاہر سورتی

شب یکم شعبان ۱۴۳۹ھ

۱۷/۱ اپریل ۲۰۱۸ء

باسمہ تعالیٰ

## ابتدائی

آسان درس قرآن جزو دوم پریس کے حوالے ہونے کو ہے، تب دل جذبات شکر سے لبریز ہے، توفیق ہے اللہ الرحمن ورحیم کی کہ نوبت بایں جا رسید۔ **فالحمد للہ علی ذلک**۔ رب کریم بعافیت اس سلسلہ کو جاری رکھ کر تکمیل تک پہنچائے۔ اور مرشدی و محسنی حضرت الاستاذ دام محمد ہم و ملہم و غلامہ کو بصحت و قوت رکھے کہ درس کا یہ عمل پورے قرآن مجید کو محیط ہو جائے۔ الحمد للہ جزء اول کا پہلا ایڈیشن ختم ہونے کو ہے۔ قدر دان حضرات سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ اسے خرید کر **دارالاحمد** اور اس کے عملہ کی حوصلہ افزائی فرما کر آپ بھی اس کا رخیہ میں برابر کے شریک بنیں۔ الحمد للہ ہمارا مقصد تجارت نہیں ہے۔ اسی لیے کتاب کا ریٹ زیادہ نہیں رکھتے، بس ضروری خرچ نکل آئیں، اور کچھ برکت مزید ہو جائے تاکہ اداروں اور ارباب فضل و کمال کے اعزاز و اکرام کی کچھ صورت ہو جائے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ درس قرآن ہر مسجد میں کرنا ہے۔ اس کی مہم جامعہ ڈابھیل سے چلائی گئی ہے۔ حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی جولائی کے اواخر میں تشریف لائے تھے، سہ روزہ سیمینار ہوا تھا، آخری دن کا موضوع یہی تھا۔ اس میں خود مہمان معظم نے اور سب سے اخیر میں میزبان محترم حضرت مفتی صاحب **دامت برکاتہم** نے میثاق و معاہدہ ہی لیا کہ ہر شخص اپنی جگہ جا کر درس قرآن کا کام شروع کرے گا۔ کوئی مسجد ایسی باقی نہ رہے، جس میں درس قرآن نہ ہوتا ہو۔ تاریخ کو دہرانا ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں دلی میں یہ منظر تھا کہ وہاں کی بیشتر مساجد میں درس قرآن ہوتا تھا۔ (حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب **دامت برکاتہم** بحوالہ مولانا مناظر احسن گیلانی)

تو یہ کتاب اس میں آپ کی معاون ثابت ہوگی۔ کچھ کرنا نہیں ہے۔ کرسی پر بیٹھ کر لوگوں کو چند صفحات پیشگی مطالعہ کر کے سنا دیں۔ ہر شخص سے دست بستہ مؤدبانہ یہ عرض ہے جو ان سطور کو پڑھ رہا ہے کہ اپنے آپ کو اس مہم کا حصہ بنائیں۔ اور جامعہ ڈابھیل یا دارالاحمد کو اس کی باقاعدہ اطلاع بھیجیں کہ کس گاؤں کی کس مسجد میں آپ نے یہ سلسلہ جاری فرمایا۔ جو حضرات پہلے سے درس قرآن عمومی دے رہے ہیں، وہ بھی مطلع فرمائیں کہ کب سے اور کہاں یہ کام کر رہے ہیں۔ اپنے حلقہ احباب میں اس مشن کی خوب دعوت چلائیں۔ اور قرآن کریم سے امت کو براہ راست مستفید ہونے کی راہ فراہم کریں کہ یہ ہماری ذمہ داری ہے، فرض منصبی ہے۔ اس کے بغیر ہم سبک دوش نہ ہوں گے۔

حضرت اقدس مرشدی طال بقاء ہم بالعمافیہ ہر ہفتہ پابندی اور اہتمام سے گذشتہ ہفتہ کا درس حرفاً حرفاً ملاحظہ فرماتے ہیں، اور اس میں ضروری اور مناسب اصلاحات سے نوازتے ہیں۔ اس کے بعد ہی مسودہ حرف آخر ہوتا ہے۔ **فجزاہم اللہ خیراً**۔

عزیزم مولانا انور صاحب پارکھتی، مولانا داود میمن اور مولانا عبدالاحد فلاحتی **سلمہم اللہ** نے اس جزء کے لیے بھی اپنے اپنے حصہ کی خدمات فراہم کیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو اجر عظیم سے نوازے۔

آپ حضرات کے مشوروں، ہدایات و اصلاحات کا تاہنوز انتظار ہے۔ **والانتظار**  
**أشدمن الموت الأحمر**۔ اللہ کچھ تو بولے!! کچھ تو لکھیے!! جو بھی لکھنا ہو آپ آزاد ہیں۔  
 پہلی قسط کی طباعت کے وقت، اس کے سب سے بڑے قدردان محبوبی و معظمی،  
 مشفق و محسنی حضرت مولانا عبداللہ صاحب کا پودروی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ میری حوصلہ افزائی کے لیے موجود تھے۔ افسوس کہ آج حضرت نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ پر بے شمار رحمتیں نازل



فرمائے۔ اور جو احسانات و شفقتیں مجھ پر فرمائیں، ان کا بھرپور جزاء خیر عطا فرمائے۔ آمین  
ہمارے دارالحمہ کے مستقل معاونین کے لیے بھی سب ہی سے دعا کی درخواست  
ہے۔ یہ حضرات ہر ماہ پابندی سے اپنی متبرک اللہ رقوم سے ہماری ہمت بڑھاتے ہیں۔

فجزاھم اللہ خیر

اس درس کی خصوصیات پر تو ان شاء اللہ بعد میں اطمینان سے لکھوں گا۔ ابھی سر  
دست اتنا عرض کر دوں کہ:

✽ جس انسان نے اپنی زندگی نصف صدی سے زائد میدان تدریس میں مکمل کامیابی  
کے ساتھ پوری شان و وقار سے بتائی ہو۔

✽ جس کی احتیاط کا یہ عالم ہو کہ کوئی درس بھی بغیر تیاری کے نہ دیا ہو۔

✽ جس کا نظریہ ہو کہ بغیر تیاری کے سبق پڑھانا خیانت ہے۔

✽ جس کا تقویٰ و پارسائی ایک اجماعی مسئلہ بن چکا ہو۔

✽ جو شبہ تا شبہ آدھے گھنٹے کے درس کے مطالعے کے لیے ہوم ورک کرتا ہو۔

✽ جو اس درس کی کامیابی و مقبولیت عند اللہ کے لیے خود بڑے اہتمام سے دعا کرتا کرنا ہو۔

اس کے بیان میں جتنی خوبیاں جمع ہوں؛ کم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نظر بد سے محفوظ رکھے۔

دارین میں اجر عظیم سے نوازے۔ اور پوری امت کو حقیقی قدر نصیب فرمائے۔ آمین۔

محمد طاہر سورتی

۱۲ ذی الحجہ ۱۴۳۹ھ

۲۳ اگست ۲۰۱۸ء

شب جمعہ

## پس منظر

(یہ کلمات حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ نے کتاب الرقاق کے اختتام پر درس قرآن شروع کرنے کے پس منظر کے طور پر ارشاد فرمائے تھے)

الحمد للہ! کتاب الرقاق پوری ہوئی۔ میرا جب بھی حرم جانا ہوتا ہے تو میرے ایک کرم فرما ہیں: حاجی بلال منیار صاحب، جو مکہ مکرمہ میں رہتے ہیں، تو جب بھی میرا جانا ہوتا ہے تو مجھ سے پوچھتے ہیں: آج کل کون سی کتاب کا درس چل رہا ہے؟ وہ کب ختم ہونے والی ہے؟ اس سے قبل بھی جب اسباق جاری تھے تو کہتے تھے: اب آپ قرآن کی تفسیر شروع کر دیجیے، اور میں ہمیشہ یہ کہتا ہوں کہ مدرسہ میں نصاب میں بھی کبھی ترجمہ یا جلالین پڑھانے کی نوبت نہیں آئی۔ مجھے قرآن کے متعلق بڑا ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی بات ادھر ادھر نہ ہو جائے، ہمیشہ سہم رہتا ہے، لیکن ان کا بڑا اصرار رہتا ہے۔

اب کی مرتبہ بھی جب محرم میں جانا ہوا تھا تو پھر یہی پوچھا تھا، اور ان کا اصرار تھا۔ تو اب تو کلاً علی اللہ! میں نے یہ نیت کی ہے کہ۔ ان شاء اللہ۔ اب درس قرآن شروع کریں گے اور ایک ترتیب سے نہیں؛ بلکہ مختلف جگہوں سے کریں گے۔

آپ حضرات دعا کیجیے! اللہ تعالیٰ اس کو آسان فرماوے، اور اس کی برکتوں سے مجھے اور آپ سب کو اللہ تعالیٰ نوازے، اور صحیح نیت کے ساتھ اس کو پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ قرآن پاک کے درس کی برکات اللہ تعالیٰ مجھے بھی نصیب فرمائے اور آپ کو بھی۔ اور اس سلسلہ میں کوئی ایسی بات جو اللہ کے کلام کی شان سے ہٹ کر ہو، اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آپ سب دعاؤں کا اہتمام کریں۔

## مقدمہ

مؤرخہ: ۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۰/ جنوری ۲۰۱۸ء شب یکشنبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنُسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ شُرُوْرَ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاَتِ اَعْمَالِنَا وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ شُرُوْرَ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاَتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّہْدِہٖ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُضِلّْہٗ فَلَا هَادِیَّ لَہٗ وَ نَشْہَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ حْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْہَدُ اَنْ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہٗ اِلٰی کَافَّةِ النَّاسِ بِشَیْرِ اَوْ نَذِیْرٍ اَوْ دَاعِیًا اِلٰی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُنِیْرًا صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَ بَارَکْ وَ سَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ۔

فَاعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اَنَا اَوْ حَیْنًا اِلَیْکَ کَمَا اَوْ حَیْنًا اِلٰی نُوحٍ وَ النَّبِیِّیْنَ مِنْ بَعْدِہٖ ۝ (النساء) وَ قَالَ تَعَالٰی : شَہْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اَنْزَلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَ الْقُرْاٰنِ ۝ وَ قَالَ تَعَالٰی : اَنَا اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۝ (القدر / ۱) وَ عَنْ اَبِی ہریرۃ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ : مَا مِنْ اَلَنْبِیَّاءِ نَبِیٍّ اِلَّا اُعْطِیَ مَا مِثْلُہٗ اَمِنْ عَلَیْہِ الْبَشَرُ وَ اِنَّمَا كَانَ الَّذِیْ اُوْتِیْتُ وَ حَیًّا اَوْ حَاہِ اللّٰہُ اِلَیَّ فَآؤُ جُوْا اَنْ اَکُوْنَ اَکْثَرُھُمْ تَابِعًا یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ (اخر جہ البخاری برقم: ۴۶۹۲ و مسلم برقم ۱۵۲)

## مقصد تخلیق:

اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی عبادت اور اطاعت کے لیے پیدا فرمایا ہے، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (میں نے جنوں اور

انسانوں کو اپنی عبادت اور اطاعت کے لیے پیدا کیا)

## عبادت کے معنی:

عبادت کس کو کہتے ہیں؟ الطاعة مع الخضوع (فروتنی یعنی اپنے آپ کو جھکاتے ہوئے) (۱) کسی کی فرماں برداری کرنا اسی کو طاعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہذا طاعت کے لیے وہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے بتلایا، اُسی کی طرف سے عبادت اور طاعت کا مطالبہ ہے، اگر ہم کوئی ایسا طریقہ اختیار کریں، جو اللہ کو ناپسند ہو پھر وہ طاعت کیا ہوئی؟ اس لیے کہ جس کی طرف سے مطالبہ ہے اس کو تو یہ ناپسند ہے، تو اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق ہمیں اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری کرنی ہے۔

## نبیوں کا سلسلہ:

اب یہ کیسے معلوم ہو کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کو فلاں چیز پسند ہے اور فلاں چیز ناپسند ہے؟ ہم اپنے جیسے انسانوں کی پسند اور ناپسند کو اپنی عقل کے ذریعہ معلوم نہیں کر سکتے، حالاں کہ وہ ہم جیسے انسان ہیں، تو پھر اللہ تبارک و تعالیٰ کو کیا چیز پسند ہے اور کیا چیز ناپسند ہے وہ عقل کے ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ خود ہی نہ بتلائیں، اب اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات تو بڑی بزرگی والی، بڑی عالی مقام ہے، ہر کس و ناکس اللہ تبارک و تعالیٰ سے خطاب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اور نہ ہی اس کے اندر اس کی اہلیت

(۱) معانی القرآن وإعرابه للزجاج ۴۸/۱ (ط: عالم الكتب بیروت)، والوسیط للواحدی ۶۸/۱

(ط: دارالکتب العلمیہ بیروت) تفسیر البغوی ۷۵/۱ (ط: داراحیاء التراث العربی بیروت)

ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ ہی نے محض اپنے فضل و کرم سے انسانوں میں بعض حضرات کو چنا، اور اپنے احکام بذریعہ وحی ان پر نازل فرمائے، اور ان کو اس بات کا مکلف بنایا کہ ان احکامات کو اللہ کے بندوں تک پہنچائیں، اسے سمجھائیں، چنانچہ جو حضرات اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس خدمت کے لیے چنے گئے ان کو حضرات انبیاء اور حضرات رسل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جب سے انسان کا وجود ہوا ہے، تب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے، سب سے پہلے نبی، سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام ہیں۔ پھر یہ سلسلہ جاری رہا، مختلف زمانوں میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے مختلف انسانوں کو اپنا نبی اور رسول بنایا، ان پر کتب و صحائف بھی نازل فرمائے، اور حضور اکرم ﷺ اللہ تبارک و تعالیٰ کے آخری نبی ہیں، اب آپ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں، نبوت کا سلسلہ حضور اکرم ﷺ پر مکمل ہو چکا۔

## وحی:

آپ ﷺ پر جو کتاب بذریعہ وحی قرآن پاک کی شکل میں نازل کی گئی وہ آخری کتاب ہے، اب دوسری کوئی کتاب آنے والی نہیں ہے، اس کتاب نے اگلی تمام کتابوں کے احکام کو منسوخ کیا ہے۔ یہ قرآن پاک اللہ تبارک و تعالیٰ نے بذریعہ وحی نبی کریم ﷺ پر نازل فرمایا۔ وحی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے فرشتوں کے ذریعہ یا دوسرے طریقوں سے اپنے منتخب اور چنیدہ بندوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے اللہ تبارک و تعالیٰ راضی ہوتے ہیں، اور یہ وہ باتیں ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں، وہی چیزیں حضرات انبیاء انسانوں تک پہنچاتے ہیں اور ان کو اس کا مکلف کیا جاتا ہے۔

## نزول کتاب کیسے ہوا.....؟؟؟

اب آخری کتاب (قرآن کریم) کب نازل ہوئی؟ بخاری شریف میں روایت ہے: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر وحی کی ابتداء سچے خوابوں کے ذریعہ ہوئی، چھ مہینے ایسے گزرے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے روزانہ رات میں آپ کو ایسے خواب دکھلائے جاتے تھے جو دن میں ہو بہو، صاف صاف وجود میں آ جاتے تھے، اس کی تعبیر کی ضرورت نہیں تھی، کھلم کھلے ہوتے تھے، کفلق الصبح صبح کی روشنی کی طرح، جیسے وہ واضح اور صاف ہوتی ہے اسی طرح وہ خواب بھی بالکل واضح حقائق کی شکل میں آپ کے سامنے آ جاتے تھے، چھ مہینے یہ سلسلہ رہا۔ پھر اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے آپ پر خلوت پسندیدگی ڈال دی گئی۔<sup>(۱)</sup> یعنی آپ کے دل میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ تقاضہ اور داعیہ پیدا فرمایا کہ آپ تنہائی میں، خلوت میں، اللہ تبارک و تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوں، چنانچہ اس خلوت گزینی کے لیے نبی کریم ﷺ نے غار حرا کا انتخاب فرمایا، شراح حدیث نے لکھا ہے کہ اسی غار میں آپ کے دادا خواجہ عبدالمطلب بھی خلوت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے، کعبۃ اللہ سے تین میل کی دوری پر، منیٰ جاتے ہوئے بائیں ہاتھ پر جبل نور کے نام سے ایک پہاڑ واقع ہے، اس کے اوپر یہ غار ہے، یوں سمجھیے! ایک بنا بنایا کمرہ ہے جس میں آسانی سے ایک آدمی کھڑا رہ سکتا ہے، اور اللہ کی عبادت کر سکتا ہے، اس میں ایک سوراخ بھی ہے، جس سے سیدھا کعبۃ اللہ نظر آتا تھا۔ اب تو عمارتوں کی وجہ سے وہ بات نہیں رہی۔ نبی کریم ﷺ اسی غار میں اللہ کی عبادت کے لیے تنہائی میں قیام کرتے تھے اور اللہ کی

(۱) آخر جہ البخاری فی بدء الوحي برقم: ۳.

عبادت میں خلوت گزینی کے طور پر مشغول ہوتے تھے، چند دنوں کا توشہ اپنے ساتھ لے جاتے تھے، پھر چند دنوں کے بعد جب گھر والوں سے ملاقات کا تقاضہ پیدا ہوتا، تو آپ گھر واپس آتے، اور چند دنوں کا توشہ لے کر دوبارہ جاتے، اس طرح یہ سلسلہ جاری تھا۔

اسی دوران ایک مرتبہ حضرت جبریلؑ اسی غار میں آپ کے سامنے نمودار ہوئے، اور کہا: اقرء، آپ پڑھیے! تو حضور اکرم ﷺ نے جواب میں فرمایا: ما انا بقارئ، میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، تو حضرت جبریلؑ نے حضور اکرم ﷺ کو اپنے سینے سے چمٹا کر کے بھیجا، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ: ایسا بھیجا کہ میری طاقت جواب دے گئی، پھر چھوڑ دیا اور فرمایا: اقرء، پڑھیے! حضور ﷺ نے وہی جواب دیا، انھوں نے دوبارہ اپنے سینے سے لگا کر چمٹایا اور بھیجا، اور اب کی مرتبہ بھی اسی طرح طاقت انتہا کو پہنچ گئی، جواب دے گئی، اور پھر چھوڑا اور فرمایا: اقرء، تو آپ نے فرمایا: ما انا بقارئ۔ تیسری مرتبہ اسی طرح ہوا، اور چوتھی مرتبہ سورہ اقرأ کی پہلی پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔<sup>(۱)</sup> یہ پہلی وحی تھی، جو غار حرا کے اندر آپ پر نازل ہوئی، یہ پہلا موقع تھا جس میں آپ کو فرشتے سے واسطہ پڑا، اور وہ بھی غار کی تنہائیوں میں، اور اچانک یہ واقعہ پیش آیا، جس کی وجہ سے آپ ﷺ کی طبیعت مبارکہ پر ایک خوف اور گہرا ہٹ سی طاری ہو گئی، اور آپ ﷺ کا قلب مبارک کانپنے لگا، اسی حالت میں آپ ﷺ گھر تشریف لے گئے۔<sup>(۲)</sup>

## یہ واقعہ کب پیش آیا؟

یہ واقعہ کب پیش آیا؟ اس سلسلہ میں اہل سیر کے دو قول ہیں: (۳) علامہ ابن عبد البر

(۲، ۱) أخرجه البخاری فی بدء الوحي برقم: ۳.

مالکیؒ - صاحب الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب - فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ ۸ / ربیع الاول کو پیر کے دن پیش آیا، اس اعتبار سے نبی کریم ﷺ کی عمر شریف پورے ۴۰ سال اور ایک دن ہے۔ (۱)

(۲) دوسرا قول محمد بن اسحاقؒ - جو امام المغازی کہے جاتے ہیں - کا ہے کہ پیر کا دن تھا اور رمضان کی ۱۷ / تاریخ تھی۔ (۲) حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ (۳) گویا قرآن پاک کا نزول جو آپ پر شروع ہوا اس کی ابتداء بھی رمضان ہی میں ہوئی، اسی مناسبت سے انہوں نے اس قول کو رائج قرار دیا ہے۔ اس پر دونوں متفق ہیں کہ دن پیر کا تھا۔

قرآن کے دو نزول ہیں:

(۱) اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن کو لوح محفوظ میں محفوظ رکھا اور وہاں سے آسمان دنیا میں بیت العزت پر پورا قرآن رمضان کے مہینے میں اور شب قدر میں نازل ہوا اس پر سب کا اتفاق ہے۔

(۲) اس کے بعد نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک پر حضرت جبریلؑ کے ذریعہ سے ۲۳ رسالہ دور نبوت میں نازل ہوتا رہا۔ (۴)

(۱) ذکرہ ابن عبد البر فی الاستیعاب ۱ / ۳۱، نقلاً عن الخوارزمی و فیہ: فکان من مولده ﷺ إلى

أن بعثه الله تعالى أربعون سنة و يوم. انتهى. (ط: دار الجليل بيروت)

(۲) سيرة ابن اسحاق ۱ / ۲۱ و ۱ / ۱۳۱ - ۱۳۰ (ط: دار الفكر بيروت)

(۳) فتح الباری ۱۲ / ۳۵۷ - ۳۵۶ (ط: دار المعرفة بيروت)

(۴) هذا قول الأكثر أخرجه النسائي في الكبرى برقم: ۱۱۶۲۵ (ط: مؤسسة الرسالة

بيروت)، والحاكم في المستدرک ۲ / ۲۴۲، (ط: دار الكتب العلمية بيروت)



## زَمَلُونِیْ زَمَلُونِیْ:

جب یہ پہلی وحی نازل ہوئی، تو نبی کریم ﷺ کی طبیعت مبارکہ کے اوپر ایک گھبراہٹ اور خوف کی سی کیفیت تھی، آپ ﷺ کا دل کانپ رہا تھا، اور اسی حالت میں آپ ﷺ گھر تشریف لے گئے، گھر پہنچتے ہی کہا: زَمَلُونِیْ زَمَلُونِیْ مجھے چادر اوڑھاؤ! مجھے چادر اوڑھاؤ! تو آپ کو چادر اوڑھائی گئی، تھوڑی دیر کے بعد جب آپ کی طبیعت میں اطمینان پیدا ہوا تو آپ ﷺ نے پورا واقعہ حضرت خدیجہؓ کے سامنے بیان فرمایا اور کہا: لقد خشیت علی نفسی۔<sup>(۱)</sup> مجھے اپنے متعلق خطرہ ہے۔ خطرہ کس چیز کا؟ اس کی تشریح اور تعین کے سلسلہ میں بھی شرح حدیث کی بہت ساری باتیں ہیں، لیکن حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں: یہاں دراصل حضور کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ ایک بہت بڑی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی ہے، میں اس ذمہ داری کو کما حقہ ادا کر پاؤں گا یا نہیں؟ آپ پر یہ خوف طاری تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس ذمہ داری کی ادائیگی مجھ سے نہ ہو پائے اور میرے لیے یہ رسوائی کا سبب بن جائے۔<sup>(۲)</sup> کوئی بڑی ذمہ داری کسی کو سونپی جاتی ہے، تو اس میں جہاں اس کے لیے ایک بڑا اونچا مقام ہے وہیں یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ ذمہ داری پوری نہ ہو پائی، تو لوگوں کے درمیان رسوائی ہوگی، یہ ڈر اور خطرہ ہوتا ہے، حضرت گنگوہیؒ نے اسی مطلب کو واضح بتلایا ہے۔ اس پر حضرت خدیجہؓ نے آپ کو اطمینان دلاتے ہوئے جواب میں عرض کیا: إنک لتصل الرحم

(۱) آخر جہ البخاری فی بدء الوحی برقم: ۳.

(۲) لامع الدراری ۱/ ۶-۵. (ط: المکتبۃ الرشیدیۃ، سہارنپور، یوپی)

وتحمل الكل وتكسب المعدوم آپ کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، اور جن کے پاس مال نہیں ہے، ان کو کماد کر دیتے ہیں، بوجھل مقرضوں کا قرض ادا کرتے ہیں، مہمانوں کی میزبانی کرتے ہیں، اور قدرتی مصائب کے موقع پر آپ لوگوں کی مدد کرتے ہیں، کلا واللہ لا یخزیک اللہ ابدًا۔ (اللہ تعالیٰ ہرگز آپ کو رسوا نہیں کریں گے) <sup>(۱)</sup> جو آدمی اس طرح اللہ کے بندوں کے کام آتا ہو اللہ تعالیٰ کبھی اس کو رسوا نہیں کرتے۔

## یہ تو وہی فرشتہ ہے:

یہ جواب اپنی طرف سے دے کر حضور ﷺ کو مزید اطمینان دلانے کے لیے وہ اپنے چچا زاد بھائی حضرت ورقہ بن نوفل کی خدمت میں لے گئیں، مکہ مکرمہ میں اس زمانہ میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا، جو اس وحی وغیرہ کے حقائق سے واقف ہو، ہاں! مکہ مکرمہ میں ان کے چچا زاد بھائی حضرت ورقہ بن نوفل باقاعدہ مکہ مکرمہ سے سفر کر کے شام گئے تھے، وہاں انہوں نے عیسائیوں سے انجیل کی تعلیم حاصل کی تھی، اور عیسائی مذہب اختیار کیا تھا۔ باقاعدہ عبرانی زبان میں انجیل کو لکھتے تھے اور عربی زبان میں اس کا ترجمہ کرتے تھے، بوڑھے ہو گئے تھے، بینائی بھی کمزور ہو گئی تھی، آسمانی کتابوں کے حال سے وہ واقف تھے اور تو کوئی تھا نہیں ایسا مکہ مکرمہ میں!!! حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کو انہی کے پاس لے گئیں اور ان سے کہا کہ: اے میرے چچا زاد بھائی! اپنے بھتیجے کی بات سنئے! پھر حضور ﷺ سے انہوں نے پوچھا: کیا ہوا؟ حضور ﷺ نے پورا قصہ ان کے سامنے بیان فرمایا، تو انہوں نے جواب میں کہا: یہ تو وہی فرشتہ ہے، جو حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس وحی لے کر آیا

(۱) آخر جہ البخاری فی بدء الوحی برقم: ۳۔

کرتا تھا اور پھر انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ کاش! اس وقت میں بھی زندہ رہوں، جب آپ لوگوں کو یہ پیغام پہنچائیں گے اور لوگ آپ کو وطن سے نکالیں گے، اس وقت اگر میں زندہ رہا، تو آپ کا بھرپور تعاون کروں گا، آپ کی بھرپور مدد کروں گا، اس پر نبی کریم ﷺ نے تعجب سے پوچھا: اَوْ مُخْرِجِيْهِمْ؟ کیا یہ لوگ مجھے نکالیں گے؟ انہوں نے کہا: ہاں! یہ چیز ایسی ہے کہ جو بھی اس سے پہلے اس طرح کی دعوت لے کر کے آیا ہے اس کو لوگوں نے نکالا ہے۔ گویا اس وقت یہ چیز آپ کے ساتھ بھی پیش آنے والی ہے۔<sup>(۱)</sup> بس! یہ پہلی وحی تھی۔

### وقف:

اس کے بعد ایک مدت تک وحی کا سلسلہ موقوف رہا، پہلی وحی کے بعد آپ پر جو کیفیت طاری ہوئی تھی اس سے آپ کو اطمینان حاصل ہو، ایک مدت تک اطمینان کے حصول کا آپ کو موقع دیا گیا تھا، اب کتنے دنوں تک وحی کا سلسلہ موقوف رہا؟ اس سلسلہ میں روایتیں مختلف ہیں، محمد بن اسحاق<sup>(۱)</sup> (امام المغازی) فرماتے ہیں: ۳ سال۔<sup>(۲)</sup> اور عامۃً کتب سیر میں یہی لکھا ہوا ہے، لیکن (۱۲/دن، ۱۵/دن، ۲۰/دن) ۲ سال، ڈھائی سال اور ۶ مہینے کا بھی قول مذکور ہے، اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اسی ۶ مہینے والے قول کو رائج قرار دیا ہے۔<sup>(۳)</sup>

(۱) أخرجه البخاری فی بدء الوحی برقم: ۳.

(۲) فتح الباری ۱/۲۶ (ط: دار الکتب العلمیۃ بیروت)

(۳) فتح الباری ۱/۲۶ (ط: دار الکتب العلمیۃ بیروت)

## اصلی شکل میں پہلا دیدار:

اس کے بعد نبی کریم ﷺ کا غار حرا میں عبادت کے لیے آنا جانا دوبارہ شروع ہوا اور اسی طرح معمول کے مطابق آتے جاتے تھے، حضور ﷺ فرماتے ہیں: ایک دن میں غار سے گھر جانے کے لیے باہر نکلا اور نیچے کھلے میدان میں آیا، اور اچانک میں نے ایک آواز سنی، میں نے اوپر دیکھا، تو وہی فرشتہ جو میرے پاس غار حرا میں وحی لے کر کے آیا تھا وہ آسمان کے نیچے ایک کرسی پر براجمان ہے، گویا حضرت جبریلؑ کو اپنی اصل شکل میں اس موقع پر دیکھا۔ وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأَفْئِ الْمُبِينِ (البقرہ/ ۲۳) یہ پہلا موقع ہے۔

## دثرونی دثرونی:

اور دوسرا موقع جب حضور ﷺ معراج میں تشریف لے گئے تھے، تو سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے تو حضرت جبریلؑ نے کہا: بس آگے آپ جائیے! اس سے آگے میں نہیں جاسکتا، وہاں بھی حضرت جبریلؑ کو حضور ﷺ نے اپنی اصلی شکل میں دیکھا تھا، اس کا تذکرہ سورۃ والنجم میں ہے: وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ (النجم/ ۱۳) بہر حال! یہ دو موقع تھے، جن میں نبی کریم ﷺ نے حضرت جبریلؑ کو اپنی اصلی شکل میں دیکھا۔<sup>(۱)</sup> (اُس سے آگے کوئی نہیں جاسکتا، دنیا سے جانے والی ساری چیزیں ختم ہوتی ہیں، سدرۃ المنتہیٰ بیری کا ایک بڑا حسین و جمیل درخت ہے)

تو آپ نیچے اتر کر وادی میں چل رہے تھے اور اوپر نگاہ پڑی، تو کھلے آسمان میں کرسی کے اوپر معلق دیکھا، جس کی وجہ سے آپ پر ایک گھبراہٹ سی طاری ہو گئی اور آپ

(۱) آخر جہ البخاری فی التفسیر برقم: ۴۵۷۴ و مسلم فی الإیمان برقم: ۷۰۱۰

نیچے گر گئے، پھر آپ اٹھ کر گھر گئے، گھبرائے ہوئے، اور کہا: دثرونی دثرونی، مجھے چادر اوڑھاؤ! اور اسی موقع پر سورہ مدثر آیا **يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ** یہ پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔ سورہ اقرأ کی پانچ آیتیں پہلی وحی میں اور سورہ مدثر کی پانچ آیتیں دوسری وحی میں نازل ہوئیں، آپ کھڑے ہو جائیے اور لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے۔ اس لیے کہ ابھی تک ایمان لانے والوں کی معقول تعداد نہیں تھی، سب کفر ہی پر تھے، سب کو ڈرانے ہی کی ضرورت تھی، چناں چہ اس کے بعد سے نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو ایمان کی دعوت دینا شروع کیا، یہ دوسری وحی تھی۔ بخاری شریف میں منقول ہے کہ اس کے بعد وحی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔<sup>(۱)</sup>

## وحی کے معنی:

وحی: اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے اپنے مخصوص بندوں یا رسل پر پہنچائے جانے والے پیغام کو وحی کہتے ہیں۔ لغوی اعتبار سے وحی الإعلام بخفیة چپکے سے، پوشیدہ طور پر کسی کو کوئی بات بتلانے کو کہتے ہیں۔ اور صاحب مفردات القرآن نے السرعة کا اضافہ بھی کیا ہے۔<sup>(۲)</sup> تیزی سے اور چپکے سے کہ دوسروں کو پتہ نہ چلے۔ جب بھی آپ پر وحی نازل ہوتی تھی، اس وقت لوگ موجود ہوتے تھے، لیکن لوگوں کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ آپ کے پاس کون سی چیز آئی؟

(۱) أخرجه البخاری فی بدء الوحی برقم: ۴۔

(۲) المفردات فی غریب القرآن ۸۵۸/۱ (ط: دار القلم والدار الشامیة، دمشق، بیروت)

## وحی کا سلسلہ:

وحی کا یہ سلسلہ ۲۳ رسالہ دور نبوت میں آخر عمر تک رہا۔ اور وحی کے نزول کی کل مدت ۲۲ رسالہ، ۵ مہینے، ۱۴ دن ہے یعنی اگر ۱۷ رمضان سے حساب لگایا جائے اور نبی کریم ﷺ کی وفات ۱۱ یا ۱۲ ربیع الاول کو شمار کی جائے (راج قول کے مطابق) تو یہ حساب بنتا ہے۔ اور پورا قرآن اسی درمیان میں نازل ہوا۔ آپ کی سب سے پہلی اور دوسری وحی وہی تھی جس کا ذکر اوپر ہوا، اور آخری وحی وَ اتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ جو سورہ بقرہ میں ہے، اور اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَنَّمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي یہ قول بھی ہے، اس کو بھی انخیری وحی میں شمار کیا جاتا ہے۔

وحی کی مختلف صورتیں ہوتی تھیں، کبھی تو پوری سورت نازل ہوتی تھی، سورہ انعام یک بارگی پوری نازل ہوئی ہے، یہ سب سے بڑی وحی ہے، جو ایک وقت میں نازل ہوئی، اور سب سے چھوٹی وحی غَيْرُ اُولَى الصَّوْرِ ہے، یہ ایک موقع پر نازل ہوئی۔

## نزول وحی کے طرق:

وحی کے لیے کیا طریقہ ہوتا تھا؟ بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ سے روایت منقول ہے: حضرت حارث بن ہشامؓ - جو فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے تھے - نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا: یا رسول اللہ! کیف یأتیک الوحی؟ اے اللہ کے رسول! آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟ تو جواب میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَحْيَانًا يَأْتِينِي مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ کبھی تو میرے پاس وحی گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے اور جب وحی مکمل ہو جاتی ہے، تو اس وحی کے ذریعہ جو کچھ مجھ پر نازل ہوتا ہے میں اس کو محفوظ کر

چکا ہوتا ہوں۔ گھنٹی کی آواز سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں ایک قول یہ ہے کہ یہاں تسلسل مراد ہے، یعنی جب گھنٹی بجتی ہے، تو اس کی آواز مسلسل ہوتی ہے اور مسلسل بجنے کی صورت میں اس کی آواز کی جہت بھی متعین نہیں ہوتی، اگر لگا تار گھنٹی بجائی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف سے آواز آرہی ہے۔ گویا وحی کی آواز تسلسل کے ساتھ اور ہر جہت سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اسی کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا: وہو أشده على، وحی کے آنے کے جو طریقے ہیں ان میں سب سے زیادہ سخت طریقہ یہی ہے۔ حضرت عائشہؓ اس کے متعلق فرماتی ہیں کہ سخت سردی کے زمانہ میں جب آپ پر وحی آتی، تو آپ ﷺ کی پیشانی پسینے سے شرابور ہو جاتی۔<sup>(۱)</sup> اس سے وحی کی شدت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور روایات میں یہ بھی ہے کہ آپ کی سانس خراٹوں کی طرح ہوا کرتی تھی۔

دوسرا طریقہ جو اسی روایت میں حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: فرشتہ میرے پاس انسانی شکل میں آتا ہے، حضرت جبریلؑ انسانی شکل میں تشریف لاتے، مگر دوسرے لوگ نہ دیکھ سکتے، آپ ﷺ کے پاس جب بھی انسانی شکل میں آتے، تو حضرت وحیہ بن خلیفہ کلبیؓ (ایک صحابی ہیں، بڑے حسین و جمیل تھے، دیگر ممالک میں جاتے، تو ان کو دیکھنے کے لیے عورتیں اور بچے باہر نکل پڑتے تھے، اتنے حسین تھے) کی شکل میں حضور ﷺ کے پاس آتے تھے۔<sup>(۲)</sup> جن لوگوں کو نظر آئے ان کے متعلق یہ منقول ہے کہ آخر عمر میں ان کی بینائی ختم ہو گئی، ایک مرتبہ حضرت عباسؓ حضور ﷺ کی ملاقات کے لیے آئے، سلام کیا،

(۱) أخرجه البخاری فی بدء الوحی برقم: ۲.

(۲) أخرجه النسائی فی سننه برقم: ۴۹۹۱ (ط: مکتب المطبوعات الإسلامية حلب) والطبرانی فی

الأوسط برقم: ۷ (ط: دار الحرمین، القاهرة) وفی الكبير برقم: ۵۸ ط: مکتب ابن تیمیة، القاهرة.

لیکن حضور ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا، توجہ نہیں فرمائی، ان کے ساتھ صاحب زادے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ بھی تھے، تو حضرت عباسؓ شکوہ کرنے لگے: کیا بات ہے حضور ﷺ میرے سلام کا جواب نہیں دے رہے ہیں؟ میری طرف توجہ نہیں کر رہے ہیں؟ تو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے کہا: آپ دیکھتے نہیں کہ حضور ﷺ حضرت وحیہ بن خلیفہ کلبی کے ساتھ بیٹھے ہوئے بات کر رہے ہیں۔ (پھر آپ ﷺ نے فرمایا: وہ حضرت جبریلؑ تھے) (۱) تو حضرت عباسؓ کو نظر نہیں آئے، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کو نظر آئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ آخری زمانے میں ان کی بینائی باقی نہیں رہی۔ یہ بھی منقول ہے۔ (۲) یہ دو طریقے تو عام طور پر قرآن کی وحی کے تھے۔

اس کے علاوہ دیگر شکلیں بھی تھیں، حضرت جبریلؑ اپنی اصلی شکل میں دو مرتبہ نظر آئے تھے۔ اور پھر معراج کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچے، تو وہاں براہ راست اللہ تعالیٰ سے بات ہوئی۔ چنانچہ زندگی میں یہ ایک ہی موقع ہے، ورنہ دنیا میں تو بات ہو ہی نہیں سکتی۔ نیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی چیز آپ ﷺ کے قلب مبارک میں ڈالی جاتی، یہ بھی وحی کی شکل تھی۔ کبھی حضرت جبریلؑ کی طرف سے آپ ﷺ کے قلب میں بات ڈالی جاتی، کبھی خواب میں کوئی چیز دکھائی جاتی، نبی کا خواب بھی وحی کے حکم میں ہوتا ہے۔ اسی لیے حضرات صحابہؓ کا معمول تھا کہ کہیں سفر میں نبی کریم ﷺ اگر آنکھ بند ہونے کی حالت میں لیٹے ہوئے ہوتے، تو کوئی بھی صحابی آپ کو نہ جگاتا، اس لیے کہ پتہ نہیں

(۱) أخرجه أحمد بن حنبل في مسنده برقم: ۲۶۷۴ و ۲۸۴۳ ط: دار إحياء التراث العربی، بیروت

(۲) أخرجه الحاكم في المستدرک برقم: ۶۳۴۱ ط: دار المعرفة بیروت والطبرانی في الأوسط

برقم: ۳۸۳۳ (ط: مکتب المعارف)



اس حالت میں کہیں آپ ﷺ پر وحی نازل نہ ہو رہی ہو۔

ایک سفر میں رات کے آخری حصہ میں سب کے اصرار پر نبی کریم ﷺ نے پڑاؤ ڈالا، چنانچہ سب لیٹ گئے، لیٹتے ہی سب کی آنکھ لگ گئی، حتیٰ کہ سورج نکل آیا، سب سے پہلے ایک صحابی اٹھے، پھر دوسرے اٹھے، پھر تیسرے اٹھے، پھر چوتھے نمبر پر حضرت عمرؓ اٹھے، ان میں سے ایک صحابی کہنے لگے کہ حضور ﷺ اب بھی لیٹے ہوئے ہیں۔ ہم حضور کو کبھی خواب سے بیدار نہیں کرتے اس وجہ سے کہ کہیں آپ ﷺ پر وحی نازل نہ ہو رہی ہو اور ہم جگا دیں، تو وحی کا انقطاع ہو جائے۔ حضرت عمرؓ جب اٹھے تو ویسے تو نہیں جگایا، لیکن زور زور سے اللہ اکبر کہنے لگے، تو اس آواز کو سن کر حضور ﷺ کی بھی آنکھ کھل گئی۔<sup>(۱)</sup> اور ہر نبی کا خواب وحی ہوتا ہے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیلؑ کو خواب میں ذبح کرتے ہوئے دیکھا، تو اس کو وحی پر ہی محمول کیا۔ یٰٰبْنَیْ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اِنِّیْ اَذْبَحُکَ فَاَنْظُرْ مَاذَا تَرٰی (الصف: ۱۰۲) قرآن میں اس کا تذکرہ ہے۔ وحی کی بنیاد پر ہی اس کی گنجائش ہو سکتی تھی۔ اور بھی کچھ طریقے بتلائے جاتے ہیں، لیکن زیادہ تر قرآن کی وحی جو آپ ﷺ پر نازل ہوتی تھی وہ پہلی دو شکلوں میں ہوا کرتی۔ اس طرح پورا قرآن آپ کے پورے دور نبوت کے دوران نازل ہوا۔

## مکی و مدنی سورتیں:

مکہ مکرمہ میں آپ ﷺ کے قیام کے زمانے میں کچھ سورتیں نازل ہوئیں، ان کو مکی سورتیں کہا جاتا ہے، اور بعض مکی سورتیں ایسی بھی ہیں جن میں کچھ آیتیں مدینہ منورہ میں

(۱) آخر جہ البخاری فی صحیحہ برقم: ۳۳۷۔

نازل ہوئیں، تو ان کو اکثر آیتوں کے اعتبار سے مکی کہا جاتا ہے۔ ۸۷/سورتیں مکی ہیں اور ۲۷/سورتیں مدنی ہیں دونوں کو ملانے سے ۱۱۴/ہو جاتی ہیں۔ (۱) حضور اکرم ﷺ کے مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے جانے سے پہلے جتنی بھی سورتیں نازل ہوئیں، وہ سب مکی کہلاتی ہیں، حتیٰ کہ ہجرت کے سفر کے دوران مدینہ منورہ پہنچنے سے قبل بھی جو سورتیں نازل ہوئیں، وہ سب بھی مکی ہی کہلاتی ہیں۔ اور مدینہ پہنچنے کے بعد جتنی بھی آیتیں یا سورتیں نازل ہوئیں، وہ سب مدنی کہلاتی ہیں۔ چاہے وہ مکہ میں نازل ہوئی ہوں۔ (هذا أحد الأقوال و عليه الجمهور)

## چابی مجھے دے دیجیے:

آپ ﷺ مکہ مکرمہ فتح کرنے کی غرض سے حجة الوداع کے لیے تشریف لے گئے، تو آپ نے کعبۃ اللہ کی چابی منگوائی اور کعبۃ اللہ کھولا گیا اور چابی آپ کے ہاتھ میں تھی، اسی حالت میں آپ نے خطبہ دیا، جب آپ خطبہ سے فارغ ہوئے، حضرت عباسؓ نے کھڑے ہو کر آپ ﷺ سے چابی کا مطالبہ کیا، آپ چابی مجھے دے دیجیے تاکہ حاجیوں کو پانی پلانے (سقایہ) کے ساتھ ساتھ کعبۃ اللہ کی کلید برداری کا عہدہ بھی مجھے مل جائے۔ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا۔ (النساء: ۵۸) یہ عین کعبہ میں نازل ہوئی۔ (۲) پھر بھی اس کو مدنی کہیں گے، مکی نہیں کہیں گے، اس لیے کہ وہ ہجرت

(۱) نقلہ ابن عباس عن أبي بن كعب رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ۔ الإِتْقَانُ فِي علوم القرآن ۱/ ۳۸ (ط: الهيئة المصرية العامة

للكتاب)

(۲) راجع ”لباب النقول في أسباب النزول“ للسيوطي ۱/ ۶۰ (ط: دار الكتب العلمية بيروت)

کے بعد نازل ہوئی، تو ہجرت کے بعد جتنی بھی آیتیں نازل ہوئیں چاہے وہ مدینہ میں ہوں یا مدینہ سے باہر کسی سفر میں ہوں یا مکہ مکرمہ ہی میں کیوں نہ ہوں، حجۃ الوداع یا فتح مکہ کے موقع پر، تو وہ بھی مدنی ہی کہلاتی ہیں۔ ہجرت سے پہلے جو نازل ہوئیں وہ مکی کہلاتی ہیں۔ تو مکی سورتیں ۸۷ ہیں اور مدنی سورتیں ۲۷ ہیں، کل ۱۱۴ ہو جاتی ہیں۔ یہ قرآن پاک کے نزول کی تفصیل ہے۔

:

# سورۃ فاتحہ

(قسط -۱)

مؤرخہ ۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۷ جنوری ۲۰۱۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنُسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ  
بِاللّٰہِ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاَتِ اَعْمَالِنَا وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاَتِ اَعْمَالِنَا  
مَنْ یَّہْدِہٖ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُضِلّْہٗ فَلَا هَادِیَّ لَہٗ وَ نَشْہَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ حْدَہٗ  
لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْہَدُ اَنْ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ اَرْسَلْہٗ اِلٰی کَافَّةِ  
النَّاسِ بِشَیْرٍ اَوْ نَذِیْرٍ اَوْ دَاعِیًا اِلٰی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُنِیْرًا صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی  
اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَ بَارَکْ وَ سَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا . اَمَّا بَعْدُ .

الحمد لله رب العالمین ۝ الرحمن الرحیم ۝ ملک يوم الدين ۝ اياک نعبد و  
ایاک نستعین ۝ اهدنا الصراط المستقیم ۝ صراط الذین انعمت علیہم ۝ غیر  
المغضوب علیہم ولا الضالین ۝

## سب سے پہلے مکمل نازل ہونے والی:

یہ سورۃ فاتحہ ہے، جو قرآن پاک کی موجودہ ترتیب میں سب سے پہلی سورت ہے،  
نزول کے اعتبار سے تو پہلی نہیں ہے، سب سے پہلے سورۃ اقرأ کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل  
ہوئیں اور ان کے بعد سورۃ مدثر کی پانچ آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے مکمل نازل  
ہونے والی سورت، سورۃ فاتحہ ہے۔ اور یہ کی ہے، بعض حضرات فرماتے ہیں کہ دوبارہ اس کا

نزول مدینہ منورہ میں بھی ہوا۔ گویا کئی بھی ہے اور مدنی بھی ہے۔

یہ سات آیتیں ہیں، البتہ سات آیتوں کی تعیین کے سلسلہ میں ائمہ کے درمیان تشریح میں قدرے اختلاف ہے:

امام شافعیؒ کے نزدیک بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ بھی سورہ فاتحہ کی پہلی آیت ہے اور ان کے نزدیک صراط الذین انعمت علیہم، غیر المغضوب علیہم ولا الضالین یہ پوری ایک آیت ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ سات آیتیں ہیں، الحمد للہ رب العلمین ۱ یہ پہلی ہے اور صراط الذین انعمت علیہم ۲ پر چھٹی آیت ختم ہوتی ہے اور غیر المغضوب علیہم ولا الضالین ۳ پر ساتویں آیت مکمل ہوتی ہے۔ اس طرح سات آیتیں ہیں، اس پر سب کا اتفاق ہے۔

## سورہ فاتحہ کے مختلف نام:

اس سورت کے بہت سارے نام ہیں:

(۱) علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب ”الاتقان فی علوم القرآن“ میں ۲۵ نام بتائے ہیں۔ (۱) ان میں سب سے زیادہ مشہور نام الفاتحہ ہے۔ الفاتحہ یعنی وہ سورت جس سے قرآن پاک کی ابتداء ہو رہی ہے۔ قرآن پاک کے دیباچہ، پیش لفظ (الحمد للہ رب العلمین) کے طور پر، گویا قرآن پاک کی ابتداء اسی سورت سے ہو رہی ہے، نیز نماز کی ابتداء بھی اسی سورت سے ہوتی ہے اس اعتبار سے اس کو الفاتحہ نام دیا گیا ہے۔

(۱) الاتقان فی علوم القرآن ۱/ ۱۹۱ (ط: المہیئة المصرية العامة للكتاب)

(۲) فاتحۃ القرآن.

(۳) أم الكتاب اور أم القرآن: قرآن پاک کے مضامین کو اجمالی طور پر اس سورت میں بیان کر دیا گیا ہے، لہذا اس کو ام الكتاب اور ام القرآن کا نام دیا گیا ہے۔

(۴) السبع المثانی: مثانی، ثنی کی جمع ہے، جس کا تکرار کیا جائے، یعنی وہ سات آیتیں جن کو بار بار پڑھا جاتا ہے، کیوں کہ نماز کی ہر رکعت میں اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔  
(۵) سورة السوال وسورة المناجاة: اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی ذات سے مانگنے کا طریقہ اس سورت میں سکھلایا ہے۔

(۶) سورة الحمد: اس کی شروعات الحمد لله رب العالمین سے ہوتی ہے، ابتداء اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی گئی ہے اس معنی کی وجہ سے اس کو سورة الحمد بھی کہتے ہیں۔  
(۷) سورة الصلاة: نماز کی ہر رکعت کے اندر یہ پڑھی جاتی ہے۔

چنانچہ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد نقل کرتے ہوئے فرمایا: قسمت الصلاة بيني وبين عبدی نصفين (میں نے صلاة کو (یعنی سورۃ فاتحہ) کو اپنے اور بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کیا) چنانچہ بندہ جب الحمد لله رب العالمین پڑھتا ہے تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: حمدنی عبدی (میرے بندے نے میری حمد و تعریف کی)

جب بندہ الرحمن الرحیم پڑھتا ہے، تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اثنی علی عبدی (میرے بندے نے میری ثنائیاں کی)

جب بندہ کہتا ہے ملک يوم الدين تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: مجدنی عبدی (میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی)

جب بندہ کہتا ہے اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ہذا بیّن و بین عبدی و لعبدی ما سأل (یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میرے بندے کو وہ مل گیا/ مل جائے گا، جو اس نے مانگا) (۱)

اس کے بعد جو آیت بندہ پڑھتا ہے تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ہذا لعبدی و لعبدی ما سأل (یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کو وہ مل جائے گا/ دیا جائے گا، جو اس نے مانگا)

اس میں نصف (ساڑھے تین آیتیں) بندے کی درخواست کی شکل میں ہے، اور ساڑھے تین آیتیں اللہ کی حمد ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے اس سورت کو اپنے اور بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کیا ہے۔

(۸) سورة الشفاء: اس کو پڑھ کر دم کرنے سے بیماریوں سے شفا حاصل ہوتی ہے۔ بخاری شریف میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا واقعہ موجود ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایک دستہ کسی علاقے میں بھیجا، جب صحابہؓ وہاں پہنچے تو بستی والوں نے اُن کی میزبانی نہیں کی، حالاں کہ اصول کے مطابق ان کو میزبانی کرنی چاہیے تھی، پھر اتفاق سے اس قبیلے والوں کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا، ان لوگوں نے اس کا زہر اتارنے کے لیے اپنی ساری تدبیریں کر لیں، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا، تو ان لوگوں نے سوچا کہ یہ لوگ آئے ہیں، ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی جھاڑ ناجانتا ہو، چنانچہ یہ لوگ اُن صحابہؓ کی جماعت کے پاس آئے، پوچھا: تم لوگوں میں کوئی جھاڑ نے والا ہے؟ تو حضرت ابوسعیدؓ نے جواب میں کہا: ہاں! میں جھاڑ ناجانتا ہوں، لیکن تم نے ہماری میزبانی تو کی نہیں! اس لیے ہم

علاج نہیں کریں گے۔ اس کے بعد پھر ان کے ساتھ معاملہ ہوا، اور ۳۰ یا ۴۰ بکریاں طے ہوئیں، اور حضرت ابوسعید خدریؓ نے سورہ فاتحہ پڑھ پڑھ کر اس پر دم کیا، تو سانپ کے زہر کا اثر ختم ہو گیا۔ اب ان بکریوں کا کیا کریں؟ تو ساتھیوں نے کہا: تقسیم کر لیں، تو حضرت ابوسعید خدریؓ نے کہا: نہیں! ہم حضور ﷺ کی خدمت میں پوری بات پیش کریں گے اور آپ ﷺ اس کے متعلق جو فیصلہ فرمائیں گے، اس پر عمل ہوگا۔ چنانچہ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضور اکرم ﷺ کے سامنے سارا واقعہ بیان کیا، تو حضور ﷺ نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے فرمایا: تمہیں کیسے پتہ چلا کہ اس سے جھاڑا جاتا ہے؟ اور پھر جو معاوضہ لیا گیا تھا اس کو آپ ﷺ نے رکھنے کی اجازت دے دی کہ اس کو تقسیم کر لو، اور اس کے اندر میرا بھی حصہ رکھو۔<sup>(۱)</sup> لہذا یہ سورہ شفا کسی بھی بیماری میں پڑھ کر دم کیا جائے، تو اس بیماری میں شفا ہوتی ہے۔

## سورہ فاتحہ کے ذریعہ دم:

بعضوں نے شفا کے مخصوص طریقے بھی بیان کیے ہیں۔

حضرت شیخؒ نے فضائل قرآن کے اخیر میں مخصوص سورتوں کے فضائل کے تحت سورہ فاتحہ کے سلسلہ میں مشائخ کا عمل تحریر فرمایا ہے کہ کوئی آدمی اگر سورہ فاتحہ کو بسم اللہ سمیت - بسم اللہ الرحمن الرحیم کی میم کو الحمد کے لام کے ساتھ ملا کر - فجر کی نماز اور سنتوں کے درمیان ۴۱ مرتبہ، ۴۰ روز تک پڑھے گا، بیمار پر دم کرے گا یا پانی پر دم کر کے پلائے گا تو اس سے شفا حاصل ہوگی۔ (فضائل اعمال ۱/ ۵۴۵ ط: ادارہ دینیات ممبئی)

(۹) سورہ وافیہ۔



## (۱۰) سورۃ کافیہ۔

## فضائل سورۃ فاتحہ:

اس سورت کے بڑے فضائل بھی وارد ہوئے ہیں، بخاری شریف میں اس کی فضیلت کے سلسلہ میں روایت آئی ہے: حضرت ابوسعید بن معلیؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ مسجد نبوی میں نماز پڑھ رہا تھا، اور نبی کریم ﷺ نے مجھے آواز دی، تو نماز میں ہونے کی وجہ سے میں فوراً نہیں گیا، میں نماز پوری کر کے پھر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے بلایا تو فوراً کیوں نہیں آئے؟ کیا تم نے قرآن پاک کی یہ آیت نہیں پڑھی؟ یا ایہا الذین امنوا استجبوا للہ و للرسول اذا دعاکم لہا یحییٰکم۔ (الانفال: ۲۴) (اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہو، جب کہ وہ تم کو ایک ایسی چیز کے لیے پکاریں، جس میں تمہارے لیے حیات ہے) تو حضرت ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میں نماز میں تھا۔

## اگر حضور ﷺ دورانِ صلوٰۃ بلائیں تو.....:

علما کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کسی کو حضور پاک ﷺ بلاویں اور وہ نماز میں ہو تو اس کے لیے جواب دینا واجب ہے۔ اور اس جواب کی وجہ سے نماز ٹوٹ جائے گی یا نہیں؟ یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان مختلف فیہ ہے۔

اکثر شافعیہ و حنابلہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی، ان میں سے بعض جواز کے قائل ہیں۔ بعض احناف نماز کے ٹوٹنے کے قائل ہیں جیسے امام طحاویؒ وغیرہ۔ شوافع میں سے حافظ ابن حجرؒ نے ٹوٹنے کا حکم لگایا ہے، اور احناف میں سے بھی بعض نے

ٹوٹنے کا حکم لگایا ہے۔ ہاں! جواب دینا ضروری ہے اس پر تو سب کا اتفاق ہے۔ حضرت ابوسعید بن معلیؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں مسجد سے نکلنے سے قبل ایک ایسی سورت تلاؤں گا، جو قرآن کے اندر تمام سورتوں میں سب سے عظیم ہے، پھر حضرت ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میرا ہاتھ اپنے دست مبارک میں لیا اور چلنے لگے، چلتے چلتے جب مسجد کے دروازے تک پہنچے، اب تک وہ سورت بتلائی نہیں، مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں دروازے سے باہر نہ نکل جائیں، تو میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا تھا کہ مسجد سے نکلنے سے پہلے تم کو قرآن کی سورتوں میں سب سے عظیم سورت تلاؤں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ہے الحمد للہ رب العلمین ُ ہی السبع المثانی و القرآن العظیم الذی اوتیٰہ یہی وہ سات آیتیں ہیں جن کا تکرار کیا جاتا ہے، اور یہی وہ قرآن عظیم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے دیا گیا ہے۔<sup>(۱)</sup>

### دو نور:

مشکوٰۃ شریف میں بحوالہ مسلم شریف ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبریلؑ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے، اور آسمان سے ایک آواز سنائی دی، آپ ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر کہا کہ آج آسمان کا ایک دروازہ کھلا، جو آج تک کبھی نہیں کھلا تھا اور اس میں سے ایک فرشتہ نیچے آ رہا ہے، جو کبھی زمین پر نہیں آیا تھا، اس فرشتے نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! میں آپ کو مبارک باد دینے کے لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ ﷺ کو دو ایسے نور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیے گئے کہ

(۱) آخر جہ البخاری برقم: ۴۲۲۶۔

آپ ﷺ سے پہلے دیگر انبیاء کرام کو عطا نہیں کیے گئے، ایک تو سورہ فاتحہ اور دوسرا سورہ بقرہ کی آخری آیتیں، اور یہ دعا جو بھی مانگے گا اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائیں گے۔<sup>(۱)</sup> یہ بھی سورہ فاتحہ کی فضیلت میں شامل ہے۔

ترمذی شریف کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے سورہ فاتحہ ایک ایسی سورت عطا فرمائی جو نہ تورات میں ہے، نہ زبور میں ہے، نہ انجیل میں ہے، نہ قرآن میں اس جیسی کوئی سورت ہے۔ گویا کسی کتاب میں اس کا کوئی بدل موجود نہیں ہے۔ اور یہی وہ سات آیتیں اور یہی وہ قرآن عظیم ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے۔<sup>(۲)</sup>

## تعوذ کا حکم:

أعوذ بالله من الشيطان الرجيم

ترجمہ: پناہ مانگتا ہوں میں اللہ تعالیٰ کی شیطاں مردود سے۔

قرآن پاک کی تلاوت کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے فاذا قرأت القرآن فاستعذ بالله من الشيطان الرجيم۔ (النمل: ۹۸) (اے نبی! آپ جب قرآن پڑھنا شروع کریں تو شیطاں مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کریں) اس حکم کی وجہ سے قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے تعوذ یعنی اعوذ باللہ پڑھنا مسنون قرار دیا گیا ہے۔ اور تعوذ کے الفاظ عام طور پر جو حدیث شریف میں آئے ہیں وہ أعوذ بالله من الشيطان الرجيم ہیں، اور بعض نے أعوذ بالله السميع العليم من الشيطان الرجيم بھی بتایا ہے لیکن زیادہ مشہور

(۱) آخر جہ مسلم برقم: ۸۰۶۔

(۲) آخر جہ الترمذی برقم: ۲۸۷۵ (ط: مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر)

یہی ہے جو عام طور پر ہم پڑھتے ہیں۔

اور یہ صرف قرآن کی تلاوت سے پہلے ہے، چاہے قرآن کی تلاوت نماز میں ہو چاہے نماز سے باہر ہو، نماز میں بھی جب پہلی رکعت میں قرآن شروع کیا جائے، تو اس سے پہلے اعوذ باللہ پڑھی جائے گی۔

ہر رکعت میں تعوذ پڑھنا چاہیے یا نہیں؟ یا صرف پہلی رکعت میں پڑھا ہو اسب کے لیے کافی ہے؟

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ: ہر رکعت میں پڑھنا ضروری نہیں ہے، پہلی رکعت میں پڑھا ہو بعد کی رکعتوں کے لیے بھی کافی ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک ہر رکعت میں پڑھنا مستحب قرار دیا گیا ہے۔

اور تلاوت کے دوران اگر کسی دنیوی چیز میں مشغول ہوں جیسے کسی کے ساتھ بات کر لی یا کوئی چیز کھا۔ پی لی، تو اس صورت میں دوبارہ تعوذ پڑھا جائے گا۔ یہ تعوذ کا حکم ہے۔ اور تعوذ قرآن کے ساتھ خاص ہے، قرآن کے علاوہ آپ کوئی اور کتاب پڑھیں یا کوئی اور مضمون پڑھیں تو اس کے شروع میں اعوذ باللہ پڑھنے کا حکم نہیں ہے، اور مسنون بھی نہیں ہے۔ یہ قرآن کی خصوصیت اور امتیاز ہے۔ حکمت یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کرے گا تو اس میں یہ خطرہ رہتا ہے کہ شیطان اس کے فہم و فکر میں کہیں گمراہی کا کوئی پہلو داخل نہ کر دے، تو اس سے حفاظت کے لیے تعوذ کا حکم دیا گیا ہے۔

## تسمیہ کا حکم:

قرآن کی تلاوت سے پہلے تسمیہ بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی پڑھنا چاہیے۔

قرآن پاک میں ایک بسم اللہ تو سورہ نمل کی ایک آیت کا ایک حصہ ہے انہ من سلیمان و انہ بسم اللہ الرحمن الرحیم، اس کی پوری آیت بھی نہیں، آیت کا ایک حصہ ہے، وہ تو قرآن پاک کا جزء ہے ہی، اس پر تو سب کا اتفاق ہے۔ اس کے علاوہ قرآن پاک میں سورہ توبہ کے علاوہ ۱۱۳ سورتوں کے اوپر بسم اللہ لکھی گئی ہے، اس سلسلہ میں تین نظریات ہیں:

(۱) امام مالکؒ کا نظریہ یہ ہے کہ نہ تو قرآن پاک کا جزء ہے نہ ہی سورتوں کا جزء ہے، اس کو امام مالک سورتوں کا جزء بھی نہیں مانتے اور قرآن کا جزء بھی نہیں مانتے۔

(۲) امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ایک مستقل آیت ہے (سورہ نمل کے علاوہ) جو اللہ تعالیٰ نے دو سورتوں کے درمیان فاصلہ کرنے کے لیے نازل فرمائی ہے، چنانچہ حضور ﷺ پر جب یہ آیت نازل ہوتی تھی تو حضور ﷺ کو پیٹہ چل جاتا تھا کہ ایک سورت ختم ہوئی اور دوسری سورت شروع ہو رہی ہے۔ گویا فصل بین السور کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمائی ہے، تو یہ ایک آیت، تمام سورتوں کے شروع میں لکھی گئی ہے۔

بسم اللہ تمام سورتوں کا یا سورہ فاتحہ کا جزء ہے یا نہیں؟

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یہ ایک مستقل آیت ہے، ۱۱۳ آیتیں نہیں، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کو پورے قرآن میں ایک آیت شمار کیا گیا ہے، اور صحابہ کے آپس کے اجماع سے اس کو تمام سورتوں کے شروع میں لکھا گیا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ ۱۱۳ آیتیں ہیں، تو اس اعتبار سے آیتوں کی تعداد بڑھ جائے گی، اور جس سورت پر وہ لکھی گئی ہے، اس سورت کا وہ جزء اور حصہ ہے۔ سورہ فاتحہ کے متعلق تو تمام شافعی حضرات کا اتفاق ہے کہ وہ سورہ فاتحہ کا جزء ہے۔ باقی سورتوں میں علماء

شوافع کے درمیان دو قول ہیں؛ لیکن رائج قول یہی ہے کہ باقی سورتوں کا بھی حصہ ہے۔ گویا ان کے نزدیک بسم اللہ الرحمن الرحیم سورہ توبہ کے سوا ہر سورت کا حصہ ہے۔ اور درمیان میں بھی ایک سورت پوری کر کے جب دوسری سورت شروع کریں گے، تو بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی جائے گی، لیکن جب درمیان میں سورہ توبہ شروع کریں گے تو وہاں بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں پڑھی جائے گی۔ ہاں! جب ابتداء سورہ توبہ ہی سے تلاوت شروع کر رہے ہیں، تو اس سورت میں أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کے ساتھ بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی جائے گی۔ اس لیے کہ قرآن کی تلاوت کے شروع میں أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کے ساتھ بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی پڑھی جاتی ہے۔

### بسم اللہ الرحمن الرحیم

ترجمہ: شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان اور بڑا مہربان ہے۔  
بسم اللہ الرحمن الرحیم میں ب ہے اور اسم ہے اور لفظ اللہ ہے۔ ب کو اسم کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ عربی زبان میں ب مختلف معانی کے لیے آتا ہے۔ ان معانی میں سے تین معنی یہاں مراد لیے جاسکتے ہیں۔

(۱) مصاحبت: ایک چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ متصل ہونا۔

(۲) استعانت: کسی چیز سے مدد حاصل کرنا۔

(۳) تبرک: کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔

ان تینوں اعتبار سے معنی یوں ہوں گے:

اگر مصاحبت والا معنی مراد لیں تو مطلب ہوگا ”اللہ کے نام کے ساتھ“۔

اگر استعانت والا معنی مراد لیں تو مطلب ہوگا ”اللہ کے نام کی مدد سے“۔

اور اگر تبرک والا معنی مراد لیں تو مطلب ہوگا ”اللہ کے نام کی برکت سے میں شروع

کر رہا ہوں“۔

لفظ ”اللہ“ یہ ذاتی نام ہے اور الرحمن اور الرحیم یہ صفاتی نام ہیں۔ یعنی اس میں اللہ کی صفت بیان کی گئی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ۱۰۰ سے بھی زیادہ صفاتی نام ہیں، تو حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک ذات کے اگر مختلف نام ہوں، تو وہ اس کے اوصاف اور کمالات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ ذات بہت سارے اوصاف کی جامع ہے۔ اور ان اوصاف کو تعبیر کرنے کے لیے ڈکشنری اور لغت میں کوئی ایک لفظ نہیں ہے، اس لیے الگ الگ الفاظ سے اُن اوصاف کو ظاہر کیا جاتا ہے، یہی صفاتی نام کہلاتے ہیں۔ جیسے کسی کو مولانا، حافظ، قاری، مولوی، مفتی کہا جاتا ہے، تو ایک شخص کے اندر بہت ساری خوبیاں ہیں، وہ قرآن کا حافظ بھی ہے، قرآن کو عمدہ طریقے سے پڑھنے کا طریقہ بھی اس نے سیکھا ہوا ہے، عالم بھی ہے، قرآن کے مطالب سے بھی واقف ہے اور فتویٰ دینے کا طریقہ بھی جانتا ہے۔ یہ مختلف کمالات ہیں ان کمالات کو تعبیر کرنے کے لیے کوئی ایک لفظ موجود نہیں، اس لیے اس کے ساتھ مختلف صفاتی نام جوڑے گئے۔ تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کے کمالات کو اور اس کے اوصاف کو ظاہر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے بہت سارے نام ہیں۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کے بھی بہت سارے صفاتی نام ہیں۔ لہذا سورہ فاتحہ کے جو بہت سارے نام بتلائے گئے وہ اسی طرح سمجھے جائیں گے کہ سورہ فاتحہ کے اندر بہت سارے اوصاف اور خوبیاں ہیں، ان خوبیوں کو تعبیر کرنے کے لیے کوئی ایک لفظ نہیں تھا اس لیے مختلف اور الگ الگ نام اس کے لیے وضع کیے گئے۔

## الرحمن الرحيم

لفظ رحمٰن اور رحيم دونوں رحمت سے بنے ہیں۔ لیکن دونوں کے مفہوم میں فرق ہے۔ لفظ رحمٰن اللہ کی رحمت کے عموم کو بتلاتا ہے یعنی اللہ کی رحمت سب کو شامل ہے، عامۃً اس کا ترجمہ کرتے ہیں؛ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔ لیکن حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم اس کا ترجمہ کرتے ہیں: ”شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے“ گویا دنیا میں جتنی بھی مخلوقات ہیں، ان میں کوئی ایسی مخلوق نہیں جس کو اللہ کی رحمت شامل حال نہ ہو۔ تمام انسان، تمام جانور، تمام مخلوقات کو اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل ہے، لہذا رحمت کے عموم کو بتلانے کے لیے رحمٰن سے تعبیر کیا گیا۔

اور رحيم کا لفظ رحمت کے کمال کو بتلانے کے لیے ہے، یعنی وہ بڑا مہربان ہے، اس کی رحمت کامل اور مکمل ہے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت تمام مخلوقات کو شامل ہے اس لیے لفظ رحمٰن کا اطلاق دنیوی اعتبار سے ہے۔ اور آخرت میں اللہ کی رحمت جس کو بھی شامل ہوگی پورے طور پر شامل ہوگی۔ اس لیے کہ دنیا کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اس میں رحمت کامل طور پر شامل نہیں ہو سکتی ہے، دنیا میں اس کی صلاحیت ہی نہیں ہے، گویا دنیا کا ظرف اس لائق نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کامل رحمت اس مخلوق کو حاصل ہو سکے۔

اللہ تعالیٰ نے تین دار بنائے ہیں:

- (۱) جنت: جس میں خیر ہی خیر ہے، وہاں شر کا شائبہ نہیں۔
- (۲) جہنم: جس میں شر ہی شر ہے، وہاں خیر کا کوئی شائبہ نہیں۔
- (۳) دنیا: جس میں خیر اور شر دونوں ملے ہوئے ہیں۔ یہاں کوئی خوشی ایسی نہیں جس کے ساتھ غم کی ملاوٹ نہ ہو۔ دنیا کی بناوٹ ہی اللہ تعالیٰ نے ایسی رکھی ہے، اس لیے



یہاں اللہ کی رحمت جس کسی کو بھی حاصل ہوگی وہ کامل حاصل ہو ہی نہیں سکتی، کیوں کہ دنیا کے حالات کے اعتبار سے اس میں وہ صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اللہ کی رحمت اپنی جگہ پر ہے؛ لیکن وہ مقام اور وہ محل، وہ جگہ ایسی نہیں ہے جس میں اللہ کی رحمت کامل طور پر آ سکے۔ ظرف اور برتن میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔ لہذا دنیا میں اللہ کی رحمت کسی پر کامل نہیں ہوگی، کامل تو آخرت ہی میں ہوگی۔ دنیا میں سب کو شامل ہے، کوئی ایسی مخلوق نہیں ہے جس کو اللہ کی رحمت شامل نہ ہو۔ اس لیے اس کا ترجمہ اس طرح کریں گے: ”شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان، بڑا مہربان ہے۔“

### الحمد لله رب العلمین

حمد: لغت کسی کے ذاتی کمالات کی بنیاد پر تعریف کرنا۔

مدح: کسی کے ذاتی کمال یا دوسرے کی دین پر کی جانے والی تعریف پر مدح کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسے تاج محل بڑا خوب صورت ہے اس کی تعریف کی جاتی ہے، تو تاج محل کی خوب صورتی اور کمال اپنا ذاتی نہیں ہے، بلکہ وہ کاریگر کی محنت کے نتیجے میں ہوا، اور کاریگر کی محنت اور اس کا فن بھی اس کا ذاتی کمال نہیں ہے، بلکہ اللہ کا عطا کردہ ہے۔ سو اس اعتبار سے دنیا میں جتنے بھی ارباب کمال ہیں کسی کا بھی کمال اپنا ذاتی نہیں ہے، سب اللہ کا دیا ہوا ہے۔ تو لفظ ”حمد“ اللہ کے علاوہ کسی کے لیے بھی نہیں بولا جائے گا۔ اس لیے کہ حمد کا لفظ اُسی تعریف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جو ایسے کمال پر کی گئی ہو جو ذاتی ہو، اور دنیا کی مخلوقات میں جس کا جو بھی کمال ہے وہ ذاتی نہیں ہے، بلکہ وہ اللہ کا عطا کردہ ہے۔ اس لحاظ سے اس کو حمد نہیں کہہ سکتے بلکہ اس کو مدح کہیں گے۔

### الحمد لله رب العلمین

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

حمد اسم جنس ہے یعنی تمام تعریفیں۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مختلف انواع و اجناس پیدا فرمائیں۔ جیسے انسان، جنات، جانوروں کی مختلف انواع، چرند و پرند، جمادات، نباتات ہر ایک کا ایک جہاں ہے، ایک انسانوں کا جہاں ہے، ایک جناتوں کا جہاں ہے، ہر مخلوق کا ایک الگ عالم ہے۔ پوری دنیا گویا بہت سارے عالموں کا مجموعہ ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے تمام (انسان، جنات، جانوروں کی مختلف اجناس و انواع) کا پالنے والا اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں جو دنیا ہمیں نظر آرہی ہے، اس کے علاوہ بھی اللہ تبارک و تعالیٰ نے بہت سارے ایسے جہاں پیدا کیے ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتے، لیکن آج کل سائنس دانوں کی تحقیق یہ ہے کہ ہماری اس دنیا کے چاند اور سورج ہیں، یہ ہماری کہکشاں (Galaxy) ہیں۔ اس دنیا کے علاوہ بہت ساری کہکشائیں ہیں۔

ابھی دور و زقبل ہی اس سلسلہ میں ایک مضمون سامنے آیا تھا، تو میں نے اس کو بھی نوٹ کر لیا۔ اس سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی قدرت کتنی بڑی ہے اور اللہ تعالیٰ کی پرورش اور تربیت کتنی عظیم الشان ہے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

چنانچہ مضمون نگار نے لکھا ہے:

”جس زمین پر ہم رہتے ہیں وہ ایک عام آدمی کے حجم کے مقابلہ میں بیس ارب کھرب گنا بڑی ہے، جب کہ ہمارا سورج ہماری زمین سے دس لاکھ گنا ہے، اس کے مقابلے میں Etacarainae نامی مشہور ستارہ ہمارے سورج سے بھی پچاس لاکھ گنا بڑا ہے، اس کے بعد Betel Geuse نامی

آئیں! ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا، جیسے ستاروں سے کہکشاں بنتی ہے آپ کو معلوم ہے اسی طرح کہکشاؤں سے کلکسٹر بنتے ہیں؟ اور جس کلکسٹر میں ہماری کہکشاں واقع ہے اس کا نام ”وِریوکلکسٹر“ ہے اور صرف اس ایک کلکسٹر میں ۷۴ ہزار کہکشاں ہیں، اور معاملہ ابھی یہیں ختم نہیں ہوا، کلکسٹر س بھی

آپس میں مل کر سوپر کلکسٹر بناتے ہیں، اور جس سوپر کلکسٹر میں ہم رہتے ہیں، اس کا نام ”لوکل سوپر کلکسٹر“ ہے اور اس سوپر کلکسٹر میں سو کے قریب کلکسٹر ہیں، اور اس سوپر کلکسٹر جیسے کم و بیش ایک کروڑ سوپر کلکسٹر ہماری کائنات میں موجود ہیں، جو ایک عظیم جال میں معمولی نقطوں کے مانند نظر آتے ہیں؛ اور ان سب کو ایک ذات یعنی اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔“

ہم نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں:

اب اس زمین کی حیثیت تو ان سب کے مقابلے میں ایک نقطے سے بھی کم سمجھی جاتی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کے فرمان: رب العلمین (سارے جہانوں کے پروردگار) کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہم نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں!!! ہماری جانکاری کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ”کنویں کے مینڈک“ لفظ بھی کم پڑتا ہے۔ آج کے سائنس داں جب ان سب تفصیلات کو بتلاتے ہیں تو ہماری عقل ان سب کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی، سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی بڑی کائنات!!!

سب کا پالنے والا:

اللہ اس ساری کائنات کو بنانے والا بھی ہے اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے والا بھی ہے، اور ان میں سے ہر ایک کو اپنے کمال تک پہنچانے والا بھی ہے۔ تربیت کسی بھی چیز کو درجہ بدرجہ، اس کی انتہاء تک پہنچانے کو کہتے ہیں۔ جیسے انسان، بچہ پیدا ہوا، تو اس کی تربیت کا مطلب یہ ہے کہ بچپن سے لے کر ایک کامل انسان بننے تک جتنی بھی محنت کی جاتی ہے، اس کو تربیت سے تعبیر کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ سارے جہانوں اور جہانوں میں جتنی بھی

مخلوقات ہیں ساری مخلوقات کا پالنہار ہے۔

اب اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اندازہ لگائیے! یوں کہا جاسکتا ہے کہ جتنی بھی تعریفیں ہیں ساری اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں؛ اس لیے کہ دنیا میں جس چیز کی بھی تعریف کی جائے گی وہ اللہ تعالیٰ تک پہنچے گی۔ جیسے ایک مکان کی تعریف کریں گے، تو مکان کی تعریف دراصل اس مکان بنانے والے کی تعریف ہے، تو کائنات کی ساری مخلوق اللہ کی بنائی ہوئی ہے، تو کسی کی بھی تعریف کی جائے گی وہ تعریف سیدھی اللہ تعالیٰ تک پہنچے گی۔ لہذا ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اسی کی دلیل یہ رب العلمین بتلائی کہ وہ سارے جہانوں کا پالنہار ہے۔

# سورہ فاتحہ

(قسط-۲)

مؤرخہ ۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۴ فروری ۲۰۱۸ء، شب یکشنبہ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ  
بِاللّٰهِ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا وَ نَعُوذُ بِاللّٰهِ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا  
مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلِّهِ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَ نَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ حْدَهُ  
لَا شَرِيكَ لَهُ وَ نَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَ رَسُولُهُ أَرْسَلَهُ إِلَى كَافَّةِ  
النَّاسِ بِشِيرٍ أَوْ نَذِيرٍ أَوْ دَاعِيٍّ إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهِ وَ سِرَاجًا مُنِيرًا صَلَّى اللّٰهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَ عَلَى  
آلِهِ وَ أَصْحَابِهِ وَ بَارَكَ وَ سَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا. آمَنَّا بَعْدُ.

الحمد لله رب العلمين ۝ الرحمن الرحيم ۝ ملك يوم الدين ۝ اياك نعبد و  
اياك نستعين ۝ اهدنا الصراط المستقيم ۝ صراط الذين انعمت عليهم ۝ غير  
المغضوب عليهم ولا الضالين ۝

## ما قبل سے ربط:

اگلی مجلس میں ذکر کیا جا چکا کہ یہ پہلی سورت ہے جس کا نام سورہ فاتحہ ہے۔ اس میں  
پہلی تین آیتیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو  
بندوں کی زبان سے کہلوا یا ہے، گویا بندے اللہ کے حضور یہ مناجات پیش کرتے ہیں جس کے  
شروع میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی تعریف ہے، وہ صفات جو خاص اہمیت کی حامل ہیں، ان کو بیان  
کیا گیا ہے، پھر بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی بندگی کا اقرار کرتے ہوئے یہ بھی کہتا ہے کہ آپ ہی

سے میں مدد چاہتا ہوں اور پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے صراطِ مستقیم کی دعا کرتا ہے۔

الحمد لله رب العلمین۔

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

اس میں لفظ اللہ، اللہ تبارک و تعالیٰ کا ذاتی نام ہے اور بقیہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی صفات کو بتلاتے ہیں۔

رب العلمین

جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

یہاں اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفت ربوبیت کو ذکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کو وجود عطا فرماتے ہیں، وجود کے بعد کمال بھی دیتے ہیں اور اس کمال کو انتہاء تک پہنچاتے ہیں۔

تربیت کہتے ہیں کسی چیز کو دھیرے دھیرے، درجہ بدرجہ، تدریجاً اس کے منتہا اور کمال تک پہنچانا۔ دنیا کے اندر جتنے بھی عالم ہیں، عالم انسان ہو، یا عالم جنات ہو، یا عالم ملائکہ ہو، یا عالم جمادات ہو، یا عالم حیوانات ہو، یا عالم نباتات ہو، اور بھی دیگر کہکشائیں ان تمام عالموں کا پروردگار اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جب اسی نے سب کو پیدا کیا اور سب کو کمال سے نوازنے اور انتہاء کو پہنچانے والا بھی وہی ہے اور جب اسی کی قدرت سے یہ سب کچھ ہوا تو وہی اس بات کے لائق ہے کہ اسی کی عبادت کی جائے۔

پہلی آیت، عقیدہ توحید:

مفسرین لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اسلام کے تین بنیادی عقائد کو

بیان کیا ہے: (۱) عقیدہ توحید (۲) عقیدہ رسالت (۳) عقیدہ آخرت۔ اس پہلی آیت میں عقیدہ توحید کا تذکرہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی ذات ہی وہ ذات ہے جس نے تمام جہانوں کو پیدا کیا اور ان کو پالنے والا، ان کو کمال کی انتہاء تک پہنچانے والا وہی ہے تو وہی اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کی جائے، اس میں توحید کا سبق دیا گیا ہے۔

## رحمن الدنيا ورحيم الآخرة:

الرحمن الرحيم (سب پر مہربان، بہت زیادہ مہربان)

یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے دو نام ہیں، دونوں مبالغے کے صیغے ہیں، اور دونوں رحمت سے بنے ہوئے ہیں۔ اور اس سے قبل رحمن کا مطلب گزر چکا یعنی جس کی رحمت سب پر عام ہو۔ چنانچہ اس کا ترجمہ سب پر مہربان کیا جاتا ہے۔ دنیا میں اللہ کی رحمت سب کو ایسی شامل ہے کہ دنیا کی چھوٹی یا بڑی کوئی بھی مخلوق اللہ کی رحمت سے نکلے ہوئی نہیں ہے۔ اسی لیے امام بیضاویؒ فرماتے ہیں: رحمن الدنيا ورحيم الآخرة گویا اللہ کی صفت رحمت جس کا تذکرہ اللہ کے نام کے ساتھ کیا گیا ہے اس کا ظہور دنیا میں ہوتا ہے اور دنیا کی ساری مخلوق پر اللہ کی اس رحمت کا ظہور ہوتا ہے۔

اور رحیم کا مطلب یہ ہے کہ بہت زیادہ مہربان، جس کی رحمت بہت زیادہ کامل و مکمل ہو۔ اور اس کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ اس سے قبل گزر چکا کہ دنیا کی ساخت اور بناوٹ ہی ایسی ہے کہ اللہ کی اُس رحمت کا ظہور علیٰ وجہ الکمال یہاں نہیں ہو سکتا۔ اس دنیا میں اس کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اس کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ تو آخرت میں جو اہل ایمان ہیں



فلاح یاب بندے ہیں اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمت ان پر کامل و مکمل ہوگی۔ ان دو صفات کے تذکرے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت جو دنیا میں سب کو شامل ہے، اس سے ہم سب کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔

## اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان:

اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا حال یہ ہے کہ مشکوٰۃ شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت موجود ہے: ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ قیدی لائے گئے، ان قیدیوں میں ایک عورت تھی جس کا دودھ پیتا بچہ اس سے بچھڑ گیا تھا، اور اس کی چھاتیوں میں دودھ جمع ہو کر جوش مار رہا تھا، تو وہ بے چینی کے ساتھ بھاگ رہی تھی، جو بچہ اس کو نظر آ جاتا اس کو لے کر وہ اپنی چھاتی سے لگاتی اور دودھ پلانا شروع کر دیتی تھی، چنانچہ اس منظر کو دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا: بتلاؤ! کیا یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟ تو صحابہ نے جواب میں عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہرگز نہیں، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لَلّٰہِ اَرْحَمُ بِعِبَادَہِ مِنْ ہٰذِہٖ بَوْلَدِہَا** (اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان ہیں، جتنا یہ عورت اپنے بچے پر مہربان ہے۔) <sup>(۱)</sup>

حدیث شریف میں آتا ہے: اللہ نے اپنی رحمت کے سو (۱۰۰) حصوں میں سے ایک حصہ دنیا میں اتارا ہے، اور اسی وجہ سے ماں اپنی اولاد کے ساتھ، جانور اپنے بچوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کرتے ہیں، حتیٰ کہ گھوڑی اپنا قدم زمین پر رکھنے سے پہلے دیکھ لیتی ہے کہ کہیں میرے بچے کے اوپر تو قدم نہیں پڑ رہا ہے؟ اور بہت احتیاط سے وہ نیچے قدم رکھتی ہے اسی محبت کی

(۱) آخر جہ البخاری برقم: ۵۶۵۳ و مسلم برقم: ۲۷۵۴.

وجہ سے۔<sup>(۱)</sup> گویا اللہ تعالیٰ نے رحمت کے صرف ایک حصہ کو ظہور عطا فرمایا ہے، اور آخرت میں ننانوے حصے ظاہر ہوں گے۔ تو اس رحمت کا ظہور شیخ سعدیؒ کے بقول ایسا ہوگا جو انہوں نے کہا ہے۔

وگر در دہد یک صلای کرم  
عزازیل گوید نصیبے برم

(بوستان)

(اگر اللہ تعالیٰ کرم کی ایک آواز لگا دیں، تو شیطان بھی کہے گا کہ مجھے بھی اس میں سے حصہ مل جائے، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی اس رحمت سے ناامید نہیں ہوتا)

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ظہور اس دنیا میں تو سب پر ہوتا ہے، مسلمان ہو، کافر ہو، انسان ہو، جانور ہو، جمادات ہو، بلکہ کافروں کو اللہ تعالیٰ ایسے لاڈ پیار کے ساتھ دنیا میں پالتے ہیں کہ کوئی اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی نعمتیں دنیا میں ان کے بھی شامل حال ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ساتھ تربیت کا معاملہ فرماتے ہیں۔

امام رازیؒ نے اسی الرحمن الرحیم کے تحت لکھا ہے: حضرت ابراہیم بن ادہمؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک جگہ مہمان تھا، کھانے کے لیے دسترخوان لگایا گیا، اچانک ایک کو آ یا اور ایک روٹی اٹھا کر کے بھاگا، وہ اس کے پیچھے پیچھے گئے تو وہ پہاڑیوں کے درمیان گیا، وہاں پہنچ کر جب دیکھا تو ایک آدمی کے دونوں ہاتھ بیڑیوں میں بندھے ہوئے تھے، وہاں مقید پڑا تھا، اس کوڑے نے جا کر اس کے منہ پر روٹی ڈال دی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے وہاں

(۱) آخر جہ البخاری برقم: ۵۶۵۴ و مسلم برقم: ۲۷۵۲

بھی اس کی روٹی کا انتظام کیا۔<sup>(۱)</sup>

## إلى طاعة الله:

ایک اور واقعہ بیان کیا ہے: حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنے گھر میں تھا، میرے دل میں ایک ولولہ اور بے چینی سی پیدا ہوئی تو میں گھر سے نکل کر دریائے نیل کی طرف گیا، جب کنارے پر پہنچا تو دیکھا کہ ایک بڑا بچھو بہت تیزی سے چل رہا ہے، تو میں اس کے پیچھے پیچھے چلا کہ یقیناً اس میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی کوئی حکمت پوشیدہ ہوگی، تھوڑی دیر چلا، اتنے میں دریائے نیل میں سے ایک بہت بڑا مینڈک کنارے پر آ کر کھڑا ہو گیا، اور وہ بچھو کو دکر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا، مینڈک اس بچھو کو لے کر دریا میں تیرنے لگا اور دوسری طرف جانے لگا۔ حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بھی جلدی سے ایک کشتی حاصل کی اور میں نے بھی اس کا پیچھا کیا، جب وہ مینڈک دوسرے کنارے پہنچا تو وہ بچھو چھلانگ لگا کر نیچے آ گیا اور پھر وہ تیزی سے جانے لگا، میں بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا، تھوڑی دور ایک درخت کے نیچے ایک نوجوان نشہ کیے ہوئے سو رہا تھا، اور دیکھا کہ وہاں ایک اژدہا اس کی ناف کی طرف سے اس کے جسم پر چڑھ کر اپنی پھن کھڑی کیے ہوئے تھا اور گویا کاٹنے کے درپے تھا کہ اچانک اس بچھو نے جا کر کو دکر اس سانپ کو اس زور سے ڈسا کہ سانپ تیوری کھا کر نیچے گرا، اور پھر وہ بچھو تیزی سے واپس جانے لگا، اور اسی طرح وہ مینڈک آیا اور اس نے دوسرے کنارے پر پہنچا دیا۔<sup>(۲)</sup>

حضرت ذوالنون مصریؒ کا یہی واقعہ ایک اور جگہ پر بھی ہے اس میں یہ ہے کہ حضرت

حضرت ذوالنون مصریؒ نے بعد میں اس نوجوان کو پاؤں ہلا کر کے بیدار کیا، جب ہوش میں آیا تو اس کو بتلایا کہ اے غافل! جانتا ہے کہ تیرے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کیا معاملہ ہوا؟ پھر پورا قصہ بیان کیا تو یہ سن کر وہ نوجوان کہنے لگا: اِلٰہی! ہذا فعلک بمن عصاک فکیف رفقک بمن یطیعک؟ (اے اللہ! تیرا یہ معاملہ تو اُس بندے کے ساتھ ہے، جو تیری نافرمانی میں مبتلا ہے، تو جو تیرے بندے تیری اطاعت اور فرماں برداری میں ہیں ان کے ساتھ تیرا کیا معاملہ ہوگا؟) یہ کہا اور اٹھ کر جانے لگا، تو حضرت ذوالنون مصریؒ نے کہا: کہاں جاتے ہو؟ تو اس نے کہا: اِلٰی طاعة الله! اب میں اللہ کی طرف جاتا ہوں۔ گویا اپنی اس زندگی سے توبہ کرتا ہوں۔<sup>(۱)</sup> حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو ہر ایک کو شامل حال ہے۔

## ماں کی ممتا، ایک سچا قصہ:

ایک اور روایت مشکوٰۃ میں موجود ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ تشریف فرما تھے، ایک آدمی چادر اوڑھے ہوئے ہاتھ میں کچھ لیے ہوئے تھا، جس کو اس چادر کے ایک کونے سے ڈھانپ رکھا تھا، وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! میں درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب سے گذر رہا تھا کہ مجھے وہاں سے پرندے کے بچوں کے بولنے کی آواز آئی، میں اندر گیا، تو چھوٹے چھوٹے بچے تھے جو ابھی اُڑنے کے لائق نہیں ہوئے تھے، ان کے پروں میں اتنی قوت نہیں تھی کہ وہ اڑ سکیں، تو میں نے بچوں

(۱) کتاب التواہین لابن قدامة ۱/ ۱۳۶ (ط: دار ابن حزم، بیروت) ونصه: فنهض الشاب وقال: اِلٰہی! ہذا فعلک بمن عصاک فکیف رفقک بمن یطیعک؟ ثم ولی وقلت اِلٰی أين؟ قال: اِلٰی البادية و الله لا عدت اِلٰی المدن أبداً.

کو اپنے ہاتھ میں لے کر ان پر چادر کا ایک کونہ ڈال دیا، اور درختوں کے جھنڈ میں سے باہر آیا، تو ان بچوں کی ماں میرے سر پر منڈ لانے لگی، میں نے جس کونے سے بچوں کو ڈھانپ رکھا تھا وہ ہٹا دیا تو ماں اپنے بچوں کے اوپر گری اور چٹ گئی، جانے کا نام ہی نہیں لیتی، میں نے اس کو بھی ڈھانپ لیا، اور یہ آپ ﷺ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: رکھو۔ اس نے ان بچوں کو نبی کریم ﷺ کے سامنے کھول کر رکھا، وہ ماں بھی ان کے ساتھ چپکی ہوئی ہے، بچوں کے بازوؤں میں طاقت نہیں تھی اس لیے نہیں اڑ سکتے تھے؛ لیکن ماں تو اڑ سکتی تھی، مگر بچوں کی محبت کی وجہ سے وہ بھی ان کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے حضرات صحابہؓ سے پوچھا: أتعجبون لرحم أم الأفراخ بفراخها قالوا: نعم یارسول الله ﷺ قال فوالذي بعثني بالحق لله أرحم بعباده من أم الأفراخ بفراخها۔ کیا ان بچوں کی ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ جو مہربانی، شفقت اور محبت ہے اس سے تم کو تعجب ہوتا ہے؟ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے دین حق لے کر کے بھیجا ہے اللہ تبارک و تعالیٰ کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے زیادہ مہربانی، شفقت اور محبت ہے جتنی ان بچوں کی ماں کو ان بچوں کے ساتھ ہے۔<sup>(۱)</sup> حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کے ساتھ جو محبت ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تو یہ رحم کا ظہور تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں۔ اور قیامت میں صفت رحمت کا بھی ظہور ہوگا۔ اس لیے علما لکھتے ہیں کہ اللہ کی ان صفوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ یعنی اگر ہم سے کچھ قصور ہو گیا ہے، گناہ ہو گئے ہیں تو اپنے گناہوں پر اڑے نہ رہیں، اترائیں نہیں؛ بلکہ اللہ کے حضور گڑ گڑائیں، اور رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگیں، اللہ معاف

(۱) مشکوٰۃ المصابیح: ۲۳۷۷ نقلًا عن السنن لأبي داود. (ط: المكتبة الإسلامية، بیروت)

کر دے گا، اللہ تو بڑا مہربان ہے۔ قرآن میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: یا عبادى الذین اسرفوا على انفسهم لا تقنطوا من رحمة الله ان الله یغفر الذنوب جمیعاً۔ (الزمر: ۵۳) (اے میرے وہ بندو! جنہوں نے نافرمانی کر کے، گناہ کر کے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، اللہ سارے گناہوں کو معاف کر دیں گے۔ اللہ تو بڑے مہربان ہیں)

## تو میرا بندہ، میں تیرا رب:

اللہ بندے کی توبہ سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ بخاری شریف میں حضرت انسؓ کی روایت ہے: اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے کتنا خوش ہوتا ہے اس کو نبی کریم ﷺ نے ایک مثال سے سمجھایا ہے۔ ایک آدمی اونٹ کے اوپر سارا کھانے پینے کا سامان لے کر سفر میں نکلا، صحرا کے اندر چل رہا ہے اور دوپہر کے وقت ایک درخت کے نیچے ٹھہر گیا اور اونٹ سے اتر کر آرام کرنے کے لیے وہاں لیٹ گیا، اونٹ کو وہاں چھوڑا، جب نیند سے اٹھا تو دیکھا کہ اونٹ غائب!!! اب کھانے پینے کا سارا سامان تو اسی پر تھا، اس لقمہ و دق صحراء میں اس کے لیے اور کوئی زندگی کا سہارا نہیں تھا، اس نے تلاش کیا، کچھ ملا نہیں، بالآخر مایوس ہو کر وہ اسی درخت کے نیچے۔ یہ سوچ کر کہ اب موت ہی آئی ہے تو یہیں آجائے۔ آکر لیٹ گیا، اسی میں آنکھ لگ گئی، تھوڑی دیر کے بعد آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اونٹ وہاں موجود ہے!!! اس کو دیکھ کر اس شخص پر اتنی خوشی طاری ہوئی کہ اس خوشی میں وہ کہنے لگا کہ: اے اللہ! تو میرا بندہ، میں تیرا رب۔ کہنا تو یوں چاہیے تھا کہ: اے اللہ! میں تیرا بندہ، تو میرا رب۔ وہ شکر کے طور پر کہتا ہے؛ لیکن خوشی میں اس کی زبان پھسل گئی، تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ: دیکھو! اس

آدمی کو کتنی خوشی ہوئی؟ اللہ کا کوئی بندہ جب توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کو اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے۔<sup>(۱)</sup>

## اے میرے بندو!

باری تعالیٰ خود قرآن میں فرماتے ہیں: یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسہم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً۔ اس میں بھی شانِ رحمت تو دیکھو! کہ ان گنہگاروں کو اللہ تعالیٰ یا عبادی (اے میرے بندو!) سے خطاب کرتے ہیں۔ دنیا میں باپ اگر اپنے بیٹے سے ناراض ہو اور کسی وجہ سے اس کو تنبیہ کرنا چاہے، تو اس کی ماں سے کہتا ہے: تیرے بیٹے کو کہہ دینا کہ میرے گھر میں قدم نہ رکھے!!! یعنی اپنا بیٹا نہیں کہتا، گویا اس کی اس بری حالت کی وجہ سے اپنی طرف نسبت کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ گنہگاروں کی اس حالت میں بھی اپنی طرف نسبت کرتے ہوئے یا عبادی اے میرے بندو! سے خطاب کرتے ہیں۔ کیا شانِ رحمت ہے!!! اس لیے اللہ تعالیٰ کی اس رحمت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اور آدمی گناہوں پر اصرار نہ کرے، اگر کوئی گناہ ہو گیا ہے تو توبہ کرے، اللہ تبارک و تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرمائیں گے۔ اور اتنا ہی نہیں کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرے، بلکہ اپنے بھائیوں کی طرف سے، دوسرے انسانوں کی طرف سے توبہ کرے، کسی کی طرف سے زیادتی کا معاملہ ہوا ہو، ظلم کا معاملہ ہوا ہو تو ان کو بھی معاف کر دے، ان کے ساتھ بھی رحمت کا معاملہ کرے۔

(۱) أخرجه البخاری برقم: ۵۹۴۹۔

## ارحموا من فی الارض:

محدثین کے یہاں مسلسل بالاولیۃ ایک حدیث ہے کہ سب سے پہلے استاذ اپنے شاگردوں کو سناتے ہیں اور شاگرد سب سے پہلے اپنے استاذ سے وہ روایت سنتے ہیں اس کو مسلسل بالاولیۃ کہا جاتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: الراحمون یرحمهم الرحمن تبارک و تعالیٰ ہے۔ (اللہ کے جو بندے دوسروں پر رحم کرنے والے ہیں ان پر رحم کرنا ہے) ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء<sup>(۱)</sup> (تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا) اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: لا یرحم اللہ من لا یرحم الناس (آخر جہ البخاری برقم ۷۳۷۶ واللفظ لہ و مسلم ۲۳۱۹) (جو لوگوں پر مہربانی نہیں کرتا، اللہ اس پر مہربانی نہیں کرتے) ہم لوگوں کے قصور کو معاف نہ کریں، ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ نہ کریں اور پھر اللہ سے رحمت کی امید رکھیں!!! ایس خیال است و محال است و جنوں! یہ ون سائنڈ ٹریفک نہیں چلا کرتا۔ اگر ہم اللہ سے رحمت کی امید رکھتے ہیں، تو ہمیں بھی دوسروں کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرنا چاہیے۔

## حضرت صدیق اکبرؓ کی بندگی:

دیکھو! حضرت عائشہ صدیقہؓ پر جب تہمت لگائی گئی تھی اور منافقین نے اس کو بہت ہوا دی، اس کا بڑا پروپیگنڈا کیا، تو اس کی وجہ سے بعض مخلص مومنین بھی دھوکے میں آ گئے، اور انہوں نے اس بات کو سچا سمجھ کر تہمت کے اس معاملہ میں حصہ لیا، جن میں حضرت

(۱) أخرجه الترمذی برقم: ۱۹۲۴ (ط: مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر) وأبو داود برقم:

۴۹۴۱ (ط: المكتبة العصرية، بيروت) وأحمد برقم: ۶۴۹۴ (ط: مؤسسة الرسالة، بيروت)



مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خالہ زاد بہن کے بیٹے تھے، مہاجرین میں سے تھے، اور غریب ہونے کی وجہ سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کا خرچ برداشت کرتے تھے۔ جب قرآن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت نازل ہوئی تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر کہا: اب میں ان پر خرچ نہیں کروں گا۔ براءت نازل ہوئی تو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس معاملے میں بری ہیں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے انصاف کی بات دیکھیے! کہ جب تک براءت نازل نہیں ہوئی، تب تک ان کا وظیفہ بند نہیں کیا، ہمارے دور اور مزاج کا دوسرا کوئی ہوتا، تو پہلے دن سے ہی معاملہ منٹ جاتا کہ میں خرچ دیتا ہوں اور ہماری بیٹی کے ساتھ ایسا ہو رہا ہے!!! لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انصاف کا تقاضہ یوں پورا کیا کہ جب تک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت اور بے گناہ ہونا ظاہر نہیں ہوا وہاں تک خرچ بند نہیں کیا، جب بے گناہ ہونا ظاہر ہوا اور قرآن میں آیت نازل ہوئی تو بات صاف ہو گئی کہ حضرت مسطح غلط تھے، قصور وار تھے۔ تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ میں ان پر خرچ نہیں کروں گا۔ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ قسم کھائی تو باری تعالیٰ نے قرآن پاک میں آیت نازل فرمائی: **وَلَا يَأْتِلُ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولَى الْقُرْبَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِيَعْفُوا وَلِيَصْفَحُوا إِلَّا تَجْبُوهِنَّ إِنَّ اللَّهَ لَكُم مَّا غَفُورٌ رَحِيمٌ**۔ (تم میں جو لوگ فضیلت اور مالی کشادگی والے ہیں وہ اس بات پر قسم نہ کھائیں کہ وہ ان کو نہیں دیں گے جو رشتہ دار ہیں اور غریب ہیں اور مہاجرین ہیں۔ ان کو معافی اور درگزر سے کام لینا چاہیے، کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کر دیں؟) گویا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ترغیب دی جا رہی ہے کہ تم ان کا قصور معاف کر دو، اللہ تمہارے قصور معاف کر

دیں گے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان کے سامنے یہ آیت تلاوت فرمائی، سنتے ہی فوراً حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: بلی واللہ انی لأحب أن يغفر الله لى. (۱) (کیوں نہیں! اللہ کی قسم! میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو معاف کر دے)

آج دنیا میں ہمارا معاملہ الٹا ہو گیا ہے، ہم اپنے متعلق تو یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ہمارے قصور معاف کر دیں؛ لیکن ہم لوگوں کے قصور معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اپنے متعلق تو ہماری خواہش اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ لوگ ہمارے ساتھ محبت کا، مہربانی کا، شفقت کا معاملہ کریں، اور ہم دوسروں کے ساتھ مہربانی، محبت و شفقت کا معاملہ کرنے کو تیار نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: من لا یرحم لایرحم (۲) جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحم نہیں کیا جاتا۔

بہر حال! یہ دونوں اللہ کے صفاتی نام ہیں۔ اللہ کی صفات سے بندوں کو بھی متصف ہونا چاہیے۔ یعنی ان صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ جب سب پر مہربان ہیں، تو ہمیں بھی اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہماری رحمت اور مہربانی سے بھی کوئی بچنے نہ پائے، دشمن، دوست، اپنا، پر یا سب کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ ارحموا من فی الأرض، زمین والوں پر رحم کرو، یرحمکم من فی السماء، آسمان والا تم پر رحم کرے گا لہذا اللہ تعالیٰ کے ان دو مبارک ناموں سے ہمیں بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اور ان صفات کو

(۱) أخرجه البخاری برقم: ۲۵۱۸.

(۲) أخرجه البخاری برقم: ۵۶۶۷ و مسلم برقم: ۲۳۱۸.

اختیار کر کے ہمیں بھی اللہ کی مخلوق کے ساتھ رحمت اور مہربانی کا معاملہ کرنا چاہیے۔ اگر ایسا کریں گے، تو جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ معاف کر دیتے ہیں، ہمارے گناہ بھی معاف ہو جائیں گے۔ اللہ کی رحمت بڑی وسیع ہے۔

باز آ باز آ ، ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما، درگہ نو میدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(ابوسعید ابوالخیر)

آ جاؤ! واپس آ جاؤ! جو کچھ کیا ہے واپس آ جاؤ، تم کافر ہو، مجوسی ہو، بت کی پوجا کرنے والے ہو پھر بھی آ جاؤ، ہماری یہ بارگاہ اور ہمارا یہ دربار ناامیدی کا نہیں ہے، سو بار توبہ توڑ چکے ہو تو بھی آ جاؤ۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اتنا مہربان خدا! اس کو چھوڑ کر ہم کہاں جائیں گے؟ دنیا میں کوئی ایسا ہے جو ہمیں پناہ دے؟

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ حشر اب کو ترے عفو بندہ نواز میں

(اقبال)

حقیقت میں دنیا میں اللہ کی رحمت کے علاوہ کوئی پناہ دینے والا نہیں ہے، اسی لیے اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ گناہ ہو گیا ہے تو توبہ کرو، اللہ کی طرف رجوع کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں اس سورت کو پڑھنے کا حکم دیا ہے تو ہمیشہ نماز میں جب بھی اس سورت کو پڑھیں تو اس کو پڑھتے وقت یہ تصور کرنا چاہیے، یہ سبق تازہ کر لینا چاہیے۔

الرحمن الرحيم ُ اللہ تعالیٰ جب اتنے مہربان ہیں، تو اس کی اسی رحمت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو راہ حق دکھائے بغیر گمراہی کے اندر ویسے ہی نہیں چھوڑ دیں گے؛ بلکہ ان بندوں کو راہ حق دکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبیوں کا سلسلہ جاری فرمایا۔ اس سے رسالت کا ثبوت ہوتا ہے۔ تو اسلام کے بنیادی تین عقائد ہیں (۱) عقیدہ توحید، الحمد للہ رب العلمین ُ سے (۲) عقیدہ رسالت، الرحمن الرحيم ُ سے اور (۳) عقیدہ آخرت ملک یوم الدین ُ سے ثابت ہوتا ہے۔

ملک یوم الدین: جو روزِ جزاء کا مالک ہے۔

لفظ دین، بدلہ اور حساب دونوں معنی میں آتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے:   
الکیس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت (۱) ہوشیار وہ ہے جو اپنے نفس سے حساب لے اور موت کے بعد والی زندگی کے لیے عمل کرے۔ دین یہاں حساب کے معنی میں آیا ہے۔   
آیت میں دونوں معنی کرتے ہیں: روز حساب کا مالک ہے، یا روز جزاء کا مالک ہے۔ اس لیے کہ کسی کو کوئی بدلہ دینا چاہیں گے، تو پہلے حساب کرنا پڑے گا، بدلہ کے لیے حساب لازم ہے، اور جب حساب کریں گے تو بدلہ دیا جائے گا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہیں۔

ہماری ملکیت محبازی ہے:

دیکھو! اللہ تعالیٰ تو اس دنیا میں بھی ہر چیز کا مالک ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے دنیا کے

(۱) أخرجه الترمذی برقم: ۲۴۵۹ (ط: مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر) وابن ماجه برقم:

(۲۲۶۰) (ط: دار احیاء الکتب العربیة - فیصل عیسیٰ البابي الحلبي، مصر)

اندر اپنی ایک خاص حکمت اور مصلحت کی وجہ سے انسانوں کو بھی عارضی اور مجازی طور پر مالک بنایا، حقیقی مالک تو اللہ ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگی میں انسانی ملکیتوں کو بھی تسلیم کیا، اسی لیے تو زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔ اگر مالک نہ مانا جائے تو زکوٰۃ کہاں سے فرض ہوگی؟ اور ہر آدمی جو کپڑے پہنے ہوئے ہے، اس سے پوچھیں کہ یہ کپڑے کس کے ہیں؟ تو کہے گا: میرے ہیں۔ یہ مکان کس کا ہے؟ میرا ہے۔ ملکیت ثابت ہوتی ہے۔

دنیا میں اللہ نے ملکیت کو تسلیم کیا اور ہر ایک کو مالک بنایا۔ دنیا میں حاکم بھی بنایا، حکمران بھی بنائے، لیکن ان حکمرانوں کی حکومت بھی دنیا میں عارضی اور مجازی ہے۔ حقیقی مالک اور حقیقی حکمران تو اللہ ہیں۔ دنیا کی اس زندگی میں اللہ نے اپنی مصلحتوں کے پیش نظر انسان کی مالکیت، ملوکیت اور بادشاہت کو منظوری دی، عارضی ہی سہی۔ لیکن ایک دن ایسا آنے والا ہے: روز جزاء، اُس دن دنیا کی یہ عارضی اور مجازی حکومتیں بھی ختم ہو جائیں گی، کوئی کسی چیز کا مالک نہیں؛ بلکہ حشر کے میدان میں اللہ تعالیٰ ایسے ہی پیدا کر کے لائیں گے کہ کہا بد اُنا اول خلق نعیده وعداً علینا انا کنا فعلمین (الانبیاء: ۱۰۴) یعنی جیسے ہم نے ماں کے پیٹ سے؛ پہلے پیدا کیا تھا ویسے ہی ہم دوبارہ ان کو زندہ کریں گے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ انسانوں کو قبروں سے زندہ کر کے اٹھائیں گے تو بدن پر کوئی لباس نہیں ہوگا، پاؤں میں جوتے نہیں ہوں گے، اور جیسے بچہ غیر مختون پیدا ہوتا ہے ویسے غیر مختون اٹھائیں گے۔ کسی کے پاس کچھ نہیں۔<sup>(۱)</sup> بچہ جب ماں کے پیٹ سے آتا ہے کیا لے کر آتا ہے؟ کچھ پوٹلہ لاتا ہے؟ کچھ نہیں! تو قیامت

(۱) أخرجه البخاری برقم: ۶۱۶۱ و مسلم برقم: ۲۸۵۹۔

کے روز بھی اللہ تبارک و تعالیٰ جب قبروں سے دوبارہ پیدا کر کے اٹھائیں گے، اسی کیفیت کے ساتھ، کسی کے پاس کچھ نہیں ہوگا! یہ ظاہری، مجازی، عارضی ملکیتیں جو اللہ نے دنیا میں عطا فرمائی تھیں، کسی کے پاس کوئی چیز نہیں ہوگی، سب ایسے ہی ننگ دھڑنگ ہوں گے۔ اور کسی بادشاہ کی کوئی حکومت اور بادشاہت نہیں ہوگی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ خود ہی پکاریں گے: **لن الملك اليوم** آج کس کی حکومت ہے؟ کوئی جواب دینے والا نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ خود ہی فرمائیں گے: **لله الواحد القهار**۔ (المؤمن: ۱۶) اس اکیلے اللہ کی جو ہر چیز پر غالب ہے۔ اللہ کی حقیقی حکومت کا ظہور اس روز جزاء اور قیامت کے دن ہوگا۔

## جزاء و نزا دنوں ہی اعلیٰ:

اس کو روز جزاء اس لیے کہتے ہیں کہ اس دن دنیا میں جو اعمال کیے گئے ہیں ان کا بدلہ دیا جائے گا۔ اس میں گویا عقیدہ آخرت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بنیادی عقیدہ ہے۔ اس لیے کہ دیکھو! اگر اس دنیا ہی کی زندگی کو مانا جائے، تو دنیا میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کفر کرتے ہیں، ان کی پوری زندگی نافرمانی میں گذرتی ہے، اور اس کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں! کھاپی رہے ہیں، مزے کر رہے ہیں، عیش کر رہے ہیں، اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے دوسرے بندے وہ بھی ہیں، جو ہر وقت اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری میں ہیں، لیکن تکلیف میں ہیں، ذرہ برابر ان کو چین نہیں۔ تو آدمی سوچتا ہے کہ اس کی پوری زندگی نافرمانی میں گذری، اس کی ان نافرمانیوں کا کیا ہوگا؟ بدلہ ملے گا یا نہیں؟ اور یہ فرماں بردار کہ اس کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں گذری، اس کا کیا؟ اس کو کیا نیک بدلہ

ملے گا؟ تو ہمیں بتلایا گیا کہ یہ دنیا کی زندگی ایسی نہیں کہ کھایا پیا اور ختم ہو گیا، نہیں! اس کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے، یہ دنیوی زندگی تو عمل کے لیے ہے، یہاں بدلہ نہیں ہے۔ بدلہ تو آخرت میں دیا جائے گا، وہی بدلہ کا دن ہے۔ اس وقت بدلہ ہوگا، اور اس وقت جنہوں نے نیکیاں کی ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ کے مطیع اور فرمان بردار ہیں ان کو اللہ تعالیٰ انعامات سے نوازیں گے۔ اور جو گنہگار، نافرمان ہیں اللہ تعالیٰ ان کو سزا دیں گے۔

جن کو اطاعت کی وجہ سے نعمتوں سے نوازیں گے وہ نعمتیں بھی کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی ہوں گی، دنیا میں اس کا کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا۔ اور نافرمانوں کو جو سزائیں دی جائیں گی وہ بھی اعلیٰ درجہ کی ہوں گی، اس میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ تو ملک یوم الدین یعنی روز جزاء کا مالک ہے۔ اس میں عقیدہ آخرت کی طرف اشارہ ہے۔ گویا اسلام کی بنیادی تعلیمات میں تین چیزیں ہیں (۱) توحید (۲) رسالت (۳) آخرت سورہ فاتحہ کی پہلی تین آیتوں میں ان کی طرف اشارہ ہو گیا۔

## سورہ فاتحہ

(مورخہ: ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۹ھ، مطابق ۱۱ فروری ۲۰۱۸ء شب یکشنبہ)

(قسط - ۳)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنُسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ  
بِاللّٰہِ شُرُوْرَ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاَتِ اَعْمَالِنَا وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ شُرُوْرَ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاَتِ اَعْمَالِنَا  
مَنْ یَّہْدِہٖ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُضِلّْہٗ فَلَا هَادِیَّ لَہٗ وَ نَشْہَدُ اَنْ لَا اِلَہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ حْدَہٗ  
لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْہَدُ اَنْ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہٗ اِلَیْ کَافَّةِ  
النَّاسِ بِشَیْرِ اَوْ نَذِیْرٍ اَوْ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُنِیْرًا صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی  
اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَ بَارَکْ وَ سَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا . اَمَّا بَعْدُ .

الحمد لله رب العالمین ۞ الرحمن الرحیم ۞ ملک يوم الدين ۞ اياک  
نعبد و اياک نستعين ۞

## ما قبل سے ربط:

سورہ فاتحہ چل رہی ہے، اب تک اس کی پہلی تین آیتیں ہو گئیں:

الحمد لله رب العالمین ۞ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، جو تمام جہانوں

کا پروردگار ہے۔

الرحمن الرحیم ۞ جو سب پر مہربان اور بہت زیادہ مہربان ہے۔

ملک يوم الدين ۞ جو روز جزاء یا روز حساب کا مالک ہے۔

ان تین آیتوں میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسلام کے تین بنیادی عقائد کی طرف



اشارہ فرمایا ہے۔ یہ تینوں اسلام کے بنیادی عقائد ہیں۔

## توحید:

پہلا عقیدہ توحید کا ہے، یعنی ہم اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کو عبادت کے لائق مانتے ہیں، کوئی اور عبادت کے لائق نہیں ہے، اسی کی عبادت کی جاتی ہے، کیوں کہ جب سارے جہانوں کا وہی پروردگار ہے، اُسی نے سب کو پیدا کیا، اسی نے سب کو کمال تک پہنچایا، وہی سب کی پرورش کرتا ہے تو وہی اس بات کے لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، چوں کہ اس میں کوئی اور اس کا شریک نہیں ہے، وہی تنہا خالق بھی ہے، مالک بھی ہے، رازق بھی ہے، تربیت کرنے والا بھی ہے، ہر چیز کو اس کے کمال تک پہنچانے والا ہے، تو جب سب کچھ وہی ہے، تو وہ اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، اس کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے، یہ توحید کی طرف اشارہ ہوا۔ توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو نہ معبود مانا جائے اور نہ کسی اور کی عبادت کی جائے۔

## رسالت:

الرحمن الرحیم<sup>ط</sup> جو سب پر مہربان اور بہت مہربان ہے۔

اسی مہربانی اور صفت رحمت کا تقاضہ تھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جب انسان کو دنیا میں بھیجا ہے تو اس کو یوں ہی اندھیروں میں نہ چھوڑ دے؛ بلکہ کیوں بھیجا گیا ہے اس کو باقاعدہ بتلایا جائے، چنانچہ اسی کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے پیغمبروں کا سلسلہ جاری فرمایا۔ حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام سے لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں میں مختلف پیغمبر بھیجے، سب سے آخری پیغمبر اور رسول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان پیغمبروں

نے انسانوں کو یہ بتلایا کہ تمہیں دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے؟ تمہیں کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ تمہاری پیدائش کس لیے کی گئی ہے؟ وما خلقت الجن و الانس الا ليعبدون۔ (الذریٰۃ: ۵۶) اللہ نے اپنی عبادت اور اطاعت کے لیے تم کو پیدا کیا ہے۔ اور یہ بات بتلانے کے لیے حضرات انبیاء علیہم السلام اگر نہ بھیجے جاتے تو انسانوں کو کیسے پتہ چلتا کہ ہمیں دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے؟ اور ان پیغمبروں اور رسولوں پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی کتابیں بھی اتاریں اور ان میں زندگی گزارنے سے متعلق تمام احکام بتلائے گئے کہ تمہیں اس طرح زندگی گزارنی ہے۔ اللہ تعالیٰ جس زندگی سے راضی ہو وہ کون سی ہے؟ وہ بتلائی گئی؛ تاکہ لوگ اس کے مطابق اپنی زندگی کو استوار اور ہموار کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کون سے طریقہ زندگی سے ناراض ہیں وہ بھی بتلادیا تاکہ لوگ اپنے آپ کو اس سے بچائیں۔ چنانچہ اس آیت میں رسالت کے عقیدے کی طرف اشارہ کیا گیا۔

## آخرت:

ملک يوم الدين ۞ وہی روز جزاء اور روز حساب کا مالک ہے۔

ایک دن آنے والا ہے اللہ تبارک و تعالیٰ اُس دن حساب لیں گے، یعنی یہ نہ سمجھا جائے کہ اس دنیا میں بس پیدا ہوئے، کھایا پیا اور ختم ہو گئے!!! نہیں! بلکہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جو دائمی زندگی ہے، جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ اور اس دائمی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا مدار اس دنیوی زندگی پر ہے۔ اگر ہم نے اس دنیوی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کے مطابق گزارا، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور پیغمبروں کے ذریعہ زندگی گزارنے کا جو طریقہ اپنی کتابوں میں اتارا ہے، اس کے مطابق

اگر یہ زندگی گزاری، تب تو وہاں کامیابی ہے اور ہمیشہ کی نعمتیں ہیں۔

اور اگر خدا نخواستہ اس زندگی کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں گزارا، اللہ نے جن چیزوں سے منع کیا تھا ان کا ارتکاب کرتے رہے، اللہ کی نافرمانی میں رہے، کھایا پیا اور اسی میں لگے رہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکام کو توڑا، تو دائمی زندگی میں ناکامی مرتب ہوگی، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے واسطہ پڑے گا، اللہ کا عذاب ہمیشہ ہمیش کے لیے بھگتنا پڑے گا۔ یہ مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے روز جزاء اور روز حساب کے مالک ہونے کا۔ گویا اس آیت میں آخرت کے عقیدے کی طرف اشارہ کیا گیا۔

پہلی آیت میں توحید، دوسری آیت میں رسالت اور تیسری آیت میں آخرت کے عقیدے کی طرف اشارہ کیا گیا۔ یہ تین عقائد اسلام کے بنیادی عقائد ہیں۔

آخرت: یہی زندگی نہیں ہے بلکہ اس کے بعد ایک زندگی آنے والی ہے اور وہ اصلی زندگی ہے۔ اور وہاں اللہ تعالیٰ، انسانوں نے دنیا میں جو کچھ کیا ہے اس کا حساب لیں گے۔

### أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ:

ہم جو کچھ کرتے ہیں اس کے متعلق یہ نہ سمجھیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کو پتہ نہیں ہے، وہ تو عالم الغیب والشہادۃ ہے، سب کچھ جانتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا بھی انتظام کیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ اللہ کی طرف سے دو فرشتے بٹھائے گئے ہیں، جو ان کے سارے اعمال کو لکھتے ہیں، اس کا ریکارڈ رکھتے ہیں، اذیتلقی المتلقین عن الیمین و عن الشمال قعید۔ ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید۔ (ق: ۱۸، ۱۹) یہ لینے والے، لکھنے والے کچ (Catch) کرنے والے دو فرشتے دائیں اور بائیں بیٹھے ہوئے

ہیں اور آدمی جو کچھ بولتا ہے وہ اس کو نوٹ کرتے ہیں۔ ہم یوں نہ سمجھیں کہ ہم جو بول رہے ہیں وہ ہوا میں تحلیل ہو گیا، ختم ہو گیا۔ نہیں! ایک ایک بول محفوظ کیا جاتا ہے۔ آدمی کے سارے اعمال کا اللہ تعالیٰ کے یہاں ریکارڈ ہے۔

جب قیامت کے روز ہاتھ میں اس کا اعمال نامہ دیا جائے گا اور انسان اس کو دیکھے گا تو وہ کہے گا: مالِ هذا الكتب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصها (الكهف: ۴۹) اس صحیفہ کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی چھوٹی بڑی چیز ایسی نہیں ہے جو اس میں نہ ہو، ہماری زندگی کا سارا کچا چٹھا اس کے اندر ہوگا، کوئی چیز چھوٹی ہوئی نہ ہوگی، لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصها ووجدوا ما عملوا حاضراً ولا يظلم ربك احداً۔ انسان دنیا میں اپنا کیا ہوا سب کچھ موجود پائیں گے، اور وہ انکار نہیں کر سکیں گے، اور اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ تو بندوں کو ان کے اعمال دکھلا دیں گے، ان کے اعمال پر گواہ پیش کریں گے۔

## اعضاء کی گواہی:

بندوں سے پہلے جب پوچھا جائے گا تو بندے پہلے جھوٹ بھی بولیں گے؛ لیکن اللہ تعالیٰ زبان بند کر دیں گے اور دوسرے اعضاء گواہی دیں گے۔ جن اعضاء سے اس نے گناہ کیے تھے ہر عضو گواہی دے گا۔ آنکھ نے جو گناہ کیا تھا آنکھ بولے گی، کان نے کیا تھا کان بولے گا، ہاتھ نے کیا تھا ہاتھ بولے گا۔ ہر عضو بولے گا؛ تو وہ کہے گا کہ بھئی! تمہارے لیے تو میں نے کیا تھا، اور تم ہی میرے خلاف گواہی دے رہے ہو؟!!! وہ اعضاء کہیں گے: اللہ تعالیٰ نے ہم کو بولنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے اور ہم سب بتلائیں گے۔ اور جس زمین

پرگناہ کیے ہیں، اس زمین پر اگر نیکی کی ہے تو اس پر اور اگر گناہ بھی ہیں، تو اس کے خلاف گواہی دے گی۔ لہذا کوئی چیز چھوٹنے والی نہیں ہے۔ آدمی کو ہر وقت اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ سب ریکارڈ ہو رہا ہے اور ان سب کے متعلق قیامت کے دن مجھے اللہ کو حساب دینا ہے، وہی روز حساب کا مالک ہے۔

### ان تعدوا نعمة الله ... :

قیامت کے روز بندے کو جب اللہ تعالیٰ کے حضور حساب کے لیے پیش کیا جائے گا تو اس وقت اس کے ساتھ تین رجسٹر بھی پیش کیے جائیں گے۔

(۱) تمام نیکیوں اور اچھے اعمال کا تذکرہ ہوگا۔

(۲) گناہوں کا تذکرہ ہوگا۔

(۳) ان تمام نعمتوں کا تذکرہ ہوگا جن کو پوری زندگی استعمال کیا۔ (یہ متعدد آیات و احادیث

سے ثابت ہے)

ہم پانی پیتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہر چیز کو استعمال کرتے ہیں وہ سب ریکارڈ ہے، قرآن کریم میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں: لتسئلن يومئذ عن النعيم (التكاثر: ۸) قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے ہاں ان نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے حضور جب پیشی ہوگی تو نعمتوں کے رجسٹر میں جو سب سے چھوٹی نعمت ہوگی، اللہ تعالیٰ اس کو کہیں گے کہ اس کی عبادتوں کے اندر سے تو اپنی قیمت وصول کر لے، چنانچہ وہ آگے بڑھے گی اور ساری عبادتوں کو سمیٹ ایک جانب کھڑی ہو جائے گی۔ باری تعالیٰ پوچھیں گے: کیا بات ہے؟ تو وہ عرض کرے گی: میں نے اس کی ساری عبادتیں

لے لیں؛ لیکن میری قیمت ادا نہیں ہوئی۔ وہ بندہ لرز جائے گا کہ اب کیا ہوگا؟ تو اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ مہربانی کرنا چاہیں گے، اس کو فرمائیں گے: جا! میں نے تیرے گناہوں کو معاف کر دیا اور اپنی نعمتوں کا حساب بھی تجھ سے نہیں لیتا اور تیری نیکیوں کو میں اضعافاً مضاعفہً، کئی گنا کر دیتا ہوں۔ وہ بندہ خوش ہو جائے گا۔<sup>(۱)</sup>

اور جس کی گرفت کرنا مقصود ہوگی وہ تو وہیں سے لرز جائے گا کہ اللہ کی ایک نعمت میں میری ساری عبادتیں چلی گئیں، اب تو گناہ ہی رہ گئے اور یہ مجھے جہنم میں ہی لے جائیں گے۔ واقعہ یہی ہے! ہم زندگی بھر عبادتیں کریں تو بھی اللہ تعالیٰ کی ایک چھوٹی سی نعمت کی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ ایک گلاس پانی کی قیمت ہم سے ادا نہیں ہو سکتی۔

### پانچ سوالات، ایک نمونہ:

مختلف احادیث میں مختلف انداز سے نبی کریم ﷺ نے قیامت کے دن جن جن نعمتوں کی باز پرس ہوگی ان کی تفصیلات بتلائی ہیں۔ آپ نے فضائل صدقات میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی وہ روایت سنی ہوگی: لا تزول قدم ابن آدم يوم القيامة من عند ربه حتى يسئل عن خمس<sup>(۲)</sup> قیامت کے روز انسان کے پاؤں اللہ کے حضور سے اُس وقت تک ہٹ نہیں پائیں گے، جب تک کہ پانچ چیزوں کے متعلق سوال نہ ہو جائے:

(۱) عن عمرہ فیم أفناه (جو زندگی دی تھی اس کو کہاں خرچ کیا؟)

(۱) بعض معاصر شارحین نے حدیث ”من نوقش الحساب عذب“ کی شرح میں اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت و

صفت عدل کو بیان کرتے ہوئے اسے ذکر کیا ہے

(۲) أخرجه الترمذی برقم: ۲۴۱۶ وغیرہ۔

اس میں سب کچھ آگیا، جسم اور اس میں جو قوی اللہ تعالیٰ نے دیے، آنکھیں دیں، کان دیے، زبان دی، ہاتھ دیے، پاؤں دیے، دل دیا، دماغ دیا، یہ ساری صلاحیتیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائیں، تو اس زندگی کے متعلق سوال ہوگا کہ آپ نے کہاں ختم کی؟

(۲) وعن شبابہ فیم ابلاہ (جوانی کو کہاں استعمال کیا؟)

جوانی زندگی کا سب سے بہترین حصہ ہے، جوانی میں آدمی کی صلاحیتیں بالکل شباب پر ہوتی ہیں، سو جوانی سے متعلق مستقل سوال ہوگا۔

(۳، ۴) ومالہ من این اکتسبہ وفیم أنفقہ (اور مال سے متعلق سوال ہوگا کہ کہاں

سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟)

(۵) وماذا عمل فیما علم (جو چیز تمہارے علم میں آئی اس پر کتنا عمل کیا؟)

یہ تو ایک نمونہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف ان ہی پانچ چیزوں کے متعلق سوال ہوگا، بلکہ ساری چیزوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اس لیے آدمی کو دنیا میں ہمیشہ یہ دھیان رہنا چاہیے کہ میرے چلنے سے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہوگا۔ میرے بول، کسی کے ساتھ معاملہ کرنے سے متعلق بھی مجھ سے سوال کیا ہوگا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں زندگی گزارنے کا حکم دیا ہے اس کے مطابق ہمیں زندگی گزارنی ہے، اور جس قسم کے طریقہ زندگی کو اللہ تعالیٰ نے ناپسند بتلایا ہے اس سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔ فرائض و واجبات کی ادائیگی کرنی ہے، حرام سے بچنا ہے، حلال کا اہتمام کرنا ہے۔ اسی طرح تمام امور کا اہتمام کرنا ہے۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ حساب میں یہی پوچھیں گے۔ اور وہاں سب کچھ موجود ہوگا تو بندہ انکار بھی نہیں کر سکے گا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنی بڑی ذمہ داری ہم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی

ہے کہ ہمیں اپنی زندگی کو جس طرح اللہ چاہتے ہیں اسی طرح گزارنا ہے، کیسے گزاریں گے؟ سو آگے اس کا طریقہ بتلایا:

ایاک نعبد و ایاک نستعین (اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں)

عبادت یعنی بندگی، غلامی۔ ہم تیری ہی غلامی کرتے ہیں، دنیا میں کسی اور کو اپنا مطاع نہیں سمجھتے۔ واجب الاطاعة اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھیں۔ دنیا میں کوئی بڑے سے بڑا بادشاہ بھی ہو، والدین ہوں، بیوی کے حق میں شوہر ہو، یا حاکم وقت ہو ان سب کی اطاعت کا حکم قرآن یا حدیث میں کہیں آیا بھی ہے تو وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ ان کی طرف سے دیے جانے والے احکام اور آرڈر (Order) اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف نہ ہوں۔

### لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق:

اولاد کو اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کا حکم دیا؛ لیکن اگر والدین کوئی ایسی بات کرنے کو کہتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہے، تو اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کا حکم ماننے کے لیے فرمایا ہے، لہذا اگر والدین ناجائز کام کرنے کے لیے کہیں تو وہ بھی کریں۔ نہیں! والدین ناجائز کام کرنے کے لیے کہیں گے تو ہم اس پر عمل نہیں کریں گے۔

مکہ میں ایمان لانے والے صحابہ میں سے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی تھے، یہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، وہ جب ایمان لائے، تو ان کی والدہ نے ان سے کہہ دیا کہ تم اس دین سے باز آ جاؤ، اور اس دین کا انکار کرو، اور میری بات مانو، ورنہ میں کھانا نہیں کھاؤں گی



والدہ نے بھوک ہڑتال کر دی کہ جب تک تم اس دین کو نہیں چھوڑو گے وہاں تک کھانا نہیں کھاؤں گی۔ اب وہ عجیب کشمکش میں آگئے کہ ماں کا یہ حکم ہے، وہ اللہ کے ساتھ شرک کرنے کو کہہ رہی ہیں۔ نبی کریم ﷺ سے آکر عرض کیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آیت نازل فرمائی: **وان جاهدك على ان تشرك بي ما ليس لك به علم فلا تطعهما وصاحبهما في الدنيا معروفا۔ (لقمن: ۱۵)** ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہے؛ لیکن باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر وہ تم کو میرے ساتھ شرک کرنے کے لیے کہیں تو ان کی بات مت مانو۔<sup>(۱)</sup>

شریعت نے ایک اصول بتلادیا: لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق<sup>(۲)</sup> جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو وہاں کسی بھی مخلوق کی کوئی بات نہیں مانی جائے گی۔ چاہے وہ حاکم وقت ہو، چاہے بادشاہ وقت ہو، چاہے باپ ہو، چاہے شوہر ہو، چاہے کوئی بھی ہو اس کی بات نہیں مانی جائے گی۔ اس کی بات صرف اس شرط کے ساتھ مانی جائے گی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی لازم نہ آتی ہو۔

## رب چاہی یا من چاہی:

إنما الطاعة في المعروف<sup>(۳)</sup> جن لوگوں کی اطاعت اور فرماں برداری کا

(۱) أخرجه مسلم برقم: ۴۸۱۔

(۲) أخرجه الطبرانی بهذا اللفظ في الأوسط برقم: ۳۹۱۷ (ط: دار الحرمين، القاهرة) وأخرجه أحمد في مسنده برقم: ۲۰۶۵۳ و ۲۰۶۵۶ و لفظه: ”لا طاعة في معصية الله۔

(۳) أخرجه البخاری برقم: ۴۰۵۰۔

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے،، وہ ایک شرط کے ساتھ کی جائے گی کہ نیکی کے کام میں ان کی بات مانی جائے گی، اگر وہ گناہ کے کام کے لیے کہیں تو اس پر عمل نہیں ہوگا۔ چنانچہ ایسا نعبہ کہہ کر بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور اقرار کرتا ہے کہ اے اللہ! میں تیری ہی مانوں گا۔ جس وقت ہم نماز میں یہ اقرار کر رہے ہیں، سوچئے! ہم اللہ ہی کی مان رہے ہیں یا اوروں کی بھی مان رہے ہیں؟ اللہ کے حکم پر چل رہے ہیں؟ رب چاہی زندگی گزار رہے ہیں یا من چاہی زندگی گزار رہے ہیں؟ اپنے نفس کی بات مان رہے ہیں؟ اپنی بیوی کی بات مان رہے ہیں؟ یا اپنے دوستوں کی بات مان رہے ہیں؟ اللہ کے حکم کو چھوڑ کر فرینڈ سرکل جو کہہ رہا ہے اس کے مطابق کر رہے ہیں؟ سوچ لو!!! ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے جھوٹا اقرار کرتے ہیں؟ کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

اس اقرار کا علاج بتلایا گیا کہ آپ اپنے اوپر اللہ کی اطاعت لازم کر لو، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو واجب الاطاعت مت سمجھو، اللہ تعالیٰ ہی کے حکم کو ہر حال میں ماننا ہے، چاہے وہ حکم ہماری چاہت کے موافق ہو یا مخالف؛ ہمیں اس پر عمل کرنا ہے۔

حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جب کلمہ اُشہد اُن لا اِلٰہَ اِلَّا اللہ پڑھا، تو کلمہ پڑھ کر انہوں نے اس بات کا اقرار کر لیا اور بتا دیا کہ ہم اللہ ہی کے حکم کو مانیں گے۔

## شراب کی لت کو لات:

شراب ایک ایسی لت ہے کہ اگر لگ جائے تو آسانی سے چھوٹی نہیں ہے۔ آج کل کسی کو بیڑی اور سگریٹ کی لت ہے، کسی کو پان کی، کسی کو لٹکھا کی۔ ساری دنیا اور بہت سے لوگ سمجھاتے ہیں؛ لیکن وہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اور اگر شراب کی لت پڑ جائے!

اس سے تو اللہ ہی بچائے!!

ذوق نے کہا ہے: ع

چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

تو یہ شراب کی لت ایسی خطرناک ہے کہ آسانی سے چھوٹی نہیں ہے۔

یورپ کے متعلق لکھا ہے: ۱۹۲۲ء میں جب یورپ کے حکمرانوں اور دانش مندوں نے دیکھا کہ شراب میں بڑا نقصان ہے، اس کی وجہ سے حادثات ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے بہت سارا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے، تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ شراب پر قانونی طور پر پابندی لگائی جائے۔ چنانچہ سب نے یہ قانون پاس کر کے شراب پر پابندی لگا دی۔ پھر کیا ہوا؟ جب پابندی لگتی ہے، قانون بنتا ہے تو اس پر عمل کرانے کے لیے پولیس میدان میں آتی ہے، ایجنسیاں قانون پر عمل کرنے کے لیے اس کی نگرانی کرتی ہیں۔ اب شراب کے کارخانے حکومت نے بند کر دیے، لیکن شراب کی عادت نہیں چھوٹی تھی، انہوں نے گھر میں بھٹیاں بنالیں، اور گھر میں شراب بنا کر پینا شروع کیا، کارخانے تھے تب تو فضا کچھ ٹھیک رہتی تھی، گندگی نہیں ہوتی تھی؛ اب جب گھر گھر میں بھٹیاں بن گئیں تو گندگی بھی عام ہو گئی۔ اور لوگ مجمع میں سب کے سامنے تو نہیں پیتے تھے؛ لیکن تنہائیوں میں انہوں نے پینا شروع کر دیا، تنہائیوں میں کون روکنے والا ہے؟

بہت مشکل ہے بچنا بادۂ گل گوں سے خلوت میں

بہت آساں ہے یاروں میں معاذ اللہ کہہ دینا

یعنی دوستوں کی مجلس میں نعوذ باللہ! کہہ کر اپنی بزرگی کا اظہار کرنا تو بہت آسان

ہے؛ لیکن تنہائی میں اس سے بچنا بہت مشکل ہے۔ تو یہ شراب ان لوگوں سے نہیں چھوٹی، بالآخر حکومتوں نے وہ قانون اٹھالیا۔

شراب کی لت عربوں میں کئی بیڑھیوں سے چلی آرہی تھی، ان عربوں کو شراب سے ایسی عجیب و غریب محبت ہوا کرتی تھی کہ عربی زبان میں شراب کے دوسو سے زائد نام ہیں۔ انگوڑی شراب، کھجور کی شراب، مکئی کی شراب، ہر قسم کی شراب کا نام الگ۔ پھر شراب کو پانی کے ساتھ ملائیں تو اس کا نام الگ، صبح کو پیئیں تو نام الگ، شام کو پیئیں تو نام الگ، ایسے الگ الگ نام ہیں۔ ان کو شراب سے بہت عشق تھا۔ انہی کے متعلق جب شراب کی حرمت کی آیت قرآن میں نازل ہوئی: **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا** (البقرة: ۲۱۹) (اے نبی! یہ لوگ آپ سے شراب کے متعلق پوچھتے ہیں، تو آپ کہہ دیجیے کہ ان میں خرابیاں بھی ہیں اور فائدہ بھی ہے؛ لیکن خرابیاں فائدے سے زیادہ ہیں) ابھی حرمت کا حکم نہیں دیا؛ لیکن بعض اتنے دانشمند تھے کہ جیسے ہی یہ آیت نازل ہوئی اسی وقت انہوں نے شراب کو چھوڑ دیا، پھر تو صراحۃً انما الخمر والمیسر والانساب والازلام رجس من عمل الشیطن فاجتنبوه لعلکم تفلحون (البائدة: ۹۰) (بے شک شراب، جوا، اور جو پانسے کے تیر لگائے جاتے ہیں وہ سب شیطانی عمل ہیں، اس سے بچو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ)

## شراب کی حرمت:

بس! کیا تھا! بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت موجود ہے: میں اپنے سوتیلے والد ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں ان کے دوستوں کی مجلس میں تھا، اور شراب پی جا رہی تھی

- وہ چھوٹے بچے تھے اور ایسے موقعوں پر چھوٹے بچوں سے ہی خدمت لی جاتی ہے۔ تو میں ان کو شراب پلا رہا تھا، اچانک باہر اعلان ہوا: **أَلَا إِنَّ الْخَمْرَ قَدْ حَرَّمَ** شراب حرام کر دی گئی، اس سے بچو! تو ان لوگوں نے کہا کہ دیکھو! کیا اعلان ہو رہا ہے؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں باہر گیا اور سنا، اُس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر تو تھے نہیں، اعلان کرنے والے محلوں میں جا کر زبانی اعلان کرتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے جا کر کہا: شراب حرام کر دی گئی ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ جن کے ہاتھ میں جام تھا وہ ہاتھ میں ہی رہا، جنہوں نے اپنے ہونٹ تک لگایا تھا اندر نہیں گیا، سب نے باہر پھینک دیا۔ اور جن مشکوں میں شراب تھی وہ سارے توڑ دیے گئے۔ مدینہ کی گلیوں میں شراب بہنے لگی۔<sup>(۱)</sup>

## کوئی آپ کو دیکھ رہا ہے:

وہاں کون نگرانی کرنے والا تھا؟ کون سی پولیس تھی؟ اور کون سی ایجنسیاں تھیں؟ جو نگرانی کر رہی ہوں؟ کوئی نہیں، بس! خدا کا خوف دل میں ہے۔ واما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى فان الجنة هي المأوى (التَّوْبَةُ: ۴۰) قرآن نے اصول بتلا دیا۔ اللہ تعالیٰ کے قانون پر عمل کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ اللہ کا ڈرا اپنے دل میں بٹھالیا جائے۔ سوچا جائے کہ وہ دیکھتا ہے، میں اس کی نگاہوں کے سامنے ہوں، میں جو کچھ کر رہا ہوں اسے وہ دیکھ رہا ہے، اس کے علم میں ہے، اور کل کو مجھے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے اعمال کا جواب دینا ہے، اس جواب دہی کے تصور سے جو ڈرا، اور

(۱) آخر جہ البخاری برقم: ۲۳۳۲ و مسلم برقم: ۱۹۸۰۔

اس نے اپنے نفس کو خواہشات سے روکا تو اس کا ٹھکانا جنت ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے کوئی پولیس نہیں تھی، کوئی کہنے والا نہیں تھا؛ لیکن سب عمل کرتے تھے۔

زنا، پرانی عورتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنا یہ بھی اُس زمانے میں بہت عام تھا، ایک صحابی تھے، ان کا اسلام لانے سے پہلے ایک عورت سے تعلق تھا، اور اس کے ساتھ محبت کے بعد جنسی تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے۔ جب اسلام لائے اور ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ پہنچ گئے، ایک مرتبہ جب مدینہ سے مکہ آئے، تو وہ عورت جس کے ساتھ محبت کا تعلق تھا، جنسی تعلقات قائم تھے وہ ملی، اور اس نے ان کو اپنے پاس آنے کی آواز دی، انہوں نے کہا کہ اب تو میرے اور تیرے درمیان اسلام حائل ہو چکا ہے، میں نہیں آسکتا۔ اس عورت نے اپنی محبت کا واسطہ دیا کہ میں نے تو اپنے آپ کو تیرے لیے قربان کر دیا اور تو ایسا جواب دے رہا ہے!!! اور میں تو تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب اس نے اتنی ساری باتیں کہیں، تو ان صحابی نے کہا کہ ٹھیک ہے، میں نبی کریم ﷺ سے پوچھوں گا، اگر میرے ساتھ تیرا نکاح ہو سکتا ہے تو کروں گا، ورنہ نہیں، کیوں کہ وہ غیر مسلم تھی، تیرے غیر مسلم ہوتے ہوئے اگر تجھ سے نکاح درست ہو سکتا ہے، تو ٹھیک ہے۔ زنا کا تو سوال ہی نہیں، چناں چہ جب مدینہ پہنچے تو حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سب سنایا اور سوال کیا۔ حضور ﷺ خاموش رہے، یہاں تک کہ وحی آئی: الزَّانِي لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ وَحُرْمَةُ ذَلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ. (النور: ۴) (زانی مرد نکاح کرتا ہے تو تو زنا کار یا مشرک عورت ہی سے نکاح کرتا ہے، اور زنا کار عورت سے نکاح کرتا ہے تو وہی مرد جو خود زانی ہو یا مشرک ہو، اور یہ بات مؤمنوں کے لیے حرام کر دی گئی ہے)

نبی کریم ﷺ نے وہ آیت سنائی تو انہوں نے فوراً اس عورت سے کہہ دیا کہ میں تجھ سے نکاح نہیں کر سکتا۔ فوراً چھوڑ دیا، ذرہ برابر بھی پس و پیش نہیں کیا۔<sup>(۱)</sup>

## مجھے پاک کیجیے.....!!!

کسی سے کوئی قصور ہوتا تھا تو جب تک اس سے توبہ کر کے اپنے آپ کو پاک صاف نہ کر لیتا وہاں تک چین نہیں آتا تھا۔ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ اللہ کے رسول! مجھ سے زنا ہو گیا ہے، آپ مجھے پاک کیجیے۔ آپ ﷺ نے منہ پھیر لیا، وہ عورت دوسری طرف آئی اور پھر یہ کہا، آپ ﷺ نے پھر دوسری طرف منہ پھیر لیا، تیسری طرف آئی، پھر آپ ﷺ نے منہ پھیر لیا۔ جب چار مرتبہ ہوا تو پھر نبی کریم ﷺ نے کہا: دیکھو! یہ کیا کہہ رہی ہے؟ پھر اس عورت نے کہا کہ حضور! مجھے تو اس زنا سے حمل تک ٹھہر چکا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: جب تک یہ بچہ تیرے پیٹ میں ہے، تب تک زنا کی سزا تجھ پر جاری نہیں ہوگی۔ کیوں کہ وہ شادی شدہ عورت تھی، اس کو پتھر مار کر رجم کر دیا جانا چاہیے؛ مگر اس بچے کا تو کوئی قصور نہیں ہے، بھلے وہ زنا سے بنا ہے؛ لیکن بہر حال وہ تو معصوم اور بے گناہ ہے، اس لیے جب تک وہ تیرے پیٹ میں ہے اُس وقت تک تجھ پر حد جاری نہیں ہو سکتی۔ اور پیدا ہونے کے بعد بھی جب تک اس کو تیرے دودھ کی ضرورت ہے تب تک تیرے اوپر حد جاری نہیں ہوگی۔ چنانچہ وہ گئی، اور پھر اس کو بچہ پیدا ہوا، پیدا ہونے کے بعد اس کو دودھ بھی پلایا، دو سال دودھ پلانے کے بعد جب کھانا شروع کر دیا تو وہ اس بچے

(۱) آخر جہ الترمذی برقم: ۳۱۷۷ (ط: مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر) وأبو داود برقم: ۲۰۵۱

(ط: المكتبة العصرية، بيروت) والحاكم في المستدرک برقم: ۲۷۰۱ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا اس حال میں وہ لے کر آئی اور کہا: اللہ کے رسول! یہ ہے وہ بچہ! اب تو اس کو میری ضرورت نہیں رہی۔<sup>(۱)</sup>

دیکھیے! اس عورت کے اقرار کرنے کو کتنی مدت ہو گئی، تین سال گزر گئے، کوئی F.I.R. درج نہیں کرائی تھی، رجسٹر میں نام نہیں لکھا گیا تھا، تین سال کے بعد خود آئی، وقتی جوش میں کچھ کیا ہوتا تو تین سال میں اس جوش کا اثر بھی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے؛ لیکن، نہیں، مجھے پاک کرو۔ چنانچہ وہ بچہ جب اس لائق ہو گیا کہ اس کو ماں کی ضرورت نہیں رہی تو نبی کریم ﷺ نے اس پر حد جاری کی، پتھر لگوائے، اور جب اسی حد اور سزا میں اس کا انتقال ہوا تو نبی کریم ﷺ نے اس کے جنازے کی نماز پڑھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اس نے زنا کیا تھا اور آپ نے اس کی؛ جنازے کی نماز پڑھی؟ حضور ﷺ نے فرمایا: اس نے ایسی توبہ کی کہ اگر مدینہ والوں پر اس کو تقسیم کیا جائے تو سب کی مغفرت ہو جائے۔

یہ جذبہ کہ مجھے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے۔ ایاک نعبد اللہ تعالیٰ ہی کی بات ہمیں ماننی ہے، اللہ رب العزت ہی کے حکم پر چلنا ہے، روز حساب کو ہونے والے معاملے سے نمٹنے کا یہی ایک علاج ہے، جب تک یہ دھیان اپنے اندر پیدا نہیں کریں گے وہاں تک یہ چیز آسان نہیں ہو سکتی۔

## ایک المیہ، کثرتِ معاصی:

دورِ حاضر میں ہم لوگوں کا سب سے بڑا المیہ اور سب سے بڑا پرالیم یہی ہے کہ ہم لوگوں نے آخرت کو بھلا دیا، آخرت کا تصور ہمارے دماغوں سے نکل گیا، جس کا نتیجہ یہ ہے

(۱) آخر جہ مسلم برقم: ۱۶۹۵ (ط: دار إحياء التراث العربی)



کہ ہم گناہوں پر جری ہیں۔ دور صحابہ میں بچہ بھی کسی گناہ کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ آج آخرت کا تصور دماغ سے نکل جانے کی وجہ سے گناہوں کی کثرت ہو رہی ہے۔ اس کا یہی ایک علاج ہے کہ اس آخرت کے عقیدے کو پختگی سے دل میں جمایا جائے۔ اسی کو اس سورت کی ان تین آیتوں میں بیان کیا گیا۔ اور آگے یہ بتلایا گیا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کا حساب لیں گے۔

## یقین محکم عمل پیہم:

حقیقت یہی ہے کہ اس تصور کو اپنے دل و دماغ میں جمانے کی ضرورت ہے کہ ایاک نعبد اے اللہ! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں، تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تجھ ہی کو واجب الاطاعت سمجھتے ہیں، ہماری نگاہوں میں تیرے حکم کے مقابلے میں کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کوئی ہمیں کچھ بھی کہے تیرے حکم کے مقابلے میں کسی کی کوئی بات نہیں مانیں گے۔ نفس کہے، بیوی کہے، باپ کہے، دوست کہے، حاکم کہے، کوئی بھی کہے ہم تیرے حکم کے سامنے کسی کی بات نہیں مانیں گے۔

## ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں:

یہ اتنا آسان کیسے ہو جائے گا؟ تو آگے فرمایا: وایاک نستعین ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے میں ہمارے لیے جو رکاوٹیں ہوتی ہیں تو ان رکاوٹوں کا بھی علاج ہے۔ لوگ آج کہتے ہیں: مولانا صاحب! اس زمانے میں تو شریعت پر عمل کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ شریعت پر عمل کرنا مشکل ہو گیا تو کبھی تم نے اللہ سے مانگا؟ اللہ سے کہو: اے اللہ! تو نے مجھے یہ حکم دیا ہے اور اس وقت صورت حال یہ ہے، ماحول میرے

مخالف ہے اور ساری چیزیں میرے مخالف ہیں، تو میری مدد فرما۔ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنی چاہیے، وہی تو مدد کرے گا۔

ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفیؒ ایک عجیب بات بیان فرماتے تھے: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ بندے کو اپنے سامنے کھڑا کر کے پوچھیں گے: تو نے یہ گناہ کیوں کیے؟ تو بندہ جواب میں عرض کرے گا: باری تعالیٰ آپ نے مجھے ایسے زمانے میں پیدا کیا کہ گناہوں کا ہی دور دورہ تھا، گناہوں سے بچنا مشکل تھا۔ تو باری تعالیٰ اس کے جواب میں یوں فرمائیں گے: تم نے میری کتاب قرآن میں تو پڑھا تھا: ان الله على كل شئ قدير (البقرة: ۲۰۰) اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کیا تو نے کبھی مجھ سے یوں کہا کہ اے اللہ! اس گناہ سے میرے لیے بچنا مشکل ہے، تو میرے لیے آسانی پیدا کر دے، رکاوٹیں دور فرما دے۔ ہم نے تو اس کے لیے کبھی دعا بھی نہیں کی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں پختہ ارادہ کرنا ہے کہ ہم اللہ ہی کے احکام پر عمل کریں گے اور ہم سے جتنی کوشش ہو سکتی ہے اس کو تو آج سے ہی شروع کر دیں۔ اس میں ہماری طرف سے کمی نہ ہو، اور جو چیزیں ہمارے اختیار سے باہر ہیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

## دعاء

سبحانک اللہم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالیٰ جدک ولا إله غیرک  
اللہم لک الحمد کلہ ولک الشکر کلہ ولک الملک کلہ ولیدک الخیر کلہ وإلیک  
یرجع الأمر کلہ اللہم لا أحصى ثناءً علیک أنت کما أثنیت علی نفسک اللہم صل  
علی سیدنا و مولانا محمد و علی آل سیدنا و مولانا محمد کما تحب و ترضی بعدد

ماتحب وترضى.

ربنا ظلمنا أنفسنا وإن لم تغفر لنا وترحمنا لنكونن من الخاسرين.

ربنا اتناफी الدنيا حسنة وفى الآخرة حسنة وقنا عذاب النار.

اللهم وفقنا لما تحب وترضى من القول والعمل والفعل والنية والهدى.

اللهم اجعلنا هادين مهتدين غير ضالين ولا مضلين سلماً لأوليائك وحرماً لأعدائك

نحب بحبك من أحبك ونعادي بعداوتك من خالفك من خلقك.

اللهم أغننا بالعلم وزيتنا بالحلم وأكرمنا بالتقوى وجملنا بالعافية.

اللهم إن قلوبنا ونواصينا وجوارحنا بيدك لم تملكنها شيئاً.

اے اللہ! ہمارے دل، ہماری پیشانیاں، ہمارے اعضاء تیرے قبضہ اور اختیار

میں ہیں، تو نے ان میں سے کسی کا بھی ہم کو مالک نہیں بنایا، فإذا فعلت ذلک بنا، جب

تو نے یہ معاملہ کیا ہے، فکن أنت ولینا تو ہی ہمارا کارساز ہو جا، واهدنا إلى سواء السبیل،

اور اے اللہ! سیدھے راستے کی طرف ہماری رہنمائی فرما۔ اے اللہ! اپنے فضل کا معاملہ فرما

اپنے فضل کا معاملہ فرما۔

اے اللہ! تو نے ہم سے جس اطاعت اور فرماں برداری کا مطالبہ کیا ہے، تیری

توفیق کے بغیر، تیری مدد کے بغیر ہمارے لیے مشکل ہے، اے اللہ! تو ہماری مدد فرما، اور

ہمارے لیے تیری اس اطاعت اور فرماں برداری کو آسان فرما دے۔ نفس اور شیطان کی

غلامی سے، اے اللہ! ان کی دھوکے بازی سے ہمیں نجات عطا فرما۔ اپنے فضل کا معاملہ فرما۔

اے اللہ! ہمیں، ہمارے اہل و عیال اور تمام متعلقین، کو صحت، قوت و عافیت، سلامتی، دنیا

اور آخرت کی بھلائیوں سے مالا مال فرما۔ ہماری تمام ضرورتوں کی تو اپنے خزانہ غیب سے

کفالت فرما، ہمیں کسی کا محتاج اور دست نگر نہ بنا۔ اے اللہ! تیری طاعت ہر میدان میں، ہر شعبے میں ہمارے لیے آسان فرما دے۔ ہمارے لیے آسان فرما دے۔

اے اللہ! تیری ذاتِ عالی کا، تیری کبریائی اور تیری عظمت کا استحضار، ہر گھڑی، ہر لمحہ، دن میں، رات میں، خلوت میں، جلوت میں ہمارے دلوں میں ایسا بٹھا دے کہ ہمارے لیے تیرے احکام پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔ اپنے فضل کا معاملہ فرما۔ اپنے فضل کا معاملہ فرما۔

اے اللہ! تیری شانِ رحمت کا واسطہ دے کر تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو ہمیں اپنے فرماں برداروں میں شامل فرما دے، تیری اطاعت اور فرماں برداری ہمارے لیے آسان فرما دے۔ اپنے فضل کا معاملہ فرما۔

تیرے حبیب ﷺ نے جتنی خیر اور بھلائی تجھ سے مانگی، ہمیں اور پوری امت کو عطا فرما، اور جن شر و اور برائیوں سے پناہ چاہی ان سے ہماری اور پوری امت کی حفاظت فرما۔ اے اللہ! یہاں موجود تیرے تمام بندوں کی جائز اور نیک مرادیں پوری فرما۔

ربنا تقبل منا إنک أنت السميع العليم وتب علينا إنک أنت التواب الرحيم و  
صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و آلہ و أصحابہ أجمعین  
برحمتک یا أرحم الراحمین .

## سورہ فاتحہ

(۱/جمادی الآخرہ ۱۴۳۹ھ، مطابق ۱۷/فروری ۲۰۱۸ء شب یک شنبہ)

(قسط - ۴)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنُسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ  
بِاللّٰہِ شُرُوْرٍ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاَتِ اَعْمَالِنَا وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ شُرُوْرٍ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاَتِ اَعْمَالِنَا  
مَنْ یَّہْدِہٖ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُضِلّْہٗ فَلَا هَادِیَّ لَہٗ وَ نَشْہَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ حْدَہٗ  
لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْہَدُ اَنْ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہٗ اِلَیْ کَافَّةِ  
النَّاسِ بِشَیْرٍ اَوْ نَذِیْرٍ اَوْ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُنِیْرًا صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی  
اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَ بَارَکَ وَ سَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا . اَمَّا بَعْدُ .

الحمد لله رب العالمین ۝ الرحمن الرحیم ۝ ملک يوم الدين ۝ اياک نعبد و  
ایاک نستعین ۝ اهدنا الصراط المستقیم ۝ صراط الذین انعمت علیہم ۝ غیر  
المغضوب علیہم ولا الضالین ۝

گزشتہ سے پیوستہ:

سورہ فاتحہ کی چوتھی آیت چل رہی تھی۔

الحمد لله رب العالمین ۝ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا  
پروردگار ہے۔

الرحمن الرحیم ۝ جو سب پر مہربان اور بہت مہربان ہے۔

مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ ۝ جو روز جزاء کا مالک ہے۔

بات یہ چل رہی تھی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ روز جزاء کے مالک ہیں، وہاں ہم سے حساب لیں گے، دنیا کے تمام اعمال کے متعلق اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے باز پرس ہوگی فرائض و واجبات کی ادائیگی ہوئی تھی یا نہیں؟ جائز ناجائز کا لحاظ کیا تھا یا نہیں؟ محرمات سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کیا تھا یا نہیں؟ ہر چیز کے متعلق سوال ہوگا۔

تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ ان ساری چیزوں کے متعلق پوچھیں گے، تو اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کے اس مرحلے سے ہم کامیابی کے ساتھ کس طرح پار ہو سکیں گے؟ تو اس کا علاج بتلایا کہ ایاک نعبد و ایاک نستعین ۱ اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

## واجب الاطاعة کون.....؟؟؟

عبادت کا معنی: بندگی، غلامی۔ گویا اللہ تعالیٰ ہی کو واجب الاطاعة سمجھتے ہیں۔ اللہ کے مقابلہ میں کوئی دوسرا واجب الاطاعة نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کی اطاعت اور فرماں برداری کا حکم دیا ہے ان کی اطاعت بھی اس لیے کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ اگر وہ کسی ایسی بات کا حکم دیں جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو تو اس حکم میں ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ چوں کہ ان کی اطاعت اصالتاً نہیں کی جاتی؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے کی جاتی ہے، تو جس حکم میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو بھلا اس میں ان کی اطاعت کیسے کی جائے گی؟ واجب الاطاعة ذات صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق (۱) مخلوق کی ان باتوں میں اطاعت نہیں

(۱) انظر ما سلف من التخریج فی ص: ۵، الهامش: ۲.

کی جائے گی، جن میں اللہ کی نافرمانی لازم آتی ہو۔ اور إنما الطاعة في المعروف (۱) جن جن مخلوقات کی اطاعت اور فرماں برداری کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے (اولاد کو والدین کی، بیوی کو شوہر کی، رعایا کو اپنے حکمران اور حاکم کی) وہاں بھی یہ شرط رہے گی کہ جائز کاموں میں ہی ان کی بات کو مانا جائے گا، وہ اگر کسی ناجائز بات کا حکم دیتے ہیں تو اس میں ان کی اطاعت اور فرماں برداری نہیں ہوگی۔

ایاک نعبد تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تجھے ہی واجب الطاعة سمجھتے ہیں، ہم تیرے حکم کے مقابلہ میں کسی اور کا حکم نہیں مانیں گے۔ اگر ہم دل میں یہ بٹھالیں تو پھر دنیا میں ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق زندگی گزارنا آسان ہو جائے گا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیامت کے روز اللہ تبارک و تعالیٰ کو حساب کتاب دینا آسان ہو جائے گا۔

### لکل داء دواء:

وایاک نستعین (اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں)

اللہ تعالیٰ کی اطاعت ضروری ہے، اس میں اگر کچھ دشواریاں پیش آتی ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا کہ ان دشواریوں کو کیسے حل کیا جائے گا؟ ان کا حل یہ ہے کہ اللہ ہی سے مانگیں کہ اے اللہ! تو نے یہ حکم دیا ہے، تیرے اس حکم پر ہمیں عمل کرنا ہے؛ لیکن اس پر عمل کرنے کے معاملے میں ہمارے لیے رکاوٹیں اور دشواریاں ہیں، بیچ میں لوگوں کی طرف سے، دوستوں کی طرف سے، گھر والوں کی طرف سے، اولاد کی طرف سے، بیوی کی طرف سے، معاشرے اور کمیونٹی کی طرف سے روڑے ڈالے جا رہے ہیں،

(۱) انظر ما سلف من التخييع في ص: ۵، الهامش: ۳.

اب تو ہی ان رکاوٹوں کو دور فرما دے، اور ہمارے لیے تیری اطاعت آسان فرما دے۔ گویا اللہ کی اطاعت کی ادائیگی میں اگر ہمارے لیے کچھ دشواری پیش آتی ہے، تو اسی میں اس کا نسخہ اور علاج بتلا دیا کہ ہم اللہ ہی سے اس سلسلہ کی مدد مانگیں گے۔

آج ہم کہتے ہیں کہ مولانا! ہم کیسے شریعت پر عمل کریں گے؟ دیکھو نا! آج حالات کیسے ہیں؟ ان حالات میں ہم کیسے شریعت کے مطابق تجارت کر سکتے ہیں؟ ہم کیسے شریعت کے مطابق ملازمت کر سکتے ہیں؟ کیسے اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق گزار سکتے ہیں؟ ہمارے لیے قدم قدم پر مشکلات ہیں۔ ان مشکلات کا حل یہ ہے کہ تم اللہ ہی سے مدد مانگو: اے اللہ! ہمارے لیے تیری اطاعت اور فرماں برداری کو آسان کر دے۔

تم نے ہم سے کیوں نہیں کہا؟؟؟

اس سے قبل ڈاکٹر عبدالحی صاحب کا مقولہ نقل کیا تھا کہ: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ باز پرس کریں گے کہ: تم نے یہ گناہ کیوں کیے؟ میں نے یہ حکم دیا تھا، تم اس کو کیوں بجا نہیں لائے؟ تو اس وقت جواب میں ہم کہیں کہ باری تعالیٰ! بڑی دشواریاں تھیں، ہر چیز میری مخالف تھی، میرے لیے اس پر عمل کرنا مشکل تھا، میں بالکل مجبور تھا، مجبوری کی وجہ سے میں نے تیرے اس حکم کو توڑا ہے۔ تو وہاں اگر باری تعالیٰ کی طرف سے یہ پوچھ لیا گیا کہ: اگر یہ رکاوٹیں تھیں تو تم نے ہم سے کہا؟ ہم سے مانگا؟ ہم سے سوال کیا؟ تمہارا تو ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے، تو مجھے ہر چیز پر قدرت ہے اس کے تم قائل تھے، اس کو تم مانتے تھے، اس پر تمہارا یقین اور ایمان تھا، اس کے باوجود تم نے ہم سے کیوں نہیں کہا؟ ہم سے کہتے تو ہم تمہاری اس رکاوٹ کو دور کرتے!!! تو یہ ایک نسخہ ہے۔



## ایک محرب عمل:

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: کسی کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے معاملے میں کوئی بھی رکاوٹ آئی ہو، اگر وہ چالیس (۴۰) دن تک خالص دل سے اللہ کی طرف رجوع کرے اور مانگے تو اللہ تعالیٰ اس کے مسئلے کو حل کر دیتے ہیں، یہ ہے ایاک نعبد و ایاک نستعین ۱ اللہ کی اس اطاعت اور فرماں برداری کے معاملے میں اگر کچھ مشکلات درپیش ہیں تو اس کا حل یہ ہے کہ اللہ ہی سے مانگا جائے۔ گزشتہ ایک مطلب تو یہ بیان کیا تھا۔

## ہر چیز اللہ ہی سے مانگیے:

مدد کا ایک اور طریقہ بھی ہے، وہ یہ کہ ہم ہر چیز اللہ سے مانگیں۔ نبی کریم ﷺ نے ہمیں دعا کے طریقے بھی بتلائے کہ ہم اپنی حاجات اللہ تعالیٰ سے کیسے مانگیں؟ نبی کریم ﷺ نے تمام دعائیں ہم کو سکھلائی ہیں۔ ایسی عجیب و غریب دعائیں ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

آپ الحزب الاعظم کھول کر دیکھ لیں، ترجمہ پڑھیں گے تو حیرت ہوگی کہ نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے اللہ تعالیٰ نے کیسی کیسی دعائیں ہم کو سکھلائی ہیں۔ یہ دعائیں نبی ہی مانگ سکتا ہے، نبی کے علاوہ کسی کی زبان پر یہ دعائیں نہیں آسکتیں۔ گویا حضور ﷺ نے ہمیں دعا کا طریقہ بھی بتلایا کہ ہمیں اللہ سے ہر چیز کس طرح مانگنی ہے؟ یوں سمجھیے کہ یہ چھپے ہوئے سرکاری فارم ہیں، حکومت کی طرف سے جب کسی چیز میں مدد کا اعلان کیا جاتا ہے، جیسے کسانوں کی فلاں چیز کی مدد کی جائے گی، تو جو کسان مدد حاصل کرنا چاہتا ہے، تو حکومت اس کو چھپے ہوئے فارم دیتی ہے کہ یہ فارم بھر لو، اس میں سب کچھ لکھا ہوا ہے، گویا یہ

درخواست اس کو اپنی طرف سے کرنی نہیں پڑتی ہے؛ بلکہ حکومت نے اس درخواست کا مضمون بھی چھاپ کر دے دیا ہے، آپ کو اس میں صرف خالی جگہوں کو پُر کرنا ہے۔ تو ہمیں جو چیز اللہ تعالیٰ سے مانگی ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کا مضمون نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے بتلادیا۔

## دعائیں، چھپے ہوئے فارم:

دعائیں چھپے ہوئے فارم کی مانند ہیں، ہمیں تو صرف انہیں پُر کر کے اللہ کے ہاں جمع کرانا ہے۔ تو اللہ کی بارگاہ میں ہمیں ان ہی الفاظ میں دعائیں کرنی ہیں۔ ایسے عجیب و غریب الفاظ اور ایسے انداز سے نبی کریم ﷺ نے اللہ سے مانگا ہے کہ کوئی انسان اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ ان دعاؤں کو دیکھ کر ان کے زبان نبوت سے صادر ہونے کا پختہ یقین ہوتا ہے اس لیے کہ دوسرا کوئی ایسی دعا نہیں کر سکتا۔ گویا اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے حضور اکرم ﷺ کے قلب مبارک پر ان دعاؤں کا الہام اور القا ہوا، اور آپ ﷺ نے اللہ ہی کے بتلانے سے ان دعاؤں کو اپنے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا۔ تو یہ گویا چھپے ہوئے فارم ہیں، سو ان ہی الفاظ میں دعا مانگ کر فارم جمع کروادینے ہیں۔

## تعلق مع اللہ کا بہترین ذریعہ، دعا:

ہر چیز اللہ سے مانگے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ صوفیا کے ہاں تعلق مع اللہ کے لیے مستقل بڑے مجاہدے اور ریاضتیں کروائی جاتی ہیں، اللہ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کا یہ ایک آسان طریقہ ہے کہ ہر چیز اللہ سے مانگو۔ دل ہی دل میں اللہ سے باتیں کرتے رہو۔ اے اللہ! بجلی چلی گئی، گرمی لگ رہی ہے، مجھے ذرا راحت

پہنچا دے۔ ہر چیز دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتے کرتے مانگیں۔

یہ وہ چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کے تعلق کو قائم کرتی ہے، اس تعلق کو باقی رکھتی ہے، اور اس تعلق کو بڑھاتی ہے۔ تعلق مع اللہ کو قائم کرنا، باقی رکھنا، اور بڑھانا یہ تینوں اس (دل ہی دل میں اللہ سے مانگنے) سے ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ہر چیز میں اور ہر موقع پر دعا کے طریقے بتلائے ہیں، ایسی دعائیں کہ زندگی میں ایک دعا بھی قبول ہوگئی تو ہمارا بیڑا پار ہو گیا۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت کی دعا سکھلائی: بسم اللہ والصلاة والسلام على رسول اللہ، یہ درود شریف مع تسمیہ، پھر اللہم افتح لی أبواب رحمتک۔<sup>(۱)</sup> (اے اللہ! اپنی رحمت کے دروازے میرے لیے کھول دے) کسی کی پوری زندگی میں یہ ایک دعا ہی قبول ہو جائے تو بیڑا پار ہے، سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ ایسی ایسی دعائیں سکھلائیں کہ ایک دعا ہی اس کے زندگی بھر کے معاملے کو درست کرنے کے لیے کافی ہو جائے گی۔ گویا اللہ تعالیٰ اس آیت کے ذریعہ ہمیں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ہم سے مانگو ہمارے بھکاری بن جاؤ، ہر چیز ہم سے مانگو۔

حدیث شریف میں وارد ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر جوتے کا تسمہ (چپل کی پٹی) ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ سے مانگیں۔<sup>(۲)</sup> ایک آدمی سوچ سکتا ہے کہ چپل کی پٹی ٹوٹی اس میں اللہ سے مانگنا ہے؟ لیکن حضور ﷺ ہمیں یہی بتلا رہے ہیں کہ تمہاری ہر چیز اللہ تعالیٰ

(۱) أخرجه النسائي في الكبرى، رقم: ۹۸۳۸ (ط: مؤسسة الرسالة) وفي عمل اليوم والليلة، رقم: ۹۰

(ط: مؤسسة الرسالة) و البخاری فی التاريخ الكبير ۱ / ۱۵۹ (ط: دائرة المعارف العثمانية،

حیدرآباد، دکن) وغیرہم (نوٹ: یہ وہ مصادر ہیں جن میں صلوٰۃ و دعا ایک ساتھ وارد ہے)

(۲) أخرجه أبو يعلى في مسنده، رقم: ۴۵۶۰ (ط: دار المأمون للتراث، دمشق) وغیرہ.

ہی سے مانگو، اللہ ہی کی طرف رجوع کرو۔ چھوٹے سے چھوٹی چیز کو بھی معمولی مت سمجھو، اصل تو ہمارا مانگنا ہے، کس سے مانگ رہے ہیں؟ ہمارے مانگنے کا تعلق اللہ سے ہو۔ اللہ کے علاوہ ہم کسی کے سامنے بھی اپنی مانگ پیش نہ کریں۔ اگر ایسا مزاج بن جائے کہ ہر چھوٹی بڑی حاجت اللہ سے مانگیں تو پھر دیکھو! اللہ کے ساتھ کیسا تعلق پیدا ہوتا ہے!!!

## ہم خرما و ہم ثواب:

آدمی کی دعا کی کیفیت یہ ہونی چاہیے کہ اس کا دل مکمل اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا: الدعاء مخ العبادۃ۔<sup>(۱)</sup> (دعا عبادت کا مغز ہے) عبادت کی روح ہے۔ یعنی ایک عبادت میں جو توجہ مقصود ہوتی ہے وہی توجہ اور کیفیت دعا میں بھی مطلوب ہے۔ اور دعا خود مستقل عبادت ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں: إن الدعاء هو العبادۃ۔<sup>(۲)</sup> (دعا عبادت ہے) باری تعالیٰ حکم فرماتے ہیں: ادعونی استجب لکم۔ (الغافر: ۶۰) (تم مجھ سے مانگو، میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا) آگے فرماتے ہیں: ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جہنم دخرین۔ (الغافر: ۶۰) (جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں۔ یعنی دعا مانگنے سے اترتے ہیں۔ وہ جہنم میں داخل ہوں گے) دعا یعنی ہم اپنی حاجتیں اللہ سے مانگ رہے ہیں، اور اس کو اللہ تعالیٰ عبادت کا نام دے رہے ہیں۔ ہم خرما و ہم ثواب جیسا معاملہ ہے، کھجور بھی کھاؤ اور ثواب بھی ملے۔ تو ہم اپنی حاجتیں اللہ سے مانگ رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی ہو رہی ہے۔

(۱) أخرجه الترمذی برقم: ۳۳۷۱ (ط: مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر) وغیرہ۔

(۲) أخرجه الترمذی برقم: ۳۳۷۲ (ط: مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر) وغیرہ۔

## ایک غلط فہمی:

بعض لوگ دعایہ سوچ کر نہیں مانگتے کہ جتنا وقت دعا میں صرف ہوگا، اتنی دیر میں دو رکعت نماز پڑھ لوں، قرآن کا ایک رکوع پڑھ لوں، تسبیح پڑھ لوں، گویا وہ لوگ دعا کو عبادت نہیں سمجھ رہے ہیں، یہ غلط فہمی ہو رہی ہے، دعا خود عبادت ہے۔ دعا بھی عبادت کا ایک طریقہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ہم کو بتلایا ہے، اس لیے کہ دعا کے ذریعہ بندہ کا اللہ تعالیٰ سے ایک تعلق قائم ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ سے مانگتا رہے گا، مانگتا رہے گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ چوبیس گھنٹے اس کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا۔ یہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو پیدا کرنے والی چیز ہے ایّاک نستعین۔

## کوئی دھندلا ہے یا نہیں.....؟؟؟

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: من لم یسأل اللہ یغضب علیہ۔<sup>(۱)</sup> (جو آدمی اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس سے ناراض ہوتے ہیں) دنیا میں کوئی بڑے سے بڑا داتا ہو، بڑے سے بڑا سخی ہو، آپ دیکھیں گے کسی نے اس کے پاس مانگا، اس نے دیا۔ دوسری مرتبہ مانگا تو پھر دیا، تیسری مرتبہ مانگا، پھر دیا۔ چوتھی مرتبہ مانگا، تب بھی دیا، پانچ چھ مرتبہ دے گا، اس کے بعد اگر مانگے گا تو وہ کیا کہے گا؟ ”ارے! تو تو میرے پیچھے ہی پڑ گیا ہے، کوئی دھندھا ہے یا نہیں؟“ یعنی بڑے سے بڑا دینے والا، اور بڑے سے بڑا داتا، اور بڑے سے بڑا سخی بھی ہوگا تب بھی اس کی زبان پر یہ الفاظ آئیں گے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے کہ آپ دن میں سو مرتبہ بھی مانگیں گے، تب بھی اللہ آپ سے راضی اور خوش ہوں گے، آپ کو

(۱) آخر جہ الترمذی برقم: ۳۳۷۳ (ط: مصطفیٰ البابی الحلبي، مصر) وغیرہ۔

اللہ کا قرب حاصل ہوگا۔ کیوں کہ مانگنا خود اللہ نے عبادت قرار دیا ہے۔

## ہم تو مائل بہ کرم ہیں:

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں: واذا سألک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوة الداع اذا دعان. (البقرة: ۱۸۶) (اے نبی! جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں، تو میں قریب ہوں) اس آیت کا انداز بھی عجیب ہے! کہ دوسری جگہوں پر تو انداز یہ ہے یسألونک، قل اے نبی! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں، آپ ان سے کہیے۔ لیکن یہاں سیدھا ہی ہے کہ واذا سألک عبادی عنی اے نبی! جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں، اب براہ راست اللہ آگئے: فانی قریب، میں قریب ہوں۔ اجیب دعوة الداع اذا دعان دعا کرنے والا جب مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا کو قبول کرتا ہوں۔ آپ اس کو یوں کہہ دیجیے، یہ آیا ہی نہیں، سیدھا اللہ تعالیٰ نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا، یہ دعا کا عجیب انداز ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے ایّاک نستعین۔ اے اللہ! ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ دعا کی خاصیت یہ ہے کہ آدمی کتنا ہی پریشان ہو، دکھی اور درد مند ہو، ایسی حالت میں اگر سچے دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر مانگے گا، تو طبیعت میں ایک سکون کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ وہ ساری بے چینی دور ہو جائے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دل پر کسی نے مرہم رکھ دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ جیسا داتا ہمیں ملا ہے اور جو خود ہمیں حکم دیتا ہے کہ مجھ سے مانگو، نہیں مانگو گے تو اللہ ناراض ہوں گے، قرآن اور حدیث کہتے ہیں۔ اور مانگنے پر اللہ تعالیٰ

خوش ہوتے ہیں اور اس کے باوجود بھی ہم نہ مانگیں، تو یہ ہماری ہی کوتاہی ہے۔ اور پھر مانگنے کا یہ سلسلہ جتنا ہم بڑھائیں گے اتنا ہی ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ہوگا، گویا اللہ کے ساتھ تعلق کو قائم کرنے کی بہت سی شکلیں ہیں، بہت سے طریقے ہیں، اس کے لیے مستقلاً مجاہدے کیے جاتے ہیں، لوگ عبادتیں کرتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، رات بھر نماز پڑھتے ہیں، دن بھر روزے رکھتے ہیں اور بھی شکلیں اختیار کی جاتی ہیں، اور یہاں دعا کے ذریعہ بندے نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی عجیب مہربانی ہے، اس کی رحمت ہے کہ دعا کے ذریعہ بندے کو اپنے قریب کر دیتا ہے۔

### اللہ کے بھکاری بن جاؤ:

چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ اس ایاک نستعین میں ہمیں یہ بھی بتلایا گیا کہ تم اللہ کے در کے بھکاری بن جاؤ، سب کچھ اللہ سے مانگو، بعض لوگ کہتے ہیں: ہمارے پاس تو بھیک کا پیالہ بھی نہیں ہے، تو حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ بھیک کا پیالہ بھی اللہ سے مانگو ہر چیز اللہ سے مانگو۔ جب نبی کریم ﷺ یہ فرما رہے ہیں کہ جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ سے مانگو، اس کے بعد کیا باقی رہ جاتا ہے؟

تو یہ ایاک نعبد و ایاک نستعین اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ایسا عجیب و غریب نسخہ بتلایا ہے کہ اس کے ذریعہ بندے کا تعلق اللہ کی ذات سے ایسا قائم ہو جاتا ہے کہ اس کے نتیجے میں ایک تو عبدیت کا تعلق قائم ہوا، اور ساتھ ہی ساتھ ساری حاجتیں بھی پوری ہو گئیں۔ ہر وقت، دل ہی دل میں، زبان سے بولے بغیر دل سے بھی مانگا جاتا ہے۔ یعنی آدمی دل سے اللہ کی طرف متوجہ رہے، اور دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے سوال کرے کہ اللہ! ایسا کر

دے، اللہ! ایسا کر دے۔ کسی کام کے لیے کہیں جا رہے ہیں، گھر سے نکلیں تو دل ہی میں اللہ سے عرض کریں: اے اللہ! کوئی سواری مل جائے، سواری مل گئی، اے اللہ! میں عافیت کے ساتھ منزل پر پہنچ جاؤں، منزل پر پہنچ گئے، اے اللہ! میں جس کام کے لیے آیا ہوں عافیت کے ساتھ میرا وہ کام ہو جائے۔

## کیسا داتا!! کیسا سخی!!

دعا مانگنے کے ساتھ ساتھ ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا کریں، سواری کے لیے دعا بھی مانگے، اور جہاں سواری ملی، تو الحمد للہ کہے۔ ہمارا حال کیا ہے؟ دعا تو مانگتے ہیں؛ لیکن دعا مانگنے کے بعد جہاں وہ کام ہو گیا تو جیسے اللہ کو جانتے ہی نہیں! دوسری حاجت مانگنے میں لگ جاتے ہیں۔ وہ حاجت جو اللہ نے پوری کی اس پر اللہ کا کچھ شکریہ؟ دنیا میں تو انسان کسی کو کوئی چیز دیتا ہے، تو آدمی فوراً اس کا شکریہ ادا کرتا ہے، اور اللہ کا شکریہ ادا کرنے کا دھیان ہی نہیں!!! باری تعالیٰ فرماتے ہیں: لئن شکرتمہ لازیدنکمہ۔ (ابراہیم: ۷) (اگر تم شکر گزاری کرو گے تو میری نعمتوں میں اضافہ کروں گا) لیکن ہمارا مزاج ایسا بنا ہوا ہے کہ ہم اپنی حاجتوں کے معاملے میں اتنے خود غرض بنے ہوئے ہیں کہ جو حاجت ہم نے مانگی، اللہ نے پوری کی، پھر بھی اس کا شکر ادا کیے بغیر دوسری حاجت مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اللہ بھی کتنا کریم! کیسا داتا، کیسا سخی!! کہ اس کی پہلی نعمت کا شکریہ ادا نہیں کیا تو بھی دیتا ہے۔

انسان ایسا کرے گا؟ کسی انسان کے پاس کوئی چیز مانگی، اس کا ابھی شکریہ ادا نہیں کیا اور دوسری چیز مانگی تو کیا کہے گا؟ وہ پہلے والی کا تو ابھی ٹھکانہ نہیں؟ لیکن اللہ تعالیٰ ہے کہ بیسیوں چیزیں آپ نے مانگی کسی کا شکریہ ادا نہیں کیا، تو بھی مانگتے جاؤ، لیتے جاؤ، مانگتے جاؤ،



لیتے جاؤ۔ وہاں کوئی گرفت ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ دینے بیٹھے ہیں، وہ تو چاہتے ہیں کہ تم مانگو لیکن ساتھ میں اگر شکریہ بھی ادا کریں گے، تو اللہ کی نعمت کا حق بھی ادا ہوگا، اور ساتھ ہی ساتھ اللہ راضی بھی ہوں گے، اور اللہ کی طرف سے نعمت میں اضافہ ہوگا۔

ایک نستعین تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک ایسا نسخہ بتلایا ہے کہ اس کے ذریعہ سے بندہ اپنا تعلق اللہ کی ذات کے ساتھ قائم کر سکتا ہے۔ بس مانگو۔ کسی کو واسطہ بنانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کے کسی نیک بندے سے دعا کی درخواست کی، کوئی حرج نہیں؛ لیکن خود اللہ کے ساتھ اپنا رشتہ ایسا قائم کرو اور اتنا مانگو کہ بس! اللہ ہی سے مانگنے میں لگے رہو، جتنا اللہ پر یقین بڑھے گا، اللہ دیتا رہے گا۔

## حضرت اقدس ہتھانوی کا ایک معمول:

حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں: ”کوئی آدمی میرے پاس آتا ہے تو وہ اپنی بات کہے اس سے پہلے بلا تحلف فوراً میرا دل اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، اور میں اللہ سے دعا کرتا ہوں: اے اللہ! تیرا یہ بندہ یہاں آیا ہے، تو نے بھیجا ہے، جس کام کے لیے بھیجا ہو تو اُس کا کام میرے ذریعہ سے اچھا کرادے، کسی مشورے کے لیے آیا ہے تو میں اس کو صحیح مشورہ دوں، دعا کے لیے آیا ہے تو میں دعا دوں، یعنی وہ اپنی حاجت پیش کرے، بتائے اس سے پہلے دل اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا۔“ جب ہم اللہ کے ساتھ ایسا معاملہ کریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے کام بھی بن جائیں گے۔

## عبادت صرف اللہ کی:

اور ایاک نعبد و ایاک نستعین میں تیسرا پہلو یہ ہے کہ اے اللہ! تیری ہی عبادت

کرتے ہیں، یعنی جن اعمال و افعال کا تعلق عبادت سے ہے وہ اللہ کے ساتھ خاص ہیں، مثلاً سجدہ، یہ عبادت کا ایک عمل ہے، وہ اللہ ہی کو کیا جائے گا، رکوع اللہ ہی کو کیا جائے گا، وہ قیام جس میں عبادت مقصود ہو، ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا وہ اللہ ہی کو کیا جائے گا۔ گویا عبادات کے جتنے بھی طریقے ہیں، اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے نہیں ہوں گے۔ ہم نے کہہ دیا اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، کوئی معبود نہیں، جتنی بھی عبادت کی شکلیں ہیں، وہ اللہ ہی کے لیے کی جائیں گی، اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے نہیں کی جائیں گی۔ سجدہ اللہ ہی کو کیا جائے گا۔

### براہِ راست:

جو لوگ بزرگوں کے مزارات پر جا کر سجدہ کرتے ہیں، بعض لوگ تو اس کی یوں تاویل کرتے ہیں کہ ہم تو ان کو اللہ تک پہنچنے کا واسطہ بناتے ہیں، یہ تو وہی بات ہے جو مشرکین کہا کرتے تھے، مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُونَا اِلَى اللّٰهِ زَلْفٰی (الزمر: ۲۴) (ہم ان بتوں کی عبادت اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ سے قریب کریں) یہی دلیل وہ بتوں کی عبادت کے لیے دیتے تھے۔ آج یہی دلیل اولیا کے مزارات پر سجدہ کرنے والے، سجدہ کرنے پر دیتے ہیں۔ سجدہ تو اللہ کے ساتھ خاص ہے، اللہ کے علاوہ کسی اور کو سجدہ نہیں کیا جائے گا۔ عبادت کی جتنی بھی شکلیں ہیں، جن جن اعمال و افعال کے ذریعہ عبادت انجام دی جاتی ہے، وہ اللہ کے ساتھ خاص ہیں۔

### تیری ہی عبادت، اور تجھ ہی سے مدد:

یہاں ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں، اور دنیا میں ہم بہت

سارے کاموں کے لیے دوسروں کی مدد حاصل کرتے ہیں۔ بیمار ہوئے، ڈاکٹر کی مدد حاصل کی، مکان بنانا ہے، مستری کی مدد حاصل کی۔ تو یہ اسباب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو دار الاسباب بنایا ہے، تو بحیثیت اسباب کے ان اسباب کو اختیار کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، اس کی اجازت دی ہے؛ لیکن ان اسباب کے اندر بھی ہماری نظر اللہ پر ہو کہ اصل ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والی ذات اللہ کی ہے۔ اثر ان اسباب میں نہیں ہے۔

## اثر کروں یا نہ کروں؟

ایک بہت بڑے ڈاکٹر جن کی زندگی اسی ڈاکٹری کے پیشے میں گزری، بڑے ماہر تھے، ان کا مطب بھی بڑا آباد رہتا تھا، اور اس لائن کی کئی تنظیموں کے وہ ذمہ دار تھے، وہ کہتے ہیں: میری پوری زندگی کا تجربہ یہ ہے کہ جب ہم دوا کسی کے لیے دیتے ہیں، تو دوا جب اس کے پیٹ میں جاتی ہے، تو وہ اللہ سے پوچھتی ہے کہ میں اپنا اثر کروں یا نہ کروں؟ وہاں سے اجازت ملتی ہے تو وہ اپنا اثر دکھاتی ہے ورنہ نہیں۔ مزید وہ کہتے ہیں: ہم نے دیکھا کہ ایک دوا، ایک بیماری کے لیے، ایک بیمار کو دی، اس کو اثر کیا۔ اور وہی دوا، اسی بیماری کے لیے، دوسرے کو لکھ دی، تو فائدہ نہیں ہوا۔ معلوم ہوا دوا میں کچھ نہیں ہے۔ فائدہ کس میں ہے؟ اللہ کے حکم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ جس میں تاثیر ڈال دیتے ہیں، اور اللہ چاہتے ہیں تو فائدہ ہوتا ہے۔ تو ہماری نگاہ اسی پر ہو۔ اسباب پر نگاہ نہ ہو۔

## نظر اللہ پر ہو:

آپ نے دکان کھولی اور سامان لا کر انڈر ڈال دیا، تو گا ہک کون بھیجے گا؟ خریدنے والے تو اللہ ہی بھیجے گا نا؟ آپ سب کچھ لا کر کے بیٹھ گئے؛ لیکن تاکتے رہو! ہم نے ایسی

دکانیں دیکھی ہیں۔ دودکانیں ایک جیسی ہیں، دونوں مال بھی ایک ہی کمپنی کا رکھتے ہیں؛ لیکن ایک کی دکان خوب چل رہی ہے، اور دوسرا بیٹھ کر کے تنکٹا رہتا ہے۔ اس ایک آدمی کی دکان پر خریدنے کے لیے گاہکوں کے دل میں جو بات ڈالی، وہ کس نے ڈالی؟ گاہک اللہ بھیجے گا۔ ہم کچھ بھی کر لیں! جب تک اللہ گاہک نہیں بھیجیں گے ہماری تجارت کیسے چلنے والی ہے؟ اس لیے کوئی بھی سبب اختیار کیا جائے تو ہمارا اس پر ایمان ہونا چاہیے، یقین ہونا چاہیے کہ اس سبب میں اثر ڈالنے والی ذات بھی اللہ کی ہے۔

کھانا کھایا تو کھانے میں تاثیر اللہ تعالیٰ ڈالیں گے تو بھوک مٹے گی، ورنہ بہت سوں کو جوع البقر کی بیماری ہو جاتی ہے، کھانا کھاتے ہیں؛ لیکن بھوک نہیں مٹتی، پانی پیتے ہیں؛ لیکن پیاس نہیں بجھتی۔ یہ کیا ہے؟ معلوم ہوا کھانا بھوک نہیں مٹاتا، پانی پیاس نہیں بجھاتا؛ بلکہ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ جو کچھ ہے اللہ کے حکم سے۔ اللہ ہی سے مدد مانگو۔ اسباب اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ نگاہ ہماری اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونی چاہیے۔

## بعض کافر بعض مؤمن:

بخاری شریف میں روایت ہے کہ حدیبیہ کے موقع پر ایک رات بارش ہوئی، فجر کی نماز کے بعد نبی کریم ﷺ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اس بارش کی وجہ سے بعض بندے میرے کافر بنے، اور بعض میرے مؤمن بنے۔ جنہوں نے یوں کہا کہ یہ بارش اللہ کی رحمت سے اتری، وہ گویا مجھ پر ایمان لائے۔ اور جو یوں کہتے ہیں یہ فلاں ستارے کی چال کی وجہ سے، فلاں نچھتر (۶۹:۶۸) کی وجہ سے یہ بارش برسی، انہوں نے میرے ساتھ کفر کیا۔<sup>(۱)</sup>

(۱) آخر جہ البخاری برقم: ۹۹۱۔

عرب ایسا کہا کرتے تھے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی خود اسباب کو مؤثر سمجھتا ہے تو یہ کفر ہے۔ ہاں! سبب کے طور پر ہو؛ لیکن سبب کے ساتھ یوں سمجھنا چاہیے کہ تاثیر ڈالنے والی ذات کون ہے؟ اللہ۔

علاج ڈاکٹروں سے کرانے کی بھی شریعت نے اسی شرط کے ساتھ اجازت دی کہ آپ یوں سمجھیں کہ اس علاج سے فائدہ کب ہوگا؟ جب اللہ چاہیں گے۔ آج یہ بات ذہن میں نہیں رہی۔ فقہ کی کتابوں میں بھی فقہانے یہ بات لکھی ہے کہ کسی طبیب سے علاج کراتے ہوئے اس خیال اور ارادے کے ساتھ علاج کرانا چاہیے کہ میں اس کی دوا استعمال کرتا ہوں؛ لیکن دوا میں شفا دینے والا اللہ ہے، دوا نہیں۔ آج کیا ہو گیا؟ مولانا صاحب! فلاں ڈاکٹر کے پاس جاؤنا! اچھا ہو جائے گا۔ لوگ ایسے انداز سے بولتے ہیں گویا اس ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا رکھی ہے، کہ تم جاؤ گے اور شفا ہو جائے گی۔ نہیں! شفا تو اللہ دیتا ہے۔ اس لیے میں تو کہتا ہوں: علاج کے معاملے میں بہت اونچا ڈاکٹر استعمال نہیں کرنا چاہیے، ذرا کم درجہ کا رکھنا چاہیے، تو نظر ڈاکٹر پر نہیں رہے گی؛ کس پر رہے گی؟ اللہ پر رہے گی۔ اونچے ڈاکٹر کو استعمال کرو گے تو اللہ سے نظر ہٹ کر کے ڈاکٹر کی طرف چلی جائے گی، تو جو مقصد ہے وہ حاصل نہیں ہوگا۔ اللہ ہی کو اصل ماننا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو تو فیک عطا فرمائے۔

## سورہ فاتحہ

(مؤرخہ: ۸/ جمادی الثانی ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۴ فروری ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

(قسط-۵)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ  
بِاللّٰہِ شُرُوْرًا اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاَتِ اَعْمَالِنَا وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ شُرُوْرًا اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاَتِ اَعْمَالِنَا  
مَنْ یَّہْدِہٖ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُضِلِّہٖ فَلَا هَادِیَّ لَہٗ وَ نَشْہَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ حْدَہٗ  
لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْہَدُ اَنْ سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہٗ اِلٰی کَافَّةِ  
النَّاسِ بِشَیْرِ اَوْ نَذِیْرًا اَوْ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرًّا جَامِئِیْنِ رَاصِلِی اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی  
اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَ بَارَکَ وَ سَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا . اَمَّا بَعْدُ .

الحمد لله رب العلمین ۞ الرحمن الرحیم ۞ ملک يوم الدين ۞ ایاک نعبد و  
ایاک نستعین ۞ اهدنا الصراط المستقیم ۞ صراط الذین انعمت علیہم ۞ غیر  
المغضوب علیہم ولا الضالین ۞

### گزشتہ سے پیوستہ:

سورہ فاتحہ چل رہی ہے، اب تک اس کی چار آیتیں ہوئی ہیں، اس کو تازہ کر لیں۔  
الحمد لله رب العلمین ۞ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔  
الرحمن الرحیم ۞ جو سب پر مہربان اور بہت مہربان ہے۔  
ملک يوم الدين ۞ جو روز جزاء یا روز حساب کا مالک ہے۔

ایاک نعبد و ایاک نستعین ۞ اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد

مانگتے ہیں۔

یہ چار آیتیں ہو گئی ہیں۔ اب یہ پانچویں آیت ہے:

اهدنا الصراط المستقیم ۱ اے اللہ! تو ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔  
اس کو یاد بھی کر لیجیے، کئی روز سے سبق ہو رہا ہے، ایک ایک آیت بھی یاد کریں گے،  
تو یاد ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ۔ تاکہ نماز میں جب پڑھیں، تو ذہن میں رہے کہ جو ہم پڑھ  
رہے ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟

اهدنا الصراط المستقیم ۱ اے اللہ! تو ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا  
فرما۔ اللہ تعالیٰ سے جو مدد مانگی جاتی ہے (یعنی ہم اللہ ہی سے مدد مانگتے ہیں) وہ تمام چیزوں  
میں مانگی جاتی ہے؛ لیکن ہماری سب سے بڑی ضرورت صراط مستقیم ہے۔ اسی کو یہاں مانگنا  
سکھایا گیا ہے۔ اهدنا الصراط المستقیم ۱ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما۔

## ہدایت کے دو معانی:

عربی زبان میں لفظ ہدایت دو معنی ادا کرنے کے لیے آتا ہے:

(۱) إراءة الطريق (صرف راستہ بتلادیا جائے): ایک آدمی آپ سے پوچھتا ہے  
کہ مجھے اسٹیشن جانا ہے، اسٹیشن تک رہنمائی کرو۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ یہاں بیٹھے  
بیٹھے اس سے یوں کہیں کہ مسجد سے نکل کر بائیں طرف چلو، پھر راستہ آئے گا تو دائیں  
طرف مڑ جانا، پھر ایک کشادہ راستہ آئے گا، وہاں سے آگے بڑھنا، راستہ میں پل آئے گا  
اس کو پار کرنا۔ اس طرح فلاں راستہ، فلاں راستہ، یہاں تک کہ آپ نے اسٹیشن تک کی  
ساری تفصیل اس کو زبانی بتلادی۔ اس کو إراءة الطريق کہا جاتا ہے۔

(۲) ایصال إلى المطلوب: یعنی آپ سے کوئی پوچھے کہ اسٹیشن تک میری رہنمائی کیجیے، تو آپ نے کہا: چلو آؤ! آپ نے اس کو اپنی بانک پر اپنے پیچھے بٹھا دیا، اور اسٹیشن پہنچ کر اتار دیا، ہاتھ پکڑ کر لے گئے کہ یہ اسٹیشن ہے۔ اس کو ایصال الی المطلوب کہتے ہیں۔ ہدایت کی یہ دو شکلیں ہیں۔

### صراطِ مستقیم مانگو!

یہاں صراطِ مستقیم سے جو ہدایت مانگی جا رہی ہے، وہ دوسری قسم ہے۔ اے اللہ! ہم کو صراطِ مستقیم پر پہنچا دے۔ جو تفصیلات بتلائی جاتی ہیں وہ تو پورا قرآن ہے، آپ جب قرآن کریم پڑھیں گے تو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی تفصیلات بتلائی ہیں، نبی کریم ﷺ نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ سیدھا راستہ کون سا ہے، یہ بتایا ہے، اور قرآن کریم میں بھی سب کچھ بتایا گیا ہے۔ تو ہدایت کا پہلا طریقہ یہاں مراد نہیں ہے، بلکہ اھدنا الصراطِ المستقیم یعنی اے اللہ! تو ہمیں سیدھے راستے پر لا کر کھڑا کر دے، ہماری انگلی پکڑ کر وہاں پہنچا دے۔ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ سے مانگی جا رہی ہے، اس لیے کہ یہ تفصیلات تو سب کو بتلائی گئی ہیں، مؤمن ہو، کافر ہو، منافق ہو، ایمان لایا ہو، نہ لایا ہو۔ یہاں جو صراطِ مستقیم مانگا گیا ہے وہ یہی ہے کہ اے اللہ! بس، تو ہم کو صراطِ مستقیم پر لا کر کھڑا کر دے۔

اور دیکھیے! صراطِ مستقیم میں کوئی تفصیل نہیں کی گئی، سیدھا راستہ کہاں کا؟ کس کا؟ مطلق رکھا گیا ہے۔ عربی زبان میں جب مفعول کو مطلق رکھا جاتا ہے، تو سب مراد ہوتے ہیں۔ یعنی ہر چیز کا سیدھا راستہ۔ اے اللہ! دنیا اور آخرت کے تمام امور میں ہمیں سیدھا راستہ بتلا۔



## سب کچھ اس میں آجاتا ہے:

دنیا کے کاموں میں: جیسے ہم تجارت کرنا چاہتے ہیں تو تجارت کا سیدھا راستہ ہم کو بتلا دے، تجارت کا وہ طریقہ جس سے تو راضی ہوتا ہے، ہم اسی کے مطابق تجارت کریں، اور آسانی کے ساتھ اپنے مقصود کو پالیں۔ اگر ہم زراعت کرنا چاہتے ہیں تو زراعت کے سیدھے راستہ کی رہنمائی ہمیں عطا فرما، ہم کو اس پر لا کر کے کھڑا کر دے، ہم اس کو آسانی اپنا لیں، اور مقصود تک پہنچ جائیں۔ ہم بیمار ہیں، علاج کرانا چاہتے ہیں، تو اے اللہ! علاج کے سلسلہ میں جو صراطِ مستقیم ہے اس کی طرف رہنمائی فرما۔ اس سلسلہ میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں، بہت سی مرتبہ مشورہ دینے والوں کے مشورہ کے نتیجے میں آدمی الجھن میں پڑ جاتا ہے کہ ہم علاج کے لیے کون سی شکل اختیار کریں؟ تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دعا سکھائی کہ اهدنا الصراط المستقیم ۱ یہ دعا مانگو، اور اس دعا کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے دل میں جو ڈالا جائے اس کے مطابق آپ کو علاج کا طریقہ اپنانا ہے۔ الحاصل ہر چیز میں اللہ سے صراطِ مستقیم مانگنا ہے، چاہے دنیوی امور ہوں یا اخروی امور ہوں، اللہ تعالیٰ ان تمام امور کو صحیح طریقہ سے، صحیح نیت کے ساتھ، شریعت کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق ہم سے انجام دلوائیں۔ اگر ہمیں یہ حاصل ہوگئی، اگر ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صراطِ مستقیم مل گیا تو ہمارا کام بن گیا۔ بظاہر یہ چھوٹا سا جملہ ہے اهدنا الصراط المستقیم تین کلمے ہیں، اهدنا اور الصراط اور المستقیم ۲ لیکن سب کچھ اس میں آجاتا ہے۔

## خلاصہ کا خلاصہ:

اسی لیے لوگوں نے کہا ہے: پورے قرآن کا خلاصہ سورہ فاتحہ ہے، اور سورہ فاتحہ کا

خلاصہ اھدنا الصراط المستقیمؑ ہے۔ پہلی تین آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنائیاں کی پھر ہم نے اللہ ہی کی بندگی کا اقرار کیا، اللہ ہی سے مدد مانگنے کا اقرار کیا اور اب ہم اللہ سے یہ سوال کر رہے ہیں: اھدنا الصراط المستقیمؑ اے اللہ! ہر چیز (دین، دنیا) میں سیدھا راستہ ہمیں بتلا دے اور اس کے مطابق ہم سے عمل کروالے۔ گویا تو ہم کو وہاں لا کر کھڑا کر دے۔ قرآن وحدیث میں اس کی تفصیلات ہیں؛ لیکن اس دعا کے ذریعہ ہم جو مانگ رہے ہیں وہ یہی مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں تو اس سلسلہ میں سیدھے راستے پر لا کر کے کھڑا کر دے، ہمیں کوئی زحمت نہ ہو، کسی قسم کی گمراہی میں مبتلا ہونے کی نوبت نہ آئے، اس انداز سے صراط مستقیم کا سوال کیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ ابھی بتلایا ہدایت میں یہ سب آجاتا ہے۔ ہم آخرت کے اعتبار سے اللہ پر ایمان لائیں، نبی کریم ﷺ پر ایمان لائیں، فرائض و واجبات کی ادائیگی کا اہتمام کریں، جائز ناجائز کے مطابق اپنی زندگی کو استوار کریں، یہ سب کر لیں گے تو ہمارا کام بن جائے گا۔

## یہی دعا حدیث میں:

خود نبی کریم ﷺ نے بھی یہی صراط مستقیم، یہی ہدایت اللہ سے خاص طور پر دعا کر کے مانگی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ کی دعا وارد ہے: اللھم! إن قلوبنا ونواصینا وجوارحنا ببیدک لم تملکنا منها شیئاً۔<sup>(۱)</sup> اے اللہ! بے شک ہمارے دل، ہماری پیشانیاں، اور ہمارے اعضاء، ہماری آنکھیں، ہمارے کان، ہماری زبان، ہمارے ہاتھ،

(۱) آخرجہ أبو نعیم فی الحلبة: ۸/ ۳۶۷ (ط: مکتبۃ الخانجی، القاہرۃ) والخطیب فی التاریخ ۵/ ۱

۲۶۲ (ط: دار الغرب الإسلامی) والمتقی الہندی فی کنز العمال: ۱۸۲/۲ (ط: مؤسسۃ الرسالۃ)

ہمارے پاؤں، ہماری ہر چیز تیرے قبضہ قدرت میں ہے۔ لم تملکنا منها شیئاً تو نے ہمیں ان میں سے کسی چیز کا مالک نہیں بنایا، کوئی اختیار ہمارے پاس نہیں ہے۔ فإذا فعلت ذالک بنا جب تیرا یہ معاملہ ہے ہمارے ساتھ، تیرے ہی قبضہ قدرت میں ہے، فکن أنت ولینا تو ہی ہمارا کاساز بن جا، واهدنا إلى سواء السبیل، یہاں بھی سواء السبیل مانگا گیا ہے، ہم کو سیدھے راستے پر لا کر کھڑا کر دے۔ تفصیلات تو قرآن وحدیث میں بھی ہے، لیکن خالی ان تفصیلات کو سننے سے کام نہیں بنتا، جب تک اللہ تعالیٰ ہمیں وہاں لا کر کھڑا نہ کر دے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ سے صراط مستقیم کو مانگا گیا ہے۔

## اس دعا سے قبل دو باتوں کا اہتمام کر لے:

اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کا اہتمام کیا جائے۔ اور آدمی اس دعا سے پہلے دو چیزوں کا اہتمام کر لے: (۱) عزم مصمم (۲) اپنی قدرت میں جتنا ہے اتنا کر لے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگے تو اللہ تعالیٰ کامیابی عطا فرماتے ہیں۔ مثلاً: ایک آدمی تجارت کرنا چاہتا ہے، تو تجارت کے سلسلہ میں شریعت کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق مجھے تجارت کرنی ہے، یہ عزم مصمم کر لے، کیسے ہی حالات کیوں نہ پیش آئیں، کیسی ہی رکاوٹیں کیوں نہ پیش آئیں، کیسی ہی مشکلات کا کیوں سامنا نہ ہو؛ لیکن اسی طریقہ کے مطابق میں اپنی تجارت کروں گا، یہ عزم مصمم۔ اور اپنی طاقت کے مطابق اس پر عمل کرنا بھی شروع کر دے۔ اور اس میں جو رکاوٹیں آئیں ان رکاوٹوں کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ اے اللہ! ہماری رہنمائی فرما، ہمیں وہاں تک پہنچا دے۔ جیسے ایاک نعبد و ایاک نستعین میں گزر چکا۔

کہیں گناہ میں پھسنے کا، گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو اس وقت بھی یہی عزم کر لیں، کچھ بھی ہو جائے، کیسی ہی صورت کیوں نہ ہو، ہم اس گناہ کا ارتکاب نہیں کریں گے، اور ساتھ ہی ساتھ اس گناہ سے بچنے کے لیے ہمارے مقدور میں جتنا ہے، ہمارے بس میں جتنا ہے وہ کر گزریں، اور پھر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں، تو اللہ تعالیٰ راستے کھول دیتا ہے۔

## عبرۃ لاولی الالباب:

سیدنا حضرت یوسفؑ کا واقعہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا، قرآن میں جتنے بھی واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ کوئی قصہ کہانی تھوڑے ہیں! بلکہ ان سے سبق دینا مقصود ہوتا ہے۔ سیدنا حضرت یوسفؑ سے زلیخا نے مطالبہ کیا۔ اب زلیخا کون ہے؟ وہ تو ان کے آقا کی بیوی ہے، ان کی خواہش پوری کرنے کا مطالبہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ اس کے لیے سارے اسباب مہیا کر دیے، دروازے بند کر دیے، دروازوں پر تالے لگا دیے، اور پھر خالی کہنا نہیں؛ بلکہ باقاعدہ عملی طور پر حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے بھی کوشش کی، ان کا دامن پکڑا۔ اس موقع پر حضرت یوسفؑ اگر یہ سوچتے کہ اب تو میں بالکل بے بس ہوں، اب تو میرے لیے اس چیز کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں کہ میں ان کی بات پر عمل کروں۔ اس لیے کہ دروازے بھی بند ہیں، نہ کوئی آسکتا ہے، نہ کوئی میری مدد کے لیے آئے گا، نہ میں باہر نکل سکتا ہوں، کیوں کہ تالے لگے ہوئے ہیں۔ سامنے تالا موجود ہے پھر بھی حضرت یوسفؑ نے اپنا ارادہ پختہ کر لیا، مجھے اس گناہ پر عمل نہیں کرنا ہے، اس گناہ کا ارتکاب نہیں کرنا ہے، اور پختہ ارادہ کر لیا کہ اس گناہ سے مجھے اپنے آپ کو بچانا ہے۔ اور اس عزم کے ساتھ پھر اپنی طاقت میں جتنا تھا کہ اس کے ہاتھ سے اپنے آپ کو چھڑا کر کے دروازے کی طرف بھاگے،

حالاں کہ دروازے پر تالے لگے ہوئے ہیں، دروازہ بند ہے۔ دوسرا آدمی یوں سوچتا کہ بھاگ کر بھی کیا کروں گا؟ وہاں جا کر بھی کچھ کام تو ہونے والا نہیں ہے! لیکن نہیں؛ حضرت یوسفؑ نے ہتھیار نہیں ڈالے، اتنا (دروازے تک) بھاگتا تو اپنے ہاتھ میں تھانا، اتنا تو کر لیا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں دروازے کے پاس پہنچے، خود ہی تالا ٹوٹا، دروازہ کھلا، باہر اپنے آقا کو پایا۔

بہر حال! کہنے کا حاصل یہ ہے کہ آدمی اللہ کے حکم پر عمل کرنے کا عزم مصمم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی طاقت میں اس پر عمل کرنے کے لیے جتنا کچھ ہو سکتا ہے وہ کر گزرے اور آگے کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ سے مدد مانگے، تو پھر دیکھو! اللہ تبارک تعالیٰ ساری رکاوٹیں دور کر دیں گے، اور اس کے لیے عمل کی راہیں اللہ تعالیٰ آسان کر دیں گے۔ یہی دعا اللہ تعالیٰ سے مانگی ہے۔ اور ہمیں اپنی زندگیوں کو اسی کے مطابق بنانا ہے، اسی کی کوشش کرنی ہے۔

گویا ایک آدمی زبان سے دعا مانگے؛ لیکن اس دعا کے تقاضے کے مطابق عمل نہ کرے، اس کا گناہ سے بچنے کا عزم نہ ہو، اور کہے: اللہ! بدنگاہی سے میری حفاظت فرما لیکن بدنگاہی سے بچنے کے لیے عزم مصمم نہیں کرتا، بدنگاہی سے بچنے کے لیے اپنی طاقت میں، اپنے بس میں، اپنی قدرت میں جتنا ہے وہ کرتا نہیں ہے اور پھر یوں کہتا ہے کہ: میں تو بے بس ہوں۔ کس طرح ہوگا؟ یہ دونوں کام تو کرنے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگیں۔

.....تو دعا نہیں، مذاق ہے:

پہلے یہ دونوں کام کیے بغیر اگر دعا مانگیں گے تو وہ دعا نہیں؛ مذاق ہے۔ سیدھی بات

ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں اس کے مطابق ہی کرنا ہے تو اس کے لیے یہ دو کام جب کریں گے، پھر دعا مانگیں گے تو حقیقی معنی میں طلب ہوگی، دعا ہوگی، اور اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مدد بھی فرمائیں گے۔ ورنہ نہ تو عزم مصمم ہو، نہ اپنے مقدور بھر جو کچھ کر سکتے ہیں اس کے کرنے کا اہتمام ہو، خالی زبان پر یہ ہو کہ اهدنا الصراط المستقیم ۱ یہ تو یوں سمجھیے کہ ایک جھوٹا مطالبہ ہے، طلب صحیح نہیں ہے، صحیح طلب تو اسی وقت کہلائے گی جب پہلے ہماری طرف سے دو کام عمل میں آجائیں، تو پھر تیسرا ہماری طرف سے دعا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے جو مطالبہ کیا گیا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس مطالبہ کو پورا فرمائیں گے۔ ورنہ ہم تو دل سے نہیں چاہتے، ہم نے اس کے لیے عزم مصمم نہیں کیا، ہم نے اس کے لیے اپنی طرف سے جو کوشش کر سکتے ہیں وہ کوشش نہیں کی، اور پھر ہم یہ امید رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے یہ کام کروائیں انزل مکموھا وانتہلھا کرمون۔ (ہود: ۷۸) کیا ہم زبردستی تمہارے سر تھوپیں گے، جب کہ تم دل سے اس کو چاہتے نہیں ہو؟ دل سے آدمی چاہے، اس کے لیے عزم مصمم کرے، عملی اقدام بھی جتنا اس کی طاقت میں ہے، بس میں ہے وہ کر گزرے، اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے راہ کھول دیں گے۔

اهدنا الصراط المستقیم ۲ روزانہ، ہر نماز میں، اور نماز کی ہر رکعت میں گویا ہم کو یہ دعا سکھائی گئی۔ جب یہ پڑھیں تو پڑھتے ہوئے ہمیں اس کا احساس ہونا چاہیے۔ جو لوگ اس کے معانی کو جانتے ہیں وہ بھی اس کے اوپر سے غفلت کے ساتھ گزر جاتے ہیں، اور اس کی طرف سے بے اعتنائی کے ساتھ گزر جاتے ہیں، کیا مانگا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ٹیپ ریکارڈ کا ایک بٹن ہے، دبا دیا اور ٹیپ چل رہی ہے، ہماری نماز کا بھی ایسا حال ہو گیا ہے۔

ہر ہر جملہ جب ہماری زبان سے نکلے تو یہ دعا دل کی گہرائیوں سے ہماری زبان پر

آنی چاہیے، پھر دیکھو! اللہ تعالیٰ اس کے کیسے اثرات اس پر مرتب کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کیسے نوازتے ہیں۔ ہر رکاوٹ کو ان شاء اللہ دور کر دیں گے، ہر پریشانی کو اللہ تعالیٰ ختم کر دیں گے، ہر مشکل کو اللہ تعالیٰ آسان فرما دیں گے؛ لیکن بس! بات وہی ہے کہ اللہ سے دل کی گہرائی سے اس کی طلب ہو، اور اس طلب سے پہلے جو دو شرطیں ہیں۔ عزم مصمم اور اپنی قدرت کے مطابق اس پر عمل کرنے کی۔ وہ دونوں شرطیں پوری ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق اور سعادت عطا فرمائے۔

## سورہ فاتحہ

(مؤرخہ ۱۵ / جمادی الثانی ۱۴۳۹ھ مطابق ۴ مارچ ۲۰۱۸ء شب یک شنبہ)

(قسط-۶)

الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ  
بِاللّٰهِ شُرُوْرَ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ شُرُوْرَ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا  
مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَ مَنْ يَضِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَ نَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ حْدَهُ  
لَا شَرِيْكَ لَهُ وَ نَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَ رَسُوْلُهُ اَرْسَلَهُ اِلَى كُلِّ  
النَّاسِ بِشَيْرٍ اَوْ نَذِيْرٍ اَوْ دَاعِيٍّ اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهِ وَ سِرَّ اَجَامُنِيْرًا صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَ عَلَى  
اٰلِهِ وَ اَصْحَابِهِ وَ بَارَكَ وَ سَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ.

الحمد لله رب العلمين ۞ الرحمن الرحيم ۞ ملك يوم الدين ۞ اياك نعبد و  
اياك نستعين ۞ اهدنا الصراط المستقيم ۞ صراط الذين انعمت عليهم ۞ غير  
المغضوب عليهم ولا الضالين ۞

## آموختہ:

سورہ فاتحہ کی چار آیتیں ہو چکی ہیں، دوبارہ ان کا ترجمہ کر لیتے ہیں تاکہ ذہن نشین  
ہو جائیں۔ یہ سورت چوں کہ ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے، اس لیے ضرورت ہے  
کہ اس کی ہر آیت کا مطلب اور ترجمہ ہمیں یاد ہو، تاکہ جب نماز میں پڑھیں تو اس کو سمجھ کر  
دھیان اور توجہ کے ساتھ پڑھیں۔ اس لیے سننے والوں سے بھی درخواست ہے کہ اس کے  
ترجمہ و معانی کو اپنے دل و دماغ میں محفوظ کر لیں۔



﴿الحمد لله رب العالمين﴾ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

﴿الرحمن الرحيم﴾ جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے۔

﴿ملك يوم الدين﴾ جو روز جزاء یا روز حساب کا مالک ہے۔

اس دنیوی زندگی کے بعد دوسری زندگی ہے، میدانِ حشر میں اللہ تعالیٰ کے حضور ہمیں اپنی دنیوی زندگی کے تمام اعمال کا حساب دینا ہے، کوئی بچ نہیں سکتا۔ اُس دن اللہ تبارک و تعالیٰ کی ملکیت اور اس کی بادشاہت کا ظہور ہوگا۔ اللہ تعالیٰ روز جزاء کا مالک ہے، یعنی مالک تو اللہ تعالیٰ آج بھی ہیں؛ لیکن دنیا میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسانوں کو بھی چیزوں کی مجازی ملکیت عطا فرمائی ہے۔

## حقیقی مالک، اللہ:

میں اور آپ کپڑا پہنے ہوئے ہیں، کپڑے کے ہم مالک کہلاتے ہیں۔ ہماری جیب میں جو پیسے ہیں، ہم اس کے مالک کہلاتے ہیں، اپنے مکان کے مالک کہلاتے ہیں، اگرچہ ملکیت حقیقی نہیں ہے، حقیقی ملکیت تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہے؛ لیکن ہم مالکِ مجازی ہیں۔ دنیا میں فائدہ اٹھانے کا اللہ تعالیٰ نے ہم کو موقع دیا ہے۔ یہ سب املاک بھی اُس دن نہیں رہیں گی۔ کسی کے پاس کچھ نہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ قبروں سے جب اٹھائیں گے، تو بدن پر کپڑا نہیں ہوگا، پاؤں میں جوتا نہیں ہوگا، جیسا ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، ویسا اٹھایا جائے گا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں برہنہ پا، برہنہ بدن، اور بغیر ختنہ کیے ہوئے اٹھائے جائیں گے۔<sup>(۱)</sup>

(۱) قدمز تخریجہ فی ص: ۶۳۔

باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: کہا بد اُنا اول خلق نعیدہ (الانبیاء: ۱۰۳) کسی کی کوئی چیز نہیں، سب چیزوں کے مالک حقیقت میں بھی اللہ اور ظاہری اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ ہوں گے۔ کسی کی کوئی حکومت نہیں، اللہ تعالیٰ خود سوال کریں گے: لمن الملک الیوم۔ (الغافر: ۱۶) (آج کس کی حکومت ہے؟) کوئی جواب دینے والا نہیں ہوگا، اللہ تبارک و تعالیٰ خود ہی جواباً فرمائیں گے: اللہ الواحد القہار (ایک اللہ کی جو غلبہ والا ہے) تو یہ ملک یوم الدین کا استحضار ہونا چاہیے۔ یہ آیتیں جب پڑھیں تو اس وقت اس کا تصور ہونا چاہیے۔

یہ بات گزر چکی کہ اس سورت کے منجملہ اسما کے ایک نام ”سورة الصلاة“ ہے۔ اس لیے کہ یہ سورت نماز میں پڑھی جاتی ہے۔ جب بندہ نماز میں پڑھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں، اس کا استحضار ہونا چاہیے۔

## احباب از در حق بہر استقبال.....:

مسلم شریف کی روایت ہے: بندہ جب نماز میں پڑھتا ہے الحمد للہ رب العلمین (تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے) تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں: حمدنی عبدی (میرے بندے نے میری حمد بیان کی، میری تعریف کی) یہ استحضار ہونا چاہیے۔ چنانچہ آدمی جب پڑھے تو قدرے ٹھہر جائے، گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے جواب دیا جا رہا ہے اس کا تصور کرے۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کے متعلق نقل کیا جاتا ہے۔ بڑے اولیا و صوفیا میں سے تھے۔ کہ نماز میں جب میں سورہ فاتحہ پڑھتا ہوں تو الحمد للہ رب العلمین پڑھتا ہوں اور اللہ کا جواب سنے بغیر آگے نہیں بڑھتا۔ اللہ کے ایسے بھی بندے ہیں !!! اور آپ ﷺ

نے یہ ارشاد فرمایا، اور آپ کا ارشاد حق ہے: اللہ تعالیٰ نے میرے اس پڑھنے کے جواب میں یہ فرمایا۔ اگرچہ میں نے اپنے ضعف حس کی وجہ سے نہیں سنا؛ لیکن اللہ نے فرمایا ہے۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: جب بندہ الرحمن الرحیم ُ پڑھتا ہے، تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اثنی علی عبدی (میرے بندے نے میری ثناء بیان کی) اور جب بندہ مُلکِ یوم الدین ُ (جو روز جزاء کا مالک ہے) پڑھتا ہے، تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: مَجْدَنی عبدی (میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی) ان تین آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین (اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) عبادت اللہ کی ہوتی ہے تو یہ آدھا حصہ تو اللہ کے لیے ہوا۔ و ایاک نستعین ُ (تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) یہ بندے کی حاجت پوری ہوئی۔ اس لیے اس کے جواب میں کہا: هذا بینی و بین عبدی و لعبدی ماسأل (یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کو وہ ملا، یا میں نے دیا جو اس نے مانگا) اور آگے جب پڑھتا جائے گا اهدنا الصراط المستقیم ُ تو اللہ تعالیٰ فرماتے جائیں گے: هذا لعبدی و لعبدی ماسأل، هذا لعبدی و لعبدی ماسأل (یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے نے جو جانا نگاہ میں نے اس کو دیا۔<sup>(۱)</sup> لہذا یہ استحضار ہونا چاہیے۔

## آمد م بر سر مطلب:

اهدنا الصراط المستقیم (اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما) پر پہنچے تھے، اس سلسلہ میں بتلایا تھا کہ ہر چیز میں سیدھا راستہ دنیوی امور میں بھی، اور

(۱) قدم تزخیر جہ فی ص: ۳۳۔

اخروی امور میں بھی۔

ہم تجارت کرتے ہیں تو اس میں بھی اللہ سے مانگیں: اے اللہ! ہم کو تیرا راستہ بتلا دے، اُسی کے مطابق ہم حلال طریقہ سے تجارت کریں۔ اور تجارت میں کوئی غلط چیز جس کو تو نے منع فرمایا ہے ہم اس کا ارتکاب نہ کریں۔ گویا اس میں سیدھا راستہ۔ ہم علاج معالجہ کے لیے جا رہے ہیں تو اس میں بھی سیدھا راستہ۔ اور جس کے پاس جائیں اس کے اوپر بھی اللہ تعالیٰ بیماری کی حقیقت منکشف فرمائے اور اس کا علاج بھی اللہ تعالیٰ منکشف فرمائے۔ تو اگر آدمی ہر چیز میں سوال کرے گا اور اھدنا الصراط المستقیم پڑھتے ہوئے سوچے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ولعبدی ما سأل، کا پروانہ ہوگا۔

## معلومات کو معمولات بناؤ!!!

شروع میں یہ بات گزر چکی کہ اس کی فضیلت کے سلسلہ میں احادیث میں وارد ہیں: ایک مرتبہ حضرت جبریلؑ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور آسمان سے ایک آواز آئی، انہوں نے سراٹھا کر دیکھا اور فرمایا: آج آسمان کا ایک ایسا دروازہ کھلا جو آج تک کبھی نہیں کھلا، اور آج اس سے ایک فرشتہ اتر جو کبھی زمین پر نہیں آیا تھا، اور اس نے آکر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کی امت کو دونوں عطا فرمائے جو کسی کو پہلے نہیں دیے گئے، جو آدمی اس سے دعا کرے گا اللہ اس کو قبول فرمائیں گے۔<sup>(۱)</sup> اللہ نے دعا سکھائی اور اللہ نے یہ دعا ہر نماز، بلکہ نماز کی ہر رکعت میں ہم پڑھتے تو ہیں؛ لیکن اس کو پڑھتے وقت جو توجہ، دھیان اور استحضار ہونا چاہیے وہ نہیں ہے۔ ایک عادت بن گئی ہے کہ روزانہ ہماری

(۱) قدم تزخیر جہ فی ص: ۳۷، الہامش: ۱۔

زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے چلے جاتے ہیں اور ہمارا خیال کسی اور چیز کی طرف ہوتا ہے، تو اس کا حقیقی فائدہ ہم کو نہیں پہنچتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس کا اہتمام کریں۔ کوشش کریں اور اس کی عادت ڈالیں۔

بہر حال! یہ پانچویں آیت تھی اٰھدنا الصراط المستقیم ۱ (اے اللہ! تو ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما) ہر چیز میں، دنیا و آخرت کے تمام کاموں میں۔

## صراط مستقیم کیا ہے.....؟؟؟

صراط الذین انعمت علیہم یہ چھٹی آیت ہے۔ صراط مستقیم کیا ہے؟ صراط مستقیم بتلایا جا رہا ہے، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں پر انعام فرمایا ان کا راستہ۔

دوسری جگہ سورۃ نساء میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يَطْعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصَّدِيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ. (النساء: ۶۹) جو لوگ دنیا میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت اور فرماں برداری کرتے ہیں، تو جب انہوں نے اپنی زندگی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ گزاری تو اللہ تعالیٰ قیامت میں بھی اُن کو ان بندوں کے ساتھ۔ جن پر اللہ کا انعام ہوا۔ رکھیں گے ویسے جو مقام اور مرتبہ اُن کا ہے وہ تو نہیں؛ لیکن وہاں آسانی کے ساتھ وہ ملاقات کر سکیں گے۔ جیسے سفر میں ہمارا کوئی رفیق ہے، فرسٹ کلاس میں بیٹھا ہوا ہے، اس کے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہے، ہم فرسٹ کلاس میں چوں کہ نہیں بیٹھ سکتے؛ لیکن باقاعدہ اس گاڑی کا ٹکٹ ہمارے پاس ہے تو ملاقات کے لیے جائیں تو کم سے کم اتنی گنجائش تو نکلتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی

طرف سے ان تمام لوگوں کو۔ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا اہتمام کرتے ہیں۔ کو موقع دیا جائے گا کہ ان کی ملاقات جب چاہیں کر لیں، ان کا دیدار کر لیں۔

## منعم علیہ کون؟

ایک صحابی نے آ کر نبی کریم ﷺ سے درخواست کی تھی: اے اللہ کے رسول! مجھے آپ کے ساتھ ایسی محبت ہے، آپ کو دیکھے بغیر مجھے چین نہیں پڑتا، گھر میں ہوتا ہوں اور آپ کی یاد آتی ہے تو آ جاتا ہوں اور دیکھ لیتا ہوں۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ دنیا میں تو میں کر لیتا ہوں، آخرت میں کیا ہوگا؟ تو پھر اس پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے یہ بتایا گیا۔ جن پر انعام کیا گیا ہے وہ کون ہیں؟

اس آیت میں بتلایا گیا کہ من النبیین۔

انبیاء تو وہ جماعت ہے جن پر اللہ تبارک و تعالیٰ وحی بھیجتے ہیں۔ نبوت کسی آدمی کی اختیاری چیز نہیں ہے، کوئی آدمی اپنے ارادے اور اختیار سے نبی نہیں بن سکتا ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ ہی کا انتخاب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے بعض بندوں کو چنتے ہیں، اور ان پر فرشتوں کے ذریعہ وحی بھیجتے ہیں، اور ان کو اس بات کا پابند کیا جاتا ہے کہ وحی کے ذریعہ جو پیغامات تم کو دیے گئے ہیں، ہمارے ان پیغامات کو دوسرے بندوں تک پہنچاؤ۔ انبیاء سے اللہ تعالیٰ دوسرے بندوں کی اصلاح کا کام لیتے ہیں۔ اب جب نبی کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو اب نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا، آپ ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں۔ ویسے قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام نازل ہوں گے؛ لیکن ان کی بعثت تو حضور ﷺ سے پہلے ہو چکی ہے۔

والصديقين اور دوسری جماعت جن پر اللہ کا انعام ہوا وہ صدیقین کی ہے۔ یعنی اپنے ظاہر اور باطن سے وہ اللہ کے نبیوں کی تصدیق کر چکے، یعنی اللہ کے نبیوں کو ماننا، ظاہر سے بھی اور باطن سے بھی۔ گویا ان کے ماننے کے معاملہ میں انہوں نے کوئی دلیل نہیں مانگی، بغیر دلیل کے، سچے دل سے ان کو تسلیم کیا۔

حضور اکرم ﷺ نے حضرت صدیق اکبرؓ کو جب اپنی نبوت سے آگاہ کیا تو فوراً ایمان لے آئے، انہوں نے نبوت کی کوئی دلیل نہیں مانگی۔ آپ ﷺ جب معراج سے واپس تشریف لائے، تو ابھی تک حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس بات پہنچی نہیں تھی، اور لوگوں کو معلوم ہوا تو ان سے کہنے لگے کہ تم جن پر ایمان لائے وہ کیا کہتے ہیں معلوم ہے؟ تو حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا: اگر وہ کہتے ہیں، تو صحیح ہے۔ دلیل کے بغیر سچے دل سے جو تسلیم کر لے، جی جان سے ان کی صداقت کی گواہی دے تو اس کو صدیق کہا جاتا ہے۔

والشهداء تیسری جماعت ہے شہدا۔ اللہ کے دین کے لیے وہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں، اللہ کے دین کی سر بلندی اور اس کی حفاظت کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دیتے ہیں، تو یہ تیسری جماعت ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا۔

والصلحین چوتھی جماعت صالحین۔ نیک بندے جو ہر طاعت کا اہتمام کرتے ہیں، اور اللہ کی منع کی ہوئی ہر چیز سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں، ذرہ برابر بھی اس میں کمی کوتاہی نہیں کرتے۔ طاعت کا مکمل طور پر اہتمام اور منہا ہی سے مکمل طور پر اجتناب، یہ صالحین کی جماعت ہے۔ پس آیت کریمہ میں بتلایا گیا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی برکت سے اُس کا حشر بھی انبیاء و صدیقین وغیرہم کے ساتھ ہوگا۔<sup>(۱)</sup>

(۱) أخرجه الطبرانی في الصغير برقم: ۵۲ (ط: مکتبہ الاسلامی دار عمار، بیروت)

آدمی کو چاہیے کہ اللہ کی اطاعت کا ایسا اہتمام کرے کہ کسی بھی طاعت کے معاملہ میں، اس کی بجا آوری میں کوئی کمی کوتاہی نہ ہونے پائے، اور کسی بھی معصیت سے بچنے کے معاملہ میں بھی کوئی کمی کوتاہی نہ ہو۔

## ایک غلط فہمی کا ازالہ:

دیکھو! یہاں صراطِ مستقیم کی وضاحت میں کہا گیا: ان لوگوں کا راستہ جن پر اللہ نے انعام کیا، اس کے ذریعہ ایک بہت بڑی حقیقت بتلائی گئی اور ایک غلط فہمی کو دور کیا گیا۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن ہمارے پاس ہے، اور ہم عربی زبان جانتے ہیں، یا اگرچہ ہم عربی زبان نہیں جانتے؛ لیکن آج کل تو قرآن کے ترجمے بکثرت ہو گئے ہیں، ہم اپنے طور پر قرآن کا مطالعہ کر کے اس کے مطابق عمل کر لیں گے، یہ ہماری ہدایت کے لیے کافی ہے۔ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم کسی سے پوچھیں کہ فلاں عالم کیا کہتے ہیں؟ اور فلاں صالح کیا کہتے ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے بتلادیا کہ اگر ہدایت کا راستہ پانا چاہتے ہو تو منعم علیہ جماعت۔ جن پر اللہ کا انعام ہوا۔ ان کی صحبت اختیار کرو۔ ان کی صحبت اختیار کرو گے تو ہی آپ کو ہدایت کا راستہ ملے گا۔

اللہ تعالیٰ کا دستور یہی رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتابیں بھیجیں، کتابیں انسان کی ہدایت کے لیے ہی بھیجی جاتی ہیں، قرآن میں بھی اللہ نے ہدایت کا راستہ کھول کر بیان کر دیا ہے۔ میں نے جہاں ہدایت کی وضاحت کی تھی وہاں بتلایا تھا کہ ہدایت کی ایک قسم ہے راستہ بتلادینا، وہ تو اللہ تعالیٰ نے بتلایا ہی دیا ہے، سب کے لیے، مؤمن ہو، کافر ہو، ہر ایک کے سامنے کھلی ہوئی کتاب ہے۔؛ لیکن اللہ تعالیٰ منزل مقصود تک پہنچا دیں، یہ اصلی ہدایت



ہے۔ ایصال الی المطلوب، اسی کا سوال کیا جا رہا ہے۔ اور یہ ہدایت کب ملے گی؟ جب کہ ان کی صحبت اختیار کی جائے گی۔ ان کی صحبت ہی سے آپ کو صحیح راستہ ملے گا۔

## کتاب اللہ اور رجال اللہ:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کتابیں نازل کیں، کتاب اللہ کے ساتھ رجال اللہ کا بھی سلسلہ رکھا، کبھی ایسا تو نہیں ہوا کہ کتاب اتاری ہو اور اس کے ساتھ نبی اور پیغمبر نہ بھیجا ہو، جتنی بھی کتابیں اللہ نے بھیجی ہیں نبی اور پیغمبروں پر ہی بھیجیں۔ ایسا تو ہوا کہ پیغمبر بھیجا، ساتھ میں کتاب نہیں ہے۔ پہلے بھیجی ہوئی کتاب کے تابع بنادیا، الگ سے کتاب نہیں دی گئی؛ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب بھیجی ہو اور ساتھ میں نبی اور پیغمبر کو نہ بھیجا ہو، نہیں! پیغمبر اور نبی ہوں گے تب ہی کتاب پر عمل کا طریقہ معلوم ہوگا۔ قرآن میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: **وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیہم**۔ (النحل: ۴۴) (ہم نے یہ نصیحت کی کتاب، یہ قرآن آپ پر اتارا، تاکہ آپ ان لوگوں کے لیے قرآن کی ہدایتوں کو واضح کریں) گویا قرآن کے بتلائے ہوئے راستے کو نمونہ پیش کر کے عملی طور پر بتلانا یہ پیغمبروں کا اور جنہوں نے پیغمبروں کی صحبت اٹھائی۔ صدیقین، شہداء اور صالحین۔ ان کا کام ہے۔ ان کے ساتھ رہو گے تو ہی آپ کو ہدایت کا راستہ ملے گا۔ صرف قرآن کے مطالعہ سے نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مشرکین نے کہا تھا: **لولا نزل هذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم**۔ (الزخرف: ۲۱) (یہ قرآن دو بستیوں (مکہ مکرمہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا؟) اللہ تعالیٰ چاہتے تو اس پر قدرت رکھتے تھے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں تمام حضرات لیٹے ہوئے ہیں، صبح کو جب اٹھیں تو تکیہ کے

پاس قرآن رکھا ہوا ہو، نیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسمان سے اعلان کر دیا جاتا کہ تمہارے پاس اللہ کی کتاب رکھ دی گئی ہے، اس کا مطالعہ کرو اور اس کے مطابق عمل کرو۔ لیکن ایسا نہیں کیا۔ بلکہ کتاب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے رجال اللہ یعنی اللہ کے مخصوص بندے، پیغمبروں کو بھی بھیجا۔ توریت بھیجی تو حضرت موسیٰؑ پر بھیجی، زبور بھیجی تو حضرت داؤدؑ پر، انجیل حضرت عیسیٰؑ پر، قرآن حضرت نبی کریم ﷺ پر۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اکیلی کوئی کتاب بھیجی۔ اکیلی کتاب سے ہدایت نہیں پھیلتی۔

### صحبت ضروری ہے:

دنوی علوم و فنون بھی خالی کتاب پڑھنے سے نہیں آتے۔ میڈیکل سائنس ہے، کوئی ڈاکٹر بننا چاہتا ہے، ڈاکٹری کی کتابیں چھپی ہوئی موجود ہیں، ایک آدمی بہترین انگریزی زبان جانتا ہے، وہ یہ دعویٰ کرے کہ میں میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر ڈاکٹر بن جاؤں گا، اور مریضوں کا علاج کروں گا، تو اگر وہ علاج کرے گا تو قبرستان آباد کرے گا۔ کسی ڈاکٹر کی صحبت میں رہے بغیر خالی میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھنے سے وہ ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ اسی طرح دوسری اقسام ہیں، جیسے کوکنگ (cooking) یعنی کھانا پکانا ایک فن ہے۔ تو کھانا پکانے کے سلسلہ میں بے شمار کتابیں دکانوں پر آپ کو ملیں گی۔ اردو میں: فلاں دسترخوان، فلاں دسترخوان۔ گجراتی میں بھی ملتی ہیں؛ لیکن اب کوئی آدمی صرف ان کتابوں کو پڑھے، کسی باورچی کی صحبت اس نے اختیار نہیں کی، وہ صرف کتابیں دیکھتا ہے، ان کتابوں میں بریانی کا طریقہ بھی لکھا ہے، قورمہ کا طریقہ بھی لکھا ہوا ہے، قورمہ بنائے گا تو قورمہ تو بننے والا ہی نہیں ہے، پتہ نہیں کیا بن جائے گا؟ جب تک کسی باورچی کی صحبت اختیار نہیں

کرے گا، وہاں تک پکا نہیں سکتا۔

کپڑے سینے (Tailoring) کے فن کے سلسلہ میں بھی آپ کو دکانوں پر بہت ساری کتابیں ملیں گی، کوئی آدمی محض ان کتابوں کو پڑھ کر درزی بننا چاہے، تو کپڑا تو کیا سیے گا کاج بنانا بھی نہیں آئے گا۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ درزی کی صحبت اختیار کرے، گویا دنیا کے علوم و فنون بھی خالی کتابیں پڑھنے سے نہیں آتے؛ بلکہ جو ان فنون کے جاننے والے ہیں، ماہر ہیں، ان کی صحبت اختیار کرو، اور ان کی تربیت میں رہو گے، تب یہ چیزیں آئیں گی۔ اس کے بعد کتابیں پڑھو گے تو وہ کتابیں آپ کو فائدہ پہنچائیں گی، ورنہ خالی کتابوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ خالی قرآن پڑھ کر کوئی آدمی ہدایت کے راستہ پر چلنا چاہے تو ناممکن ہے۔ پیغمبروں کی ہدایت کے بغیر یہ ہدایت کا راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔

جو لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہماری ہدایت کے لیے تو قرآن کافی ہے، قرآن کے ترجمے ہو گئے ہیں، تفسیریں ہو گئی ہیں، ہم خود ہی ان تراجم و تفاسیر سے قرآن سمجھ کر اس کے مطابق عمل کر کے ہدایت کا راستہ پالیں گے، وہ نہیں پاسکتے۔ یہی طریقہ ہے کہ جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے، جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے ان کی صحبت اختیار کرو۔ اسی لیے کہا گیا صراط الذین انعمت علیہم ۛ راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام کیا۔ اور وہ کون لوگ ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں دوسری جگہ وہ چار جماعتیں بتلائی ہیں۔

## مثبت و منفی:

دیکھو! ہدایت کے راستے کو اللہ تعالیٰ نے دونوں حیثیتوں سے محدود کر دیا:

(۱) مثبت حیثیت سے: ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔

(۲) منفی حیثیت سے: وَلَا الضَّالِّينَ نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا غضب نازل

ہوا، اور نہ ان کا راستہ جو بھٹکے ہوئے ہیں۔

نیک صحبت اختیار کرو اور غلط صحبت سے اپنے آپ کو دور رکھو، تب ہی ہدایت کا راستہ

پا سکتے ہو۔ ورنہ تو ہدایت کا راستہ ملنے والا نہیں ہے۔

## مغضوب علیہم کون؟

اب مغضوب علیہم وَلَا الضَّالِّينَ کہا گیا ہے کہ جن پر غضب ہوا وہ کون ہیں؟

اُس زمانے میں نبی کریم ﷺ نے یہودی کی طرف اشارہ کر کے بالتبعین بتلایا۔ ترمذی شریف

میں حضرت عدی بن حاتمؓ کی روایت میں وارد ہے، حضور ﷺ نے ان کو بتلایا تھا کہ جن پر

غضب نازل ہوا وہ یہود ہیں۔<sup>(۱)</sup> علما فرماتے ہیں کہ ان کے سامنے حق آیا، لیکن انہوں نے

اس کو اختیار نہیں کیا، سب یہودی جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ ہی اللہ کے واقعی آخری پیغمبر

ہیں، جن کے متعلق اگلی کتابوں میں بشارت آئی ہے؛ لیکن انہوں نے اس کو مانا نہیں، کیوں؟

حسد کی وجہ سے۔

## یہود بے ہبود:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے: حضرت اسماعیلؑ اور حضرت

اسحاقؑ۔ اور حضرت اسحاقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ تھے۔ ان ہی کا دوسرا نام اسرائیل تھا،

ان کے بارہ بیٹے تھے اور ان بارہ بیٹوں سے جو اولادیں چلیں وہ بنو اسرائیل کہلائیں، یہی

لوگ یہود کہلاتے ہیں۔ پھر جتنے بھی انبیاء حضرت ابراہیمؑ کے بعد حضرت عیسیٰؑ تک آئے

(۱) آخر جہ الترمذی برقم: ۲۹۵۴ (ط: مصطفیٰ البابی الحلبي، مصر)

وہ سب کے سب بنو اسرائیل میں سے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے اگلی ساری کتابوں (توریت، زبور، انجیل) میں نبی آخر الزمان کو بھیجنے کی بشارت دی اور نشانیاں بتائیں۔ ان میں یہ نہیں کہا گیا تھا کہ وہ بنو اسماعیل سے ہوں گے۔ ان کی دوسری ساری علامتیں بتلائیں تو اب تک سارے انبیاء یہود کے خاندان میں آئے، جس کی وجہ سے ان کو یہ گھمنڈ تھا اور ان کا یہ خیال تھا کہ آخری نبی بھی ہمارے اندر ہی آئیں گے۔ لیکن جب حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں پیدا کیا اور آپ ﷺ کو نبی آخر الزمان بنایا گیا تو جاننے کے باوجود کہ یہ نبی ہیں، نہیں مانا۔

بہت سی مرتبہ جاننے کے باوجود عمل نہ کرنا، اللہ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ اس معنی کر کے ان کو مغضوب علیہم کہا گیا، کہ ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ اور عیسائی راہ حق سے بھٹکے ہوئے ہیں، ان کو گمراہ کہا گیا ہے۔ لہذا نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر اللہ تبارک و تعالیٰ کا غضب نازل ہوا، اور نہ ان لوگوں کا جو صحیح راستہ سے بھٹک گئے۔ بلکہ ان لوگوں کا راستہ بتا جن پر اللہ کا انعام ہوا، اور وہ جماعتیں بھی اللہ نے متعین کر کے بتلا دی ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی تعیین کر دی۔ اب بندے باسانی اس پر چل سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے صراطِ مستقیم پر چلنا آسان فرمائے۔

## آمین؛ امت محمدیہ کی خصوصیت:

جب اس کو پڑھیں تو آمین کہیں، آمین کا معنی ہے اے اللہ! ہماری دعا قبول فرما، استجب دعوتنا یہ آمین بھی حضور ﷺ نے اس امت کی خصوصیت بتلائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر جو چیزیں امت محمدیہ کو عطا فرمائیں ان میں سے ایک آمین بھی ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ یہود اس پر بھی تم پر حسد کرتے ہیں کہ ان کو یہ چیز کیوں ملی؟

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورہ قارعہ

(قط-۱)

(مؤرخہ: ۷ ربیع الآخر ۱۲۴۰ھ - مطابق: ۱۵ دسمبر ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل  
عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله  
من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له  
ومن يضلل الله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك  
له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة  
الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله  
تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً .  
أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم ۞ بسم الله الرحمن الرحيم ۞

الْقَارِعَةُ ۝۱ مَا الْقَارِعَةُ ۝۲ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝۳ يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ۝۴  
وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعُفُوسِ ۝۵ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ۝۶ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ۝۷  
۝۸ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۝۹ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ۝۱۰ وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَةُ ۝۱۱ نَارُ حَامِيَةٍ ۝۱۲

## ترجمہ:

یہ سورہ القارعہ ہے، اس کا پہلا ہی کلمہ القارعہ ہے، اس لیے اس کو القارعہ سے

موسوم کیا گیا۔

قرآن پاک کے آخری دو پاروں (۲۹/۱ اور ۳۰) کی اکثر سورتوں میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے قیامت کے خوفناک حالات کا تذکرہ کیا ہے، قیامت آئے گی اور وہ کس طرح آئے گی؟ پھر جنت کا، جنت کی راحتوں کا، جہنم کا، جہنم میں ہونے والے عذاب کا بڑا تفصیلی تذکرہ فرمایا ہے۔

## حبرائے مظالم سے روکنے والی:

آخرت کا فکر ہی ایک ایسی چیز ہے جو دنیا میں آدمی کو اللہ کے حکم کے مطابق چلنے پر آمادہ کرنے والا ہے۔ اگر دل و دماغ پر یہ فکر چھا جائے کہ مجھے اللہ تبارک و تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور اپنے اعمال کا جواب دینا ہے، تو پھر اس کی زندگی شریعت کے مطابق گزرتی ہے۔ قرآن یہ چاہتا ہے کہ آدمی کے دل و دماغ پر آخرت کا فکر غالب ہو۔ یہی وہ چیز ہے جو آدمی کو جرائم اور مظالم سے روکنے والی ہے۔

## غفلت: حبرائے مظالم کا اصل محرک:

دنیا میں جرائم اور مظالم کا سلسلہ کیوں ہے؟ لوگوں نے اس کے اسباب کے متعلق بڑی فلسفیانہ باتیں پیش کی ہیں۔ بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ ان جرائم کی اصل وجہ جہالت ہے۔ اگر تعلیم کو عام کیا جائے تو جرائم کا سلسلہ بند ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے وہ ممالک جہاں صد فی صد تعلیم ہے، وہاں بھی اسی طرح جرائم ہو رہے ہیں جیسے دوسرے ممالک میں۔ اگر ان جرائم کی وجہ جہالت اور تعلیم کا فقدان ہوتا، تو وہاں سے جرائم کا خاتمہ ہو جانا چاہیے تھا؛ لیکن ایسا نہیں ہے۔

بعض حضرات جرائم کی وجہ ”غربت“ کہتے ہیں۔ غربت کی وجہ سے آدمی مال حاصل

کرنے کے لیے نئے نئے طریقے اپناتا ہے، جرائم کا ارتکاب کرتا ہے، مظالم کا شکار ہوتا ہے۔ اگر غربت کو ختم کر دیا جائے تو جرائم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جن ممالک کی انفرادی آمدنی فی صد کے اعتبار سے سب سے زیادہ ہے، وہاں ان جرائم میں کوئی کمی نہیں؛ بلکہ دوسرے ممالک کے مقابلے میں وہاں جرائم کی مقدار زیادہ ہے۔ معلوم ہوا کہ غربت بھی جرائم کا اصل سبب نہیں ہے۔

اصل سبب آدمی کا آخرت کو بھلا دینا ہے۔ آدمی کی طبیعت پر آخرت کی جانب سے جو غفلت غالب آجاتی ہے اس کے نتیجے میں وہ ان ساری برائیوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اگر کسی کے دل میں آخرت کا خوف ہو، آخرت کا فکر ہو، دل و دماغ پر یہی چیز غالب ہو کہ مجھے مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، اپنے کرتوت اور اعمال کا جواب دینا ہے، تو وہ چیز آدمی پر بندش لگاتی ہے اور پہرہ بٹھاتی ہے۔ اور اس طرح یہ فکر آدمی کو غلط کام کرنے سے، جرائم و مظالم، بدعنوانیوں و بد اخلاقیوں کے ارتکاب سے بچالیتی ہے۔ اگر آدمی زیادہ پڑھا ہوا نہیں ہے، ان پڑھ ہے؛ لیکن اس کے دل میں آخرت کا فکر ہے تو یہی چیز اس کو تنہائیوں میں بھی گناہ اور ظلم کا ارتکاب کرنے سے روکے گی۔

### فَإِنَّ اللَّهَ... فَأَيْنَ اللَّهُ:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک مرتبہ مکہ مکرمہ کی جانب سفر کر رہے تھے، راستے میں ایک جگہ آپ نے شب باشی کی، وہاں ایک چرواہا پہاڑ سے آپ کے پاس آیا، آپ نے اس سے پوچھا کہ تیرے پاس بکریاں ہیں؟ اس نے کہا: جی! آپ نے فرمایا: ایک بکری مجھے بیچ دے، وہ کہنے لگا: میں غلام ہوں (یہ بکریاں میرے آقا کی ہیں) آپ نے فرمایا: آقا سے



کہہ دینا کہ بھیڑ یا بکری کھا گیا، تو وہ غلام چرواہا کہنے لگا: **فأین الله؟؟؟** (کیا یہ بات اللہ سے مخفی رہ سکتی ہے) حضرت عبداللہ بن عمرؓ یہ جملہ دہراتے رہتے تھے: **فأین الله..... فأین الله.....** اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ **فأین الله** تو مجھے کہنا چاہیے تھا، پھر جب آپ مدینہ منورہ لوٹے، تو آپ نے اس کے آقا کو کہلا بھیجا اور غلام خرید لیا، اور بکریاں بھی خرید لیں۔ پھر غلام کو آزاد کر کے ساری بکریاں اسے ہبہ کر دیں۔<sup>۱</sup> جب آدمی کے دل میں یہ فکر پیدا ہو جائے، تو چاہے کوئی نگرانی کرنے والا نہ ہو، یہ فکر ہی بہت بڑا پہرہ ہے جو اس کو ہر قسم کے گناہوں اور بد اخلاقیوں سے، مظالم سے، جرائم سے روک سکتا ہے۔ وہاں کسی دوسری تعلیم کی ضرورت نہیں کہ جس کا اس کے پاس سرٹیفکیٹ ہو۔ اور غربت کی حالت میں بھی یہ فکر ہی روکے گی۔ اس چرواہے کے پاس کون سا مال تھا؟ غربت کی حالت میں بھی وہ آدمی اپنے آپ کو ان چیزوں سے بچاتا ہے۔

## منہ دل بر..... ناپائیدار:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں آخری دونوں پاروں کی اکثر سورتوں میں قیامت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا کہ اللہ نے ہمیں جو دنیا کی زندگی عطا فرمائی ہے وہ دائمی نہیں ہے، بلکہ دنیا میں آخرت کی تیاری کے لیے چند دنوں کے واسطے بھیجا ہے، آزمائش کے لیے بھیجا ہے۔ تَبَرَّكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْهَبْلُكُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ الَّذِي خَلَقَ

(۱) الزهد لأبي داود: ۱/ ۲۶۲ [۲۹۳] (ط: دار المشكاة، حلوان) وقصر الأمل لابن أبي الدنيا: ۱/ ۱۲۸ (ط: دار ابن حزم، بيروت) والمعجم الكبير للطبراني: ۱۲/ ۲۶۳ [۱۳۰۵۳] (ط: مكتبة ابن تيمية، القاهرة) والشعب الإيمان للبيهقي: ۴/ ۲۲۳ [۲۹۰۸].

الْمَوْتُ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيْكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا <sup>ط</sup> (المائدہ: ۱۰۲) موت اور زندگی اللہ نے اس لیے پیدا کی کہ اللہ آزمانا چاہتے ہیں کہ تم میں کون اچھے اعمال کرنے والا ہے؟ یہ دنیا کی زندگی اسی آزمائش کے لیے ہمیں دی گئی ہے، یہ ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہ چیز ہمیشہ مد نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ نے ہمیں یہاں زندگی گزارنے کے اسباب بھی دیے، راحت و آرام کی شکلیں بھی دیں؛ لیکن یہ چیزیں ہمیشہ کی نہیں ہیں۔ آدمی یہاں آ کر آخرت سے غافل ہو کر اس بات کی کوشش میں رہتا ہے کہ میں کسی طرح زیادہ سے زیادہ راحت و آرام کے اسباب مہیا کر لوں، اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا لوں۔ اور وہ آخرت کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ یہ پتا نہیں کہ دنیا کی یہ زندگی کب تک ہے؟ جو لوگ دنیا سمیٹنے میں پڑے ہوئے ہیں ان کو بھی معلوم نہیں ہے کہ کب موت آ جائے گی؟ اس سے پہلے سورہ نکاح کی گزری اس میں زیادہ سے زیادہ مال سمیٹنے کی ہوس نے غافل کر دیا اس کا تذکرہ آچکا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو آدمی کو غفلت میں ڈالتی ہے، تو اس غفلت کو دور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں آخرت کا فکر پیدا ہو۔

ان دونوں پاروں کی سورتیں مکی دور میں نازل ہوئیں۔ شروع میں جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر ابتدائی وحی نازل فرمائی، لوگوں کو ایمان و اسلام کی دعوت دی گئی، ابھی شریعت کے دوسرے تفصیلی احکام نہیں آئے تھے، حلال و حرام کے احکام بھی نہیں آئے تھے لوگوں کے دلوں میں صرف آخرت کے یقین کو مضبوط کیا جا رہا تھا، اس وقت یہ سورتیں نازل ہوئیں۔ یقین ہی وہ چیز ہے جو آدمی کو ہر قسم کے جرائم سے بچاتا ہے۔ اسی لیے ان سورتوں میں اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اور آخرت و قیامت کے اور جنت کے حالات اس کی نعمتوں کی تفصیلات، جہنم کے حالات، اس کے عذاب کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

## .....تو انسان و جانور میں منرق نہیں:

اگر آخرت کا فکر نہ ہو تو انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ جیسے جانور کھاتے پیتے ہیں، انسان بھی کھاتے پیتے ہیں، جانور بھی پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں، انسان بھی پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں، گویا زندگی کا کوئی مقصد ہی نہ ہوگا۔ جانوروں کے لیے آخرت کا کوئی حساب کتاب نہیں ہے، ان کے لیے زندگی کا کائی خاص مقصد نہیں ہے؛ لیکن انسان کو تو اللہ تعالیٰ نے اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ آخرت کے لیے اعمال کرے۔ اور اگر آخرت کا فکر نہ ہو تو انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ تو اس فکر کو اپنی طبیعت اور اپنے دل و دماغ کے اوپر غالب کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

اور ہر کام یہ سوچ کر کیا جائے کہ کل مجھے اللہ کے حضور پیش ہونا ہے، اور اس کام کے متعلق جواب دینا ہے۔ کیا میں اللہ کی جانب سے اس کام کے متعلق کیے جانے والے سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں ہوں؟ یہ سوچ کر کوئی کام کرے گا تو کبھی بھی جرم اور ظلم کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ تو گویا سارے جرائم کی بنیاد آخرت سے غفلت ہے۔

## ترجمہ:

الْقَارِعَةُ (کھڑکھڑانے والی)

مَا الْقَارِعَةُ (کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی) کھٹکھٹانے والی، دل کو دہلانے والی؟

وَمَا أَذْرٰكَ مَا الْقَارِعَةُ (اور تم کو کیا معلوم کہ وہ دل دہلانے والی کیا ہے؟)

يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ. (یہ واقعہ اس دن پیش آئے گا جس دن لوگ

پر دانوں کی طرح پھیلے ہوئے ہوں گے)

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ. (اور پہاڑ دھنی ہوئی رنگین اون کی طرح ہوں گے)  
فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ. (جس کی ترازو میں وزنی ہوں گی، یعنی جس کے نیک  
اعمال زیادہ ہوں گے)

فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ (تو وہ من پسند زندگی میں ہوگا)  
وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ (اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے)  
فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ (تو اس کا ٹھکانا ہاویہ) (ایک گہرا گڑھا) ہوگا)  
وَمَا آذُنُكَ مَاهِيَةٌ (تمہیں کیا معلوم کہ وہ کیا ہے؟)  
نَارٌ حَامِيَةٌ (وہ دہکتی ہوئی آگ ہے) یعنی جہنم ہے۔

## تفسیر:

قرع - یقرع کے معنی کھٹکھٹانے کے ہیں، کھڑکھڑانا۔

عربی زبان کا ایک خاص انداز ہے، ہم اردو میں کما حقہ اس کی تعبیر نہیں کر سکتے۔  
جب قیامت آئے گی تو صور پھونکنے جانے کی ایک خوفناک آواز پیدا ہوگی، وہ ایسی خطرناک  
آواز ہوگی کہ اس سے لوگوں کے کلیجے پھٹ جائیں گے۔ اس کو القارعة سے تعبیر کیا جاتا ہے،  
دل دہلانے والی۔ یعنی جس کی آواز سن کر دل خوف میں مبتلا ہو جائیں گے، ڈر جائیں گے۔ تو  
القارعة: یعنی یاد کرو قیامت کو جو دل دہلا دینے والا اور کھڑکھڑانے والا ایک واقعہ ہے۔  
آگے اس کی تفصیل بیان کر رہے ہیں:

## کوئی ادھر کوئی ادھر:

يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ

بارش کے زمانہ میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ روشنی میں پروانے بڑی تعداد میں نکل آتے ہیں۔ اور ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ کوئی اوپر جا رہا ہے، کوئی نیچے جا رہا ہے، کوئی دائیں، کوئی بائیں، کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔ قیامت کے روز جب انسانوں کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا تو ان کا یہی حال ہوگا کہ کوئی ترتیب نہیں ہوگی۔ دائیں، بائیں، اوپر، نیچے ہر طرف کا رخ کیے ہوئے ہوں گے۔ گویا ان میں بے چینی اور خوف کی سی شکل ہوگی۔

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ.

یعنی اللہ تعالیٰ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیں گے۔ حالاں کہ پہاڑ اپنی سختی میں مشہور ہیں۔ کسی آدمی کی سختی میں مثال دینی ہو تو پہاڑ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ مثلاً: کوئی آدمی مشکلات برداشت کرنے میں بڑا صبر اور تحمل کا مظاہرہ کرتا ہے، تو لوگ کہتے ہیں کہ اس میں پہاڑ کی طرح استقامت ہے۔ لیکن ان ہی پہاڑوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بالکل دھنی ہوئی اون کی طرح بنا دیں گے۔ اس کے ذرات ہوا میں اڑ رہے ہوں گے۔

## خطرناک واقعہ:

ایک جگہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: وَهِيَ تَمْشِي مَرَّ السَّحَابِ. (النمل: ۸۸) جیسے بدلیاں فضا میں ادھر سے ادھر چلتی ہیں، اس طرح پہاڑ بھی چل رہے ہوں گے، فضا میں اڑ رہے ہوں گے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں: وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا. (طہ: ۱۰۵) (یہ لوگ پہاڑ کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہیے: میرا رب ان کو پیس کر کے رکھ دے گا) یہ سارے پہاڑ قیامت میں پیسی ہوئی ریت کی طرح ہو جائیں گے، اور دھنسنے ہوئے اون کی طرح اڑتے ہوں گے، گویا زمین بالکل سپاٹ ہو جائے گی۔ اسی کو آگے کہا گیا: فَيَذَرُهَا قَاعًا

صَفْصَفًا. (طہ: ۱۰۴) اب زمین سپاٹ ہو جائے گی۔ جب پہاڑوں کا یہ حال ہوگا تو اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیسا خطرناک واقعہ پیش آئے گا؟ اس موقع پر کیا ہوگا؟

فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ. موازن، میزان کی جمع ہے، بمعنی ترازو۔ یعنی جس کی ترازو نہیں بھاری اور وزنی ہوں گی وہ من پسند زندگی میں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک مختصر جملے عِيشَةِ رَاضِيَةٍ میں سب کچھ بیان کر دیا۔ اس دنیا میں کوئی بڑے سے بڑا حکمران ہو، بڑے سے بڑا مالدار ہو، صنعت کار ہو، کسی بڑے سے بڑے ملک کا سربراہ ہو؛ لیکن کوئی بھی آدمی دنیا میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ سب کچھ اس کے دل کی خواہش کے مطابق ہو رہا ہے۔ بلکہ بہت سی باتیں وہ ہیں جو اس کے دل کی مرضی کے خلاف ہیں۔ وہ چاہتا کیا ہے اور ہوتا کیا ہے؟ دنیا ہے ہی ایسی جگہ کہ وہاں آدمی کی پسند کے مطابق سب کچھ ہوتا نہیں ہے۔ بہت سی باتیں اس کی پسند کے خلاف ہوتی ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن کی ترازو نہیں، جن کے نیک اعمال غالب ہوں گے، وہ قیامت کے روز من پسند زندگی میں ہوں گے۔ یعنی ان کو اللہ تعالیٰ جنت میں بھیجیں گے۔

## جنت کا حال:

حدیث شریف میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے جنت میں ایسی نعمتیں ہیں: مَا لَا عَيْن رَأَتْ وَلَا أَذْنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ. (ایسی نعمتیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی کے دل میں اس کا خیال گزرا) اور قرآن میں باری تعالیٰ فرماتے

(۱) مسند الحمیدی: ۴۷۹، ۱۱۶ (ط: دار السقاء، دمشق، سوریا) و مسند أحمد: ۹۶۳۹، ۲۲۸۲۶ (ط: مؤسسة الرسالة) و

صحیح البخاری: ۳۲۳۲، ۴۷۹، ۴۸۰ (ت: محمد فؤاد عبد الباقی) و صحیح مسلم: ۳۱۲ [۱۸۹]، ۴، ۵، ۲۸۲۴

(ت: محمد فؤاد عبد الباقی) و سنن الترمذی: ۳۱۹۷، ۳۲۹۲ (ط: مکتبۃ الحلبي، مصر).

ہیں: وَ لَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهُۥٓ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ. (حم السجدة: ۳۱) تمہارا جی جو چاہے گا ایسی من پسند چیزیں وہاں ملیں گی (دنیا میں کوئی آدمی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جو اس کا من چاہتا ہے وہ مل جاتا ہے۔ جنت میں جو مانگو گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب دیا جائے گا۔ دنیا کی زندگی ایسی ہے کہ یہاں کی راحت کے ساتھ تکلیف لگی ہوئی ہے، یہاں کی خوشی کے ساتھ غم کا کٹا لگا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بناوٹ ہی ایسی رکھی ہے۔ دیکھیے! آپ کھانے بیٹھے ہیں، دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے ہیں۔ کھانا کھا رہے ہیں؛ لیکن آپ کو کھٹکا لگا ہوا ہے کہ کہیں زیادہ مقدار میں کھانا پیٹ میں پہنچ گیا تو بد ہضمی ہو جائے گی۔ اس چیز کے کھانے کی وجہ سے کہیں کوئی نقصان اور بیماری نہ ہو جائے۔ اسی طرح ہر نعمت کے ساتھ کوئی نہ کوئی غم اور فکر لگا ہوا ہے۔ اور جنت کا حال یہ ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (یونس: ۶۲) (جنتیوں پر نہ تو کوئی خوف ہوگا، نہ ان کو کوئی غم) نہ آئندہ کا کوئی فکر، نہ ماضی کا کوئی غم، وہ ان سب چیزوں سے بے فکر ہوں گے۔ جبکہ دنیا میں آدمی پر یہ ساری چیزیں غالب ہوا کرتی ہیں۔ گویا تم اگر ایسی من پسند زندگی چاہتے ہو تو تم کو جنت میں ملے گی۔ اس کے لیے آپ کو دنیا میں نیک اعمال کا اہتمام کرنا ہے۔ ایسے نیک اعمال جن کی وجہ سے تمہاری ترازو میں وزنی ہو جائیں۔

## من پسند زندگی گزارنے کی جگہ:

دیکھو! دنیا کی تکلیف خالص تکلیف نہیں ہے، اور دائمی تکلیف بھی نہیں ہے۔ جیسے راحت خالص اور دائمی نہیں ہے؛ بلکہ راحت کے ساتھ تکلیف کا بھی کٹا لگا ہوا ہے۔ اسی طرح تکلیف بھی خالص تکلیف نہیں ہے۔ جیسے کوئی بیماری آگئی تو اس کا علاج کرنے والا

طبییب موجود ہے، دوائیں موجود ہیں، آپ کی عیادت کرنے والے آپ کے دوست و احباب موجود ہیں، خدمت کرنے والے آپ کے رشتہ دار موجود ہیں۔ اور جہنم میں کوئی پوچھنے والا ہے؟ جہنم میں جو تکلیف ہوگی تو اس تکلیف کا نہ کوئی علاج ہے، نہ اس کی کوئی دوا ہے، نہ وہاں آپ کو کوئی تسلی دینے والا ہے، نہ کوئی آپ کی خبر لینے والا ہے۔ یہاں دنیا میں تو اللہ تعالیٰ نے ان تکلیفوں میں بھی راحت کے سامان مہیا کیے ہیں۔ گویا جہنم کی تکلیف خالص تکلیف ہے۔ اس میں راحت کی کوئی ملاوٹ نہیں ہے۔ اور جنت کی راحت، خالص راحت ہے، اس میں تکلیف کی ملاوٹ نہیں ہے۔ جبکہ دنیا میں دونوں باتیں ہیں: دنیا کی تکلیف نہ خالص تکلیف ہے، اس کے ساتھ راحت کے اسباب ہیں۔ اور دنیا کی راحت نہ خالص راحت ہے؛ بلکہ اس میں تکلیف کی ملاوٹ ہے۔

بہر حال! کوئی آدمی من پسند زندگی دنیا میں تو گزار رہی نہیں سکتا، وہ تو آخرت میں، جنت ہی میں مل سکتی ہے۔ لہذا اس کو چاہیے کہ اس کی تراز و وزنی اور بوجھل ہوں اس کا اہتمام کرے۔ کیسے بوجھل ہوں گی؟ وہ آگے ان شاء اللہ بتائیں گے کہ کن اعمال سے تراز و بوجھل بنیں گی؟

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورہ فاترۃ

(قط-۲)

(مؤرخہ: ۲۹/ربیع الآخر، ۱۴۴۰ھ - مطابق: ۵/جنوری ۲۰۱۹ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل  
عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله  
من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له  
ومن يضلل الله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك  
له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة  
الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله  
تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً .  
أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم ۝ بسم الله الرحمن الرحيم ۝

الْقَارِعَةُ ۝۱ مَا الْقَارِعَةُ ۝۲ وَمَا أَذْرِكْ مَا الْقَارِعَةُ ۝۳ يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ۝۴  
وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ ۝۵ فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ۝۶ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ۝۷  
وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۝۸ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ۝۹ وَمَا أَذْرِكْ مَا هِيَ ۝۱۰ نَارُ حَامِيَةٍ ۝۱۱

## ترجمہ:

سورہ القارعة چل رہی تھی، پھر سے ایک مرتبہ اس کا ترجمہ کر دیتے ہیں۔

الْقَارِعَةُ (کھڑکھڑانے والی)

القارعة یہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ جو بھیانک آواز نکلے گی، سب کے دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دے گی، جس کی وجہ سے دل دہل جائیں گے، اسی کو کھڑکھڑانے والی فرما رہے ہیں۔

مَا الْقَارِعَةُ (کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی؟)

وَمَا أَذْرُكَ مَا الْقَارِعَةُ (اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ کھڑکھڑانے والی کیا ہے؟)

يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ (جس دن (اس کی ہیبت کی وجہ سے) تمام لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہو جائیں گے)

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعُفُوسِ (اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے)۔

فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ، فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ (پس! جس شخص کے پلڑے وزنی ہوں گے، وہ من پسند زندگی میں ہوگا)۔

وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ، فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ (اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے، تو اس کا ٹھکانا ایک گہرا گڑھا ہے)۔

وَمَا أَذْرُكَ مَا هِيَّةُ (اور تم کو کیا معلوم کہ وہ گہرا گڑھا کیا ہے؟)

نَارٌ حَامِيَةٌ (دہکتی ہوئی آگ ہے)۔

## گزشتہ سے پیوستہ:

بتلایا گیا تھا کہ جن لوگوں کے پلڑے وزنی ہوں گے، وہ اپنی من پسند زندگی میں ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز اعمال کا وزن ہوگا۔ علماء فرماتے ہیں

کہ اعمال کی گنتی نہیں ہوگی کہ کتنے اعمال کیے؟ بلکہ اعمال کا وزن ہوگا۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: وَنُضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَمَةِ (الانبیاء: ۴۷) (ہم قیامت کے روز انصاف کی ترازوئیں قائم کریں گے) جس میں انسانوں کے اعمال کو تولایا جائے گا۔ ہم جو عمل کرتے ہیں وہ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی عمل کیا اور ختم ہو گیا، مٹ مٹا گیا؛ نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔ آدمی جو بھی عمل کرتا ہے وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے وہاں محفوظ رہتا ہے، اور کل قیامت کے روز باقاعدہ تولایا جائے گا۔ ہر عمل کو اللہ نے ایک وزن عطا فرمایا ہے۔ بہت سے اعمال وزنی ہیں، بعض اعمال بغیر وزن کے ہیں۔ یہاں بتلایا جا رہا ہے کہ جن کے اعمال وزنی ہوں گے وہ اپنی من پسند زندگی میں ہوں گے۔

## ..... اب اشکال ختم ہو گیا:

اب اعمال کو کیسے تولایا جائے گا؟ قدیم زمانے میں تو یہ ایک اشکال کی چیز تھی، لوگ سوال کرتے تھے کہ اعمال کا اپنا کوئی جسم نہیں ہے، پھر ان کو ترازو کے پلڑے میں رکھ کر کیسے تولایا جائے گا؟ یہ اُس زمانے کی بات ہے۔ اب تو سائنس کی ترقیوں کے نتیجے میں ایسی ایسی چیزیں ناپی اور تولی جاتی ہیں جن کا کوئی جسم نہیں ہے۔ اُس زمانے میں لوگ یوں سمجھتے تھے کہ جسم والی چیز ہی کو تولایا جاسکتا ہے، بغیر جسم والی چیز میں یہ صورت ممکن نہیں ہے۔ لیکن اب تو حرارت و برودت کو ناپا جاتا ہے۔ گرمی اور سردی کو ناپا جاتا ہے۔ آدمی کے بخار کو بھی ناپا جاتا ہے، آواز کو ناپا جاتا ہے۔ خون کا دباؤ (پریشر)، خون کا شوگر، خون کا کالسیٹریول ناپا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر وہ چیز ناپی جاتی ہے جس کا کوئی جسم نہیں ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اپنی محدود عقل اور محدود طاقت و قدرت کے ذریعے ایسے آلات بنا سکتا

ہے، جن سے ان چیزوں کو ناپا اور تولا جاسکتا ہے، تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے تو پوری کائنات کو پیدا کیا، انسانوں کو پیدا کیا اور انسان کے اعمال کو بھی پیدا کیا۔ کیا وہ اس بات کی قدرت نہیں رکھتا کہ وہ انسانوں کے اعمال کو تولے؟ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز باقاعدہ ترازو قائم کریں گے، اور لوگوں کے سامنے یہ سلسلہ ہوگا، اور ان ترازوؤں کے ذریعے فیصلہ ہوگا۔

## ترازو کیوں قائم کریں گے.....؟؟؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو قدیم زمانے میں بعض گمراہ فرقوں نے قائم کیا تھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ تو سب جانتے ہیں، تو پھر اللہ کو ترازوئیں لگا کر اعمال تولنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے علم کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ کو سب کچھ معلوم ہے کہ کس کے اعمال وزنی ہیں اور کس کے اعمال ہلکے ہیں؛ لیکن قیامت کے روز اللہ تبارک و تعالیٰ میدان محشر میں جو فیصلے کریں گے، وہ اس انداز سے کریں گے کہ لوگوں کو انصاف ہوتا ہوا نظر آئے گا۔ یہ دیکھ کر ہر آدمی اپنے متعلق خود فیصلہ کر لے گا، اس کو کچھ کہنا نہیں پڑے گا، وہ اپنے مجرم ہونے کو خود ہی محسوس کر لے گا کہ میرے اعمال وزنی ہیں یا ہلکے ہیں؟ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے متعلق جو فیصلہ کیا جا رہا ہے اس کے متعلق وہاں کھل کر ایسی صورتیں پیدا کی جائیں گی کہ انسان کو خود اس فیصلے کا اقرار کرنا پڑے گا، گویا انصاف ہوتا ہوا نظر آئے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ یہ ترازوئیں قائم کریں گے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ اپنے طور پر فیصلہ کر لیں، وہ جانتے ہیں کس کے اعمال میں کتنا وزن ہے؟ کوئی اشکال کی چیز نہیں تھی؛ لیکن قیامت کے روز باقاعدہ گواہ پیش کیے جائیں گے، وہ گواہی دیں گے، اور فیصلہ ہوگا۔

## عمل کا وزن دیکھیں:

جس طرح دنیا کی عدالتوں میں مجرم کے خلاف گواہ پیش کیے جاتے ہیں۔ خود جج یا قاضی کو کسی آدمی کا مجرم ہونا معلوم ہو تب بھی باقاعدہ کیس اور مقدمے کی کارروائی ہوتی ہے، گواہ پیش ہوتے ہیں، گواہی دیتے ہیں، ان کی گواہی کے بعد اس گواہی کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے؛ تاکہ مجرم کو بھی اپنا مجرم ہونا معلوم ہو جائے۔ تو قیامت کے روز گواہیاں بھی لی جائیں گی، اعمال کو تولد جائے گا، اس کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ کیا جائے گا اس لیے اپنے اعمال میں وزن پیدا کرنے کا اہتمام کریں۔ ہم یہ نہ دیکھیں کہ کتنا عمل کیا؟ گنتی نہ کریں۔ بلکہ اس عمل میں وزن ہے یا نہیں؟ یہ ہمیں دیکھنا ہے۔

## وزن کیسے پیدا ہو.....؟؟؟:

اب وہ کون سی چیزیں ہیں جن سے عمل میں وزن پیدا ہوتا ہے؟ تو تین چیزیں ایسی ہیں جن سے عمل میں وزن پیدا ہوتا ہے: (۱) ایمان۔ (۲) صدق: یعنی سنت و شریعت کے مطابق ہونا۔ (۳) اخلاص۔

## (۱) ایمان:

ایمان کی وجہ سے اعمال میں وزن پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں کافر بھی بہت سے اچھے اچھے کام کرتے ہیں۔ بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں، پیاسوں کو پانی پلاتے ہیں، ہنگوں کو کپڑا پہناتے ہیں، بیماروں کے علاج کا انتظام کرتے ہیں، بڑے بڑے ہسپتال قائم کرتے ہیں وہاں مفت علاج ہوتا ہے، کسی سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا جاتا۔ کوئی قدرتی مصیبت، آفت آتی ہے تو بڑے بڑے رفاہی کام بھی کرتے ہیں۔ یہ سارے اچھے اچھے اعمال ہیں؛ لیکن کفر کی

وجہ سے ان کے ان سارے اعمال میں قیامت کے روز کوئی وزن نہیں ہوگا۔ اتنا ضرور ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کے ان اچھے اعمال کا بدلہ نیک نامی کی شکل میں، روزی میں زیادتی کی شکل میں اور دوسری شکلوں میں دنیا ہی میں عطا فرمائیں گے؛ لیکن آخرت میں ان کے عمل کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ چنانچہ قرآن پاک میں باری تعالیٰ نے اس چیز کو بتلایا ہے:

وَقَدْ مَنَّآ إِلَىٰ مَاعِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنْثُورًا (الفرقان: ۲۳) (قیامت کے روز، ہم کفار کے اعمال کی طرف ان کا فیصلہ کرنے کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کے اعمال کو ہم ہوا میں اڑتے ہوئے ذرات کی طرح بنادیں گے) یعنی ان میں کوئی وزن نہیں ہوگا، جیسے ہوا میں اڑنے والے ذرات کا کوئی وزن نہیں ہوتا ایسے ہی کافروں کے اعمال کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ایمان نہیں تھا۔

## ایمان کے بغیر وزن نہیں:

اسی طرح سورہ کہف میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا. الَّذِينَ صَلَّوْا سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا. أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَزْنًا. (الکہف: ۱۰۵)

(اے نبی! آپ کہہ دیجیے! میں تم کو بتلاؤں وہ لوگ جو اپنے اعمال میں گھائے اور نقصان میں ہیں؟ جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں بے کار اور اکارت گئیں؛ اور وہ یوں سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی اچھا کام کر رہے ہیں۔ (وہ کون ہیں؟) جنہوں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی آیات کو جھٹلایا، اس کی ملاقات کو بھی جھٹلایا۔ ہم قیامت کے دن ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے) تو اعمال میں وزن کے لیے پہلی شرط ایمان ہے۔ ایمان کے بغیر اعمال میں

وزن پیدا نہیں ہوگا۔

## (۲) صدق:

اعمال میں وزن پیدا کرنے کے لیے دوسری شرط صدق ہے۔ صدق کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی عمل کیا جائے سنت اور شریعت کے مطابق ہو۔ نبی کریم ﷺ نے عمل کرنے کا جو طریقہ بتلایا ہے، اگر اس کے مطابق عمل کو انجام دیا جائے گا تب تو اس میں وزن ہوگا، اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ قبولیت حاصل کرے گا۔ ورنہ ظاہری اعتبار سے کوئی کتنا ہی اچھا کام کر رہا ہو؛ لیکن وہ نبی کریم ﷺ کے طریقے کے مطابق نہیں ہے تو اس کے عمل میں وزن نہیں ہوگا۔ اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے۔ نماز کتنا اچھا عمل ہے!!! نماز کو حدیث شریف میں دین کا ستون قرار دیا گیا، اور دین میں نماز کی بہت اہمیت بیان کی گئی۔ اللہ ہی کے لیے نماز پڑھ رہا ہے؛ لیکن نماز کا جو طریقہ نبی کریم ﷺ نے بتلایا اس کے مطابق نماز نہیں پڑھتا۔ فجر کی نماز دو کے بجائے چار رکعت پڑھی کہ ڈبل پڑھوں، ارے بھائی! تو ڈبل پڑھے گا تو وہ دو رکعت پر جو ثواب ملتا ہے وہ بھی نہیں ملے گا۔ تو ہمیں نبی کریم ﷺ کے طریقے کے مطابق ہر عمل کرنا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے حضرات صحابہؓ کو طریقہ بتلا کر باقاعدہ ہدایت فرمائی: **صلوا کما رأيتموني أصلي**۔ (مجھے جس طرح نماز پڑھتا ہوا دیکھو، اس کے مطابق نماز پڑھو) اگر ہماری نماز اس طریقے کے مطابق نہیں ہے تو ہماری نماز میں کوئی وزن نہیں ہوگا۔

(۱) مسند الشافعی: ۲۹۴ (ط: شركة غراس، الكويت) وصحيح ابن حبان: ۱۶۵۸ (ط: مؤسسة الرسالة، بيروت) وسنن الدار قطنی: ۱۰۶۹ (ط: مؤسسة الرسالة، بيروت) والسنن الكبرى للبيهقي: ۳۸۵۵ و ۳۸۵۶ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت).  
Copyright © http://www.muftiahmedkhanpuri.com/

## تعدیل ارکان:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ مسجد میں تشریف فرما ہیں، ایک دیہاتی صحابی آئے اور دو رکعت ادا کی۔ پھر نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، آپ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے۔ حضور ﷺ کو سلام کیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **وعلیک السلام ارجع فصل فانک لم تصل**۔ (واپس جاؤ! نماز پڑھو، اس لیے کہ تم نے نماز نہیں پڑھی) پھر گئے، پھر نماز پڑھی، پھر آکر سلام کیا۔ پھر نبی کریم ﷺ نے اسی طرح فرمایا۔ تیسری مرتبہ بھی ایسا ہوا تو آخر میں ان صحابیؓ نے عرض کیا: اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے آپ بتلایئے کہ میں کس طرح نماز پڑھوں؟ پھر نبی کریم ﷺ نے بتلایا: پہلے تکبیر کہہ کر نماز شروع کرو، اور قیام اطمینان اور سکون کے ساتھ کرو، قراءت کرو۔ پھر رکوع میں جاؤ، اطمینان اور سکون کے ساتھ رکوع کرو۔ پھر رکوع سے اٹھو، اطمینان اور سکون سے قومہ کرو، اس کے بعد سجدہ میں جاؤ، سجدہ بھی اطمینان اور سکون کے ساتھ کرو۔ پھر اٹھو، اور جلسہ۔ دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا۔ بھی اطمینان سے کرو، پھر دوسرا سجدہ کرو۔ آپ ﷺ نے پورا طریقہ بتلایا۔<sup>(۱)</sup> جس کو فقہا تعدیل ارکان سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی نماز کے ہر رکن کو قیام، رکوع، قومہ، جلسہ سجدہ ہر ایک کو اطمینان اور سکون کے ساتھ ادا کیا جائے۔ اگر اس طرح ادا نہیں کیا جائے گا تو یہ نماز درست نہیں ہوگی۔

(۱) مسند أحمد: ۹۶۳۵ و ۱۸۹۹۷ و صحیح البخاری: ۵۵۷ و ۷۹۳ و ۲۲۵۱ و ۲۶۶۷ و سنن أبی داود: ۸۵۶ و سنن الترمذی:



## بدعت وزن سے خالی:

اسی طرح بہت سے اعمال ظاہر میں اچھے معلوم ہوتے ہیں؛ لیکن نبی کریم ﷺ نے یا قرآن نے اس کا حکم نہیں دیا، جس کو بدعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بہت سے ایسے اعمال رواج پا گئے ہیں، جیسے کسی کی موت کے بعد تیسرے دن باقاعدہ دعوت کی جاتی ہے، لوگ جمع ہوتے ہیں، قرآن پڑھتے ہیں، ایصال ثواب کرتے ہیں، کھانا کھلایا جاتا ہے۔ دیکھنے میں تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے؛ لیکن اپنے لیے انہوں نے جن چیزوں کو لازم قرار دے دیا یعنی وقت مقرر کر دیا وغیرہ، یہ ساری چیزیں شریعت کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق نہیں ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه فهو رد**۔ (ہمارے اس دین میں جنہوں نے کسی نئی بات کو ایجاد کیا وہ اس پر واپس کر دی جائے گی) **امردود ہے، لوٹا دی جائے گی۔ کل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة وكل ضلالة في النار**۔ (ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں جائے گی)<sup>۱</sup> تو بہت سے اعمال جو ہمارے معاشرے میں ہوتے ہیں جیسے: تیجہ، دسواں، چالیسواں طرح کے اعمال بظاہر دیکھنے میں اچھے معلوم ہوتے ہیں؛ لیکن چوں کہ نبی کریم ﷺ کے طریقے سے ہٹ کر ہیں، ان میں صدق والی صفت نہیں پائی جاتی، اس لیے ان پر کوئی ثواب نہیں ملے گا اور ان اعمال کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ بدعت وزن سے خالی ہے۔

(۱) مسند أحمد: ۲۶۰۳۳، ۲۶۳۲۹ وصحیح البخاری: ۲۶۹۷ وصحیح مسلم: ۱۷ [۱۷۱۸] وسنن أبي داود: ۴۶۰۶ وسنن ابن ماجہ: ۱۴۔

(۲) مسند أحمد: ۱۷۱۴۵، ۱۷۱۴۵ وسنن أبي داود: ۴۶۰۷، ۴۶۰۸ والبدع لابن وضاح القرطبي: ۵۶، ۵۷ والسنة لابن أبي عاصم: ۲۵۔

## کھانا تو ہمیں بھیجنا چاہیے:

دیکھو! اس موقع پر کھانا کھلاتے ہیں۔ جب کہ میت ہوئی ہے اور وہ لوگ کھانا کھلاتے ہیں۔ حالاں کہ غزوہ موتہ کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ کے پاس حضرت جعفرؓ کی موت کی خبر آئی تو حضور ﷺ نے ہدایت کی کہ ان کے گھر والوں کے لیے کھانا بناؤ، کیوں کہ وہ غم میں مشغول ہیں۔<sup>۱</sup> تو کھانا تو ہمیں بھیجنا چاہیے، اس کے بجائے لوگ میت کے گھر جا کر کھانا کھاتے ہیں!!!

## سنت و بدعت، عالم امثال میں:

ہمارے بزرگوں میں ایک بزرگ حضرت شاہ یاسین صاحب نگینویؒ گزرے ہیں۔ جو حضرت گنگوہیؒ کے خلفاء میں سے ہیں۔ حضرت شیخؒ نے فضائل اعمال کے مقدمے میں ان کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ان کے ایک خلیفہ تھے شاہ عبدالعزیز صاحب دعا جو۔ حضرت شیخؒ نے فضائل درود کے مقدمے میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے فضائل کی کتابوں کی تالیف کے سلسلے میں حضرت شیخؒ سے فرمایا تھا، حکایات صحابہؓ کو حضرت شیخؒ نے ان ہی کی تاکید پر تالیف فرمایا تھا۔ انہوں نے درود کے متعلق بھی تاکید فرمائی تھی؛ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی تھی، تو اپنے خلیفہ شاہ عبدالعزیز صاحب دعا جوؒ کو وصیت کی تھی کہ حضرت شیخؒ سے بار بار کہیں۔ چنانچہ حضرت شیخؒ نے فضائل درود کے مقدمے میں تذکرہ کیا ہے کہ انہوں نے یاد دہانی کروائی، پھر حضرت شیخؒ نے فضائل درود تالیف فرمائی۔ تو حضرت شاہ عبدالعزیز

(۱) مسند أحمد: ۴۵۱ / وسنن أبي داود: ۳۱۳۲ / وسنن ابن ماجه: ۶۱۰ / وسنن الدارقطني: ۱۸۵۰، ۱۸۴۹ / والمستدرک

صاحب دعا جو کے متعلق مفتی محمد تقی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ دعوت و تبلیغ کے بزرگوں میں سے تھے۔ ایک مرتبہ کراچی میں مفتی محمد شفیع صاحب کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ حضرت میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ حضرت نے پوچھا کہ کیا خواب دیکھا؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ: ایک تختہ سیاہ (بلیک بورڈ) ہے، آپ کھڑے ہیں، پہلے آپ نے اس پر ایک کا عدد (۱) لکھا، پھر اس کی دائیں طرف صفر لگایا (۱۰)، پھر پوچھا: یہ کیا ہے؟ کہنے لگے: یہ دس ہے۔ پھر دوسرا لگایا (۱۰۰)، پھر کہا: یہ کیا ہے؟ سب نے کہا: یہ سو (۱۰۰) ہے۔ پھر تیسرا لگایا (۱۰۰۰)، کہا: یہ کیا ہے؟ تو سب نے کہا: یہ ہزار (۱۰۰۰) ہے۔ چوتھا لگایا کہ یہ دس ہزار (۱۰۰۰۰) ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جتنے بھی صفر بڑھاتے جائیں گے اتنی ہی اس کی قیمت میں دس دس گنا اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس کے بعد اس کو مٹا کر پھر ایک (۱) لکھا، اور اس کی بائیں طرف صفر (۰۱) لگایا، اور پوچھا: یہ کیا ہے؟ کہا کہ یہ صفر اعشاریہ ایک یعنی یہ دسواں حصہ ہے۔ پھر دوسرا صفر لگایا (۰۰۱)، اور کہا یہ صفر صفر اعشاریہ ایک ہے یعنی یہ سوواں حصہ ہے۔ پھر تیسرا صفر (۰۰۰۱) لگایا کہ یہ کیا ہے؟ کہا کہ صفر صفر صفر اعشاریہ ایک یعنی ہزار (۱۰۰۰) واں حصہ ہے۔ تو بائیں طرف جتنے بھی صفر لگاتے جاؤ گے، قیمت اتنی ہی کم ہوتی جائے گی۔ دائیں طرف جتنے لگاتے جاؤ گے اتنی قیمت بڑھتی جائے گی۔ فرمایا سنت کی مثال ایسی ہے جیسے دائیں طرف صفر لگ رہے ہیں، اور بدعت کی مثال ایسی ہے جیسے بائیں طرف صفر لگ رہے ہیں۔ مفتی محمد تقی صاحب اپنے بہت سے مواضع میں اس کو بدعت کی مثال میں پیش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بدعت والا عمل ظاہری اور دیکھنے کے اعتبار سے کتنا ہی اچھا عمل کیوں نہ ہو؛ لیکن اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب نہیں ہے، اس میں وزن نہیں ہوتا۔ وزن تو سنت و شریعت کی ہدایت کے مطابق عمل کرنے پر ہوتا ہے۔ تو اعمال میں وزن پیدا

کرنے کے لیے دوسری شرط صدق یعنی اس عمل کا سنت و شریعت کے مطابق ہونا ہے۔

### (۳) اخلاص:

اعمال میں وزن پیدا ہونے کے لیے تیسری شرط اخلاص ہے۔ یعنی وہ عمل اللہ کے واسطے اور اس کو راضی کرنے کے لیے کیا جائے۔ لوگوں کو دکھلانے کے لیے کہ ہماری بڑائی ہوگی، لوگ ہمیں اچھا سمجھیں گے اور شہرت و ریاکاری کے لیے نہ ہو؛ بلکہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہو تو اس عمل میں وزن ہوگا۔ مان لو کہ ایک آدمی نوافل نہیں پڑھتا، فرائض، واجبات اور سنن مؤکدہ پر اکتفا کرتا ہے؛ لیکن وہ سب خالص اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے، تو چاہے اس نے نوافل کا اہتمام نہ کیا ہو، اس کے اعمال میں وزن ہوگا۔ اور اس کے برخلاف کوئی دوسرا آدمی، جو خوب نوافل پڑھتا ہے؛ لیکن دل میں یہ ہے کہ لوگ مجھے اچھا سمجھیں، شہرت اور نام آوری کے لیے کر رہا ہے، تو اس کے اعمال میں کوئی وزن نہیں ہوگا۔ الغرض جو عمل خالص اللہ کو راضی کرنے کے لیے اور اخلاص کے ساتھ کیا جائے، چاہے چھوٹا عمل ہو تب بھی اس میں وزن ہوگا۔

### کتے کو پانی پلانے پر مغفرت:

بخاری شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی جنگل سے گزر رہا تھا، اس کو پیاس لگی، اس نے وہاں ایک کنواں دیکھا؛ لیکن وہاں رسی ڈول نہیں تھی، کچا کنواں تھا، اس کی دیواروں میں خانے بنے ہوئے تھے، وہ نیچے اترا، اور پانی پی کر اپنی پیاس بجھائی۔ پھر جب باہر آیا تو دیکھا کہ وہاں ایک کتا گیلی مٹی چاٹ رہا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ میں پیاس کی شدت بھگت چکا ہوں اور کتا بھی اسی شدت سے دوچار ہے، اس نے سوچا کہ میں اس کو پانی

پلاؤں۔ ڈول رسی تو تھی نہیں، البتہ اس کے پاؤں میں چمڑے کے موزے تھے، اس نے وہ نکالے اور پھر کنویں میں جا کر موزے میں پانی بھرا، اور موزوں کو دانتوں سے دبایا۔ کیوں کہ ہاتھ اور پاؤں تو اوپر چڑھنے کے لیے استعمال کرنے تھے۔ خیر! اس نے باہر آ کر کتے کو پانی پلایا۔ توحید شریف میں ہے: **فشکر اللہ لہ وغفر لہ**۔ (اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کے اس عمل کی قدر فرمائی، اور اس کی مغفرت کا فیصلہ فرمادیا) <sup>۱</sup> یہ دیکھنے کے اعتبار سے تو بہت چھوٹا عمل ہے کہ پانی پلایا، وہ بھی جانور کو، اور وہ جانور بھی ایک کتا، جس کو لوگ دھتکارتے ہیں، اپنے پاس نہیں آنے دیتے؛ لیکن اس نے نیک عمل خالص اللہ کے واسطے کیا تھا، تو اللہ کے ہاں اس کی قدر یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمائی، اور اس کے لیے جنت کا فیصلہ کر دیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہاں اخلاص تھا، کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ ظاہر ہے وہاں کے جو حالات تھے وہ اس بات کے متقاضی تھے کہ اس نے یہ عمل خالص اللہ کے لیے کیا ہے۔ تو جو عمل اللہ کے لیے ہو، چاہے چھوٹے سے چھوٹا عمل ہو، لیکن اللہ کے ہاں اس کی بڑی قدر ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: **لا تحقرن من المعروف شیئاً**۔ (نیکی کے کسی بھی کام کو حقیر مت سمجھو) <sup>۲</sup> بس! خالص اللہ کے لیے ہونا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: **الإيمان بضع وسبعون شعبةً أفضلها لا إله إلا الله وأدناها إمطة الأذى عن الطريق**۔ (ایمان کی ستر (۷۰) سے زیادہ شاخیں ہیں، ان میں سب سے اعلیٰ شاخ کلمہ لا إله إلا الله

(۱) صحیح البخاری: ۱۷۳، ۶۵۲، ۲۳۶۳، ۲۴۶۶، ۲۴۷۲، ۶۰۰۹۔

(۲) مسند ابن الجعد: ۳۱۰۰ و مسند أحمد: ۱۵۹۵۵، ۲۰۶۳۳، ۲۰۶۳۵، ۲۰۶۳۹، ۲۱۵۱۹ و صحیح مسلم: ۱۳۲ [۲۶۲۶] مسند

البرزار: ۳۹۶۲ و المعجم الكبير للطبرانی: ۶۳۸۳، ۶۳۸۵، ۶۳۸۸۔

ہے، اور سب سے ادنیٰ راستے سے کسی تکلیف دینے والی چیز کو ہٹانا ہے) راستے میں کانٹا، پتھر، کیلے کا چھلکا وغیرہ چیزیں پڑی ہیں، آپ نے دیکھا کہ کسی کا پاؤں اوپر پڑے گا تو پھسل کر گر جائے گا، آپ نے چپکے سے اس کو کنارے کر دیا۔ تو عمل چھوٹا سا ہے؛ لیکن اگر خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی بڑی قدر ہے۔

## ٹہنی ہٹانے پر جنت کا فیصلہ:

بخاری شریف میں ایک اور قصہ ہے کہ ایک آدمی گزر رہا تھا، راستے میں ایک خاردار ٹہنی تھی، جو گزرنے والوں کے لیے رکاوٹ کا سبب تھی، اس نے وہاں سے وہ ٹہنی ہٹا دی، تاکہ اللہ کے بندوں کو تکلیف نہ ہو۔ اس بات پر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جنت کا فیصلہ فرما دیا۔<sup>۲</sup>

## نیک نیکی کو پہنچتی ہے:

تو نیکی کا عمل دیکھنے میں چاہے چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو، خالص اللہ کے لیے ہو تو بڑا وزنی ہے۔ اور یہی نیکی دوسری نیکی کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ نیکی کی خاصیت ہے کہ آپ نے اگر خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی عمل انجام دیا ہے تو اس کی برکت یہ ہوگی کہ آپ کو اللہ تعالیٰ دوسری نیکی کی توفیق عطا فرمائیں گے۔

(۱) مسند أبي داود الطيالسي: ۲۵۲۳ والأدب المفرد: ۵۹۸ وسنن الترمذي: ۲۶۱۴ وسنن ابن ماجه: ۵۷ و تعظيم قدر

الصلاة للمروزي: ۷۹۸ ومكارم الأخلاق للخرائطي: ۳۰۳ وصحيح ابن حبان: ۱۹۰، ۱۹۱ وغیرہا۔

(۲) صحيح البخاري: ۲۵۲، ۲۴۷۲۔

## واردِ روحانی کی کرو مت دردانی:

جب دل میں نیک کام کرنے کا ارادہ اور خیال آئے، تو اس کو حضرات صوفیاء فرماتے ہیں کہ یہ واردِ روحانی ہے۔ یعنی نیک کام کرنے کا خیال اللہ نے دل میں ڈالا ہے، تو اب آپ اس کی قدر کر لیجیے، یہ اللہ کا بھیجا ہوا مہمان ہے۔ اس خیال آنے پر فوراً وہ کام کر لو۔ اگر آپ اس کی طرف توجہ نہیں کریں گے..... تو جیسے کوئی شریف آدمی آپ کے گھر مہمان آیا، دروازہ کھٹکھٹایا، گھنٹی بجائی؛ لیکن آپ نے دیکھنے کے باوجود دروازہ نہیں کھولا، تو واپس چلا جائے گا۔ شریف آدمی غیرت مند ہوتا ہے۔ اسی طرح نیک کام کرنے کا دل میں خیال پیدا ہونا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک مہمان ہے، اس کی قدر یہ ہے کہ فوراً اس پر عمل کیا جائے۔ عمل کریں گے تو اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ دیگر نیک اعمال کی توفیق دیں گے۔

## ہمیں بھی کرنا چاہیے:

حاصل یہ ہے کہ عمل میں وزن تین چیزوں سے آتا ہے: ایمان، صدق (یعنی سنت و شریعت کے مطابق ہونا) اور اخلاص۔ ہمیں بھی اپنے اعمال کو وزنی بنانے کے لیے ان تین چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔ نفس اور شیطان ہمارے اعمال کو خراب کرنے کے لیے اسی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ عموماً شہرت و ریاکاری کا خیال آتا ہے، اور آدمی اپنے عمل کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔

اللہ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورہ تکاثر

(مؤرخہ: ۹ ربیع الاول، ۲۰۱۲ھ - مطابق ۷ نومبر ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً .  
أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم ۞ بسم الله الرحمن الرحيم ۞

أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ ۚ حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۚ ۞ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ ۞ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ ۞ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۚ ۞ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ۚ ۞ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۚ ۞ ثُمَّ لَتَسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۚ ۞  
یہ سورہ تکاثر ہے، مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔

## شان نزول:

اس کے شان نزول کے سلسلے میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ نے تفسیر فتح



العزیز میں لکھا ہے کہ قریش کے دو بڑے قبیلے تھے: بنو عبد مناف اور بنو سہم۔ بنو عبد مناف سے حضور اکرم ﷺ کا تعلق ہے، عبد مناف حضور ﷺ کے دادا عبد المطلب کے دادا ہوتے ہیں۔ عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف۔ عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ اور دوسرا قبیلہ بنو سہم جس کا سردار عاص بن وائل سہمی تھا۔ ان دونوں خاندانوں میں ایک مرتبہ اپنی بڑائی، برتری اور اپنے فائق ہونے کے معاملے میں بحث ہو گئی۔ ہر ایک اپنی دولت اور ثروت کو بیان کر رہا ہے کہ ہمارے پاس اتنا مال ہے، اپنے کارناموں کو بیان کر رہا ہے، ہم نے اتنی شادیاں کیں، ہم نے ایسی مہمان نوازیاں کیں، اور ہم نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے۔ یہاں تک کہ آخر میں خاندان کے افراد کہتے ہیں؟ اس پر بات آئی۔ جب افراد شمار کیے گئے تو اس میں بنو عبد مناف کے افراد بنو سہم کے مقابلہ میں کچھ زیادہ تھے۔ تو بنو سہم نے یوں کہا کہ ہم چوں کہ بہادر لوگ ہیں، جنگوں میں ہمارے آدمی زیادہ مارے گئے، تو جو زندہ ہیں صرف ان کی گنتی نہیں؛ بلکہ جو جا چکے ہیں ان کی بھی گنتی ہونی چاہیے۔ چنانچہ قبرستان گئے، اس کو گنو، اُس کو گنو، قبریں گنی جا رہی ہیں۔ اس پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ان کی اس جہالت کو بیان کرنے اور ان کی اس غفلت کی مذمت کرنے کے لیے یہ سورت نازل کی گئی۔<sup>۱</sup>

## فضیلت:

اس کی فضیلت کے سلسلے میں مستدرک حاکم کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ حضرات صحابہؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میں سے کوئی آدمی کیا اس کی قدرت نہیں رکھتا کہ قرآن پاک کی ایک ہزار آیتوں کی تلاوت کر لے؟ صحابہؓ نے عرض کیا

(۱) تفسیر عزیزی ص: ۲۹۰، کتب خانہ فیض ابراہ، انگلشور، گجرات۔

کہ اے اللہ کے رسول! اس کی تو کون قدرت رکھے گا کہ روزانہ ایک ہزار آیتیں تلاوت کرے!!! نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی آدمی سورہ اٰلہکمُ التَّكَاثُرُ نہیں پڑھ سکتا؟ گویا جو اس کو پڑھے گا وہ قرآن پاک کی ایک ہزار آیتیں پڑھنے کے برابر سمجھا جائے گا۔<sup>۱</sup>

## تکاثر کیا ہے؟

اَلْهٰکُمُ التَّکَاثُرُ، حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ

**تکاثر** مال و دولت اور عیش و عشرت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کو کہتے ہیں۔ آج کل دنیا میں ہر ایک کی کوشش یہی ہے کہ میں مال و دولت میں فلاں سے آگے نکل جاؤں، اس سے زیادہ مال حاصل کروں، اس سے زیادہ عیش و عشرت کے سامان مہیا کروں، اس سے زیادہ راحت کے اسباب جمع کروں۔ گویا دولت و ثروت، عیش و عشرت اور راحت کے اسباب حاصل کرنے میں ایک دوسرے کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ فلاں کا بنگلہ اتنا بڑا ہے میرا اس سے بڑا ہونا چاہیے۔ فلاں کی فیکٹری اتنی بڑی ہے میری فیکٹری اس سے بڑی ہونی چاہیے۔ فلاں کے پاس اتنی کاریں ہیں میرے پاس اس سے زیادہ کاریں ہونی چاہیے۔ فلاں کا بینک بیلینس اتنا بولتا ہے، یہ میلینر شمار ہوتا ہے، تو میں ٹریلینر بن جاؤں۔ وہ کروڑ پتی ہے تو میں ارب پتی بن جاؤں۔ یہی مقابلہ ہے اور پوری دنیا میں یہی چکر چل رہا ہے۔ اور اسی نے سارے انسانوں کو اپنی زندگی کے اصل مقصد سے

(۱) المستدرک علی الصحیحین: ۲۰۸۱ وقال الحاكم رواة هذا الحديث كلهم ثقاة (ط: دار الکتب

العلمیة، بیروت).

غافل کر دیا ہے، ہٹا دیا ہے۔

## موت کا کوئی انکار نہ کر سکا:

دنیا کا نظام کئی صدیوں سے چل رہا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک انسان پیدا ہوتا ہے، بچہ ہوتا ہے، پھر جوان ہوتا ہے، پھر ادھیڑ عمر کو پہنچتا ہے، پھر بوڑھا ہوتا ہے، پھر مر کر قبر میں پہنچ جاتا ہے۔ بہت سے وہ بھی ہیں جو بڑھاپے کی عمر آنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں؛ لیکن کیا آج تک کوئی ایک آدمی بھی ایسا نظر آیا جو یہاں آیا ہو اور ہمیشہ رہا ہو؟ موت نے اس کو اپنا شکار نہ بنایا ہو؟ ایسا کوئی آدمی ہے؟ نہیں ہے۔ سالہا سال ہو گئے، صدیاں بیت گئیں، دنیا کا ایک نظام چل رہا ہے؛ لیکن آج تک ایک آدمی بھی آپ کو ایسا نہیں ملے گا، جس کو دیکھ کر آپ یہ کہیں کہ یہ پانچ صدیوں سے، دس صدیوں سے دنیا میں ہے، پانچ ہزار سال ہو گئے یہ ابھی زندہ ہے، ایسا کوئی ہے؟ کوئی ایک آدمی بھی نہیں ہے۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ جو بھی اس دنیا میں آیا اس کو جانا ہے۔

اس قانون سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لوگوں نے بڑے بڑے حقائق کا انکار کیا۔ اللہ کے وجود کا انکار کیا، انبیاء کی نبوت اور رسالت کا انکار کیا، قیامت کا انکار کیا، جنت و دوزخ کا انکار کیا؛ لیکن موت کا آج تک کوئی انکار نہیں کر سکا۔ سب کو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا کہ موت تو بہر حال آئے گی، کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے آپ کو موت سے بچا سکتا ہو۔ سبھی پر موت آنے والی ہے۔

## بڑھ رہا ہے فاسدہ بناب قضا کے ہر قدم:

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا فلسفی اور بڑے سے بڑا سائنس

دان اور بڑے سے بڑا انجومی کسی کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی موت کب آئے گی؟ آئے گی یہ حقیقت ہے؛ لیکن کب آئے گی یہ معلوم نہیں ہے۔ ابھی آ سکتی ہے، کل آ سکتی ہے، ایک مہینے کے بعد آ سکتی ہے، ایک سال کے بعد آ سکتی ہے۔ آج تک سائنس دانوں نے کوئی ایسی تدبیر نہیں پائی جس کے ذریعہ سے کون کب تک زندہ رہنے والا ہے؛ یہ معلوم کر سکیں۔ کسی کی کوئی گارنٹی نہیں۔ ہاں! یہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ جو آیا ہے اس کو جانا ہے۔ معلوم ہوا یہ دنیا ہمیشہ رہنے کا گھر نہیں ہے۔ یہ منزل نہیں ہے، یہ سفر ہے۔ اگر منزل ہوتی تو دنیا میں ہمیں کچھ لوگ ایسے نظر آتے جو مستقل یہاں رہتے ہوں کہ یہ لوگ جب سے آئے ہیں گئے نہیں ہیں یہ دنیا ہی میں رہتے ہیں، معلوم یہ ہوا کہ دنیا ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔

ایک سفر کا سلسلہ ہے۔ دنیا میں کوئی آدمی سفر کرتا ہے، اگر وہ عقلمند اور صاحب ہوش و حواس ہو، تو اس کے سفر کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے کہ آپ سفر کر رہے ہیں تو کیوں کر رہے ہیں؟ تجارت کے لیے، اپنے اعزہ و اقارب کی ملاقات کے لیے، علم حاصل کرنے کے لیے، حج و عمرہ کرنے کے لیے، سیر و تفریح کرنے کے لیے۔ کوئی ایسا ہے جو سفر میں جا رہا ہو، اس کو پوچھا کہ تم سفر میں کیوں جا رہے ہو؟ کیا مقصد ہے؟ اور وہ یہ کہے کہ مجھے معلوم نہیں میرے سفر کا مقصد کیا ہے؟ اس کو لوگ بے وقوف کہیں گے؛ لیکن یہاں دنیا کا سفر جس کو ہم کر رہے ہیں ہمیں پوچھا جاتا ہے کہ تمہارا مقصد کیا ہے؟ تو ہم اپنے مقصد سے غافل ہیں۔

## اصل مقصد:

جس ذات نے ہمیں پیدا کیا، اور اس نے ہم کو اس دنیا کے سفر پر بھیجا، اس نے ہمیں کھول کھول کر بتا دیا کہ تم کو دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے؟ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا

لِيَعْبُدُونِ. (الذّٰرِیّٰت: ۵۶) بندگی کرنے کے لیے، یعنی تم اپنی زندگی ہماری مرضی کے مطابق گزارو۔ تمہاری خواہشات کو، تمہاری سوچ کو، تمہاری مرضی کو اس زندگی میں دخل نہیں ہے۔ تمہیں زندگی ہماری مرضی کے مطابق گزارنی ہے، ہم جس طرح کہیں اس طرح کرو، جن چیزوں سے بچنے کا حکم کریں اس سے بچو۔ یہ باری تعالیٰ نے کھول کھول کر بتلادیا ہے۔ گویا دنیا کے اس سفر کا مقصد بھی اس سفر پر بھیجنے والے نے بالکل صاف اور واضح کر دیا؛ لیکن جب اس دنیا میں آئے ہیں تو قدرت کی طرف سے ہی ہماری کچھ طبعی ضرورتیں ہمارے ساتھ لگا دی گئی ہیں۔ کھانا، پینا، راحت، آرام۔ اور ان ضرورتوں کو پورا کیے بغیر آدمی سکون نہیں پاسکتا ہے۔ کھانے کی ضرورت پیش آئے تو اس کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے کچھ کام کاج، کاروبار کرنے کی اجازت دی گئی؛ لیکن وہ بقدر ضرورت۔ اصل مقصد تو یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اللہ کے حکم کے مطابق اس کی بندگی میں گزاریں، اس کے بندے بن کر رہیں، اس کی مرضی کے مطابق چلیں۔ جن کاموں کا حکم دیا ہے ان کو کریں، جن سے بچنے کو کہا ہے ان سے بچیں۔ اصل تو یہی ہے۔

## ان کو مرنے پہ ہی جینے کا پتہ چلتا ہے:

لیکن اس دنیا کی طلب میں لوگ ایسے کھو گئے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے مقصد کو بھلا دیا، یہاں کیوں آئے ہیں؟ اپنے سفر کے اس مقصد کی طرف سے بالکل غافل ہو گئے۔ اور ایسے غافل، اور دنیا کی طلب میں ایسے مشغول ہو جاتے ہیں، کہ دنیا سے جانے کا وقت آ جاتا ہے، موت آ جاتی ہے وہاں تک یہ غفلت دور نہیں ہوتی۔ مرے، قبرستان پہنچے، اب اگر خیال آتا بھی ہے تو کیا؟ مقصد زندگی کو پورا کرنے میں جو غفلت اور کوتاہی ہوئی ہے، اس کی

تلافی کا اب وقت نہیں رہا ہے۔ اسی کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس سورت میں بتلایا ہے۔

## ترجمہ اور وضاحت:

اَلْهٰکُمْ التَّکَاثُرُ۔ (ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر دنیا کا عیش حاصل کرنے کی ہوس نے تم کو غفلت میں ڈال دیا)۔ یعنی اس کو حاصل کرنے میں تم ایسے مشغول ہو گئے کہ دنیا میں کیوں آئے ہو؟ تمہیں دنیا میں کیا کرنا ہے؟ تمہارے آنے کا مقصد کیا ہے؟ اس کی طرف سے تم غافل ہو گئے۔ آدمی نے اپنے مقصد زندگی کو بھلا دیا۔

حَتّٰی زُرْتُمْ الْبُقَاعِیْرَ۔ (یہاں تک کہ تم قبرستان تک پہنچ جاتے ہو) یعنی یہ غفلت بھی ایسی کہ موت تک ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ مرنے کے بعد قبرستان پہنچ گئے۔ اب اگر غفلت دور ہو تو بھی کیا فائدہ؟

کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔ (ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے، تمہیں عنقریب پتہ چل جائے گا) یعنی ایسی غفلت میں پڑنا نہیں چاہیے۔ اپنی زندگی کے مقصد کو بھلانا نہیں چاہیے۔ یعنی جب موت آئے گی اور قبر میں پہنچو گے تب تم کو پتہ چل جائے گا۔

ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔ (پھر سن لو! یعنی ہرگز تم کو ایسا کرنا نہیں چاہیے، تمہیں عنقریب پتہ چل جائے گا)۔ جب میدان حشر میں پہنچو گے تب پتہ چل جائے گا۔ قبر میں جانا ہے، میدان حشر میں پہنچنا ہے یہ دور نہیں ہے۔ یہ قریب ہے۔ کل ماہوات قریب۔ (جو آنے والی چیز ہے وہ قریب ہی ہے) ابھی ہمیں دور نظر آتی ہے؛ لیکن حقیقت میں دور نہیں ہوتی، وقت گزر جاتا ہے۔

(۱) روی البیہقی فی الأسماء والصفات عن ابن شہاب مرسلًا: ۳۳۶، ط: مکتبۃ السوادی، جدہ۔

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ. (ہرگز نہیں! اگر تم یقینی علم کے ساتھ یہ بات جانتے) تمہیں اس بات کا یقین ہوتا کہ ہمیں آخرت میں جانا ہے تو کبھی بھی ایسی غفلت سے کام نہ لیتے، ان چیزوں میں مشغول نہ ہوتے۔

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ. (ضرور بالضرورت دوزخ کو دیکھو گے) یعنی موت کے بعد جب میدان حشر میں پہنچیں گے، تو باقاعدہ دوزخ لائی جائے گی، اور سب لوگ دوزخ کی زیارت کریں گے، اس کو دیکھیں گے۔

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ. (اور پھر یقین جانو! کہ تم اسے بالکل یقین کے ساتھ دیکھ لو گے)۔

## عین الیقین اور حق الیقین:

عین الیقین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے متعلق کوئی معتبر آدمی خبر دے تو اس کا علم اور جانکاری یقینی ہوتی ہے، پھر اگر اسی چیز کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، تو اس کو عین الیقین کہتے ہیں۔ اور اس کا تجربہ بھی ہو جائے تو اس کو حق الیقین کہتے ہیں۔ جیسے کوئی آدمی ہمیں یوں کہے کہ آگ جلاتی ہے۔ کہنے والا ہمارے نزدیک معتبر ہے، وہ جب یوں کہے گا کہ آگ جلاتی ہے تو اس کے کہنے سے ہمیں ایک علم حاصل ہوا۔ اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ آگ نے ہمارے سامنے کسی کو باقاعدہ جلا بھی دیا، تو جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ عین الیقین کہلائے گا۔ اس کے بعد پھر کسی نے ہماری انگلی آگ میں ڈال دی، یا ہم پر کسی نے آگ ڈال دی اور اس کی وجہ سے ہم کو جلنے کا احساس ہوا، تو اس کو حق الیقین کہتے ہیں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تم باقاعدہ اپنی آنکھوں سے دیکھو گے تو تمہیں اس کا عین

الیقین حاصل ہو جائے گا۔ کہ تم جہنم کو دیکھو گے، یعنی صرف علم اور جانکاری نہیں؛ بلکہ تم اس کی حقیقت کو دیکھو گے۔

ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ۔ (پھر تم اس دن نعمتوں کے بارے میں سوال کیے جاؤ گے) یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اللہ کی نعمتوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔ تم نے اللہ کی جو نعمتیں استعمال کی ہیں اللہ تعالیٰ کو اس کا باقاعدہ حساب دینا پڑے گا۔

## تیسرا مال تو وہی ہے.....:

حضرت عبداللہ بن شخیرؓ پر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو میں نے سنا کہ نبی کریم ﷺ سورہ تکوین کی تلاوت فرما رہے ہیں، جب تلاوت پوری کر چکے، تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: **يقول ابن آدم: مالي مالي** (انسان کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال) تیسرا مال تو وہی ہے جو تو نے کھا کر کے ختم کر دیا، یا پہن کر کے پرانا کر دیا، یا اللہ کے راستے میں خرچ کر کے اپنے لیے آخرت میں جمع کر دیا۔ باقی سب کچھ دوسروں کا ہے، وہ ختم ہونے والا ہے۔<sup>(۱)</sup> آدمی یوں سمجھتا ہے کہ میرا مال؛ لیکن جب موت آتی ہے تب یہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے، وہ دوسروں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے۔ تب پتہ چلتا ہے کہ پوری زندگی سب کو یہ کہتا رہا کہ میرا مال، اس کا کچھ نہیں تھا، وہ تو صرف اس کا چوکیدار تھا، مال تو دوسرے کے پاس گیا، یہ تو اس کی حفاظت کرتا رہا۔ اپنا تو وہی ہے جو خود کھا کر ختم کرے، یا پہن کر پرانا کر لے یا اللہ کے راستے میں خرچ کر کے اپنے لیے آخرت میں جمع کر لے۔

(۱) المستدرک علی الصحیحین: ۳۹۶، ط: دار الکتب العلمیہ، بیروت.



## اس کا منہ قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے:

اسی طرح بخاری شریف میں حضرت انسؓ کی روایت ہے: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: آدمی دنیا حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، انسان کو اگر ایک وادی (الْأَمَلُ) (دو پہاڑیوں کے درمیان کی ہموار زمین) سونے سے بھری ہوئی مل جائے تو **أَحَبُّ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَادِيَانِ**۔ ایک پر اس کو صبر نہیں ہوتا، وہ چاہتا ہے ایسی دو وادیاں مل جائیں۔ حالاں کہ یہ ایک وادی جو سونے سے بھری ہوئی ہے اس کی کئی نسلوں تک کام دے سکتی ہے؛ لیکن آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ اس وقت میرے پاس جو مال ہے میری کئی بیڑھیاں اس سے اپنی ضرورتیں پوری کر سکتی ہیں، پھر مجھے اب دوسرا مال حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے؛ لیکن نہیں! اس کی حرص کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ **وَلَنْ يَمْلَأَ فَاهُ إِلَّا التُّرَابُ**۔ (اور آدمی کا منہ تو قبر کی مٹی ہی بھرتی ہے) (دوسرا کوئی نہیں بھرتا۔ **وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَى مَنْ تَابَ**، ہاں آدمی توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتے ہیں۔ گویا آدمی کے حرص کی کوئی انتہا نہیں۔<sup>۱</sup>

## حرص کی انتہا نہیں:

ایک آدمی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تو بہت کم سے پوری ہو جاتی ہے۔ ایک آدمی پیاسا ہے، پیاس کو ختم کرنے کے لیے ایک گلاس پانی کافی ہے، سیراب ہو جائے گا۔ بھوکا ہے، اس کی بھوک کو دور کرنے کے لیے دو یا تین روٹیاں کافی ہیں، شکم سیر ہو جائے گا۔ لیکن اگر ہوس اور حرص ہے، جیسے لوگوں کو مال اور دولت کی حرص پیدا ہو جاتی ہے اس کی تو کوئی انتہا

(۱) صحیح البخاری: ۶۴۳۹۔

ہی نہیں ہے۔ جتنا آتا ہے وہ کم ہے۔ یہی نعرہ لگاتا ہے کہ **ہل من مزید؟** مجھے اور مل جائے۔ اور اس کی یہ حرص ختم ہی نہیں ہوتی ہے۔

## غفلت کو دور کرنے کی ضرورت ہے:

مال اور جاہ دونوں کا یہی حال ہے۔ یعنی رتبہ حاصل کرنے کی ہوس۔ اسمبلی کا ممبر (۱۹۲۱ء) بن گیا، تو پھر آگے یوں تمنا کرے گا کہ وزیر (۱۹۲۱ء) بن جاؤں۔ وزارت مل گئی، تو پھر یوں سوچے گا کہ میں وزیر اعلیٰ (۱۹۲۱ء) بن جاؤں۔ اور جب وزیر اعلیٰ (۱۹۲۱ء) بن گیا، تو پھر یوں سوچے گا کہ میں وزیر اعظم (۱۹۲۱ء) بن جاؤں۔ گویا اس کی حرص اور طمع کی کوئی انتہا نہیں ہوگی، وہ سلسلہ آگے چلتا ہی رہتا ہے۔ اور اسی حرص اور طمع کو حاصل کرنے میں زندگی ختم ہو جاتی ہے، قبر میں پہنچ جاتا ہے اور اس کو خیال بھی نہیں رہتا۔ پوری زندگی یہی غفلت طاری رہتی ہے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ دور کرنا چاہتے ہیں کہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر عیش و عشرت اور راحت، دولت و ثروت حاصل کرنے نے تم کو آخرت کی طرف سے غفلت میں ڈال دیا ہے، اپنی اس غفلت کو دور کرنے کی ضرورت ہے، اسی پر تنبیہ کی گئی کہ تم کو قبر میں جانا ہے، حشر میں جانا ہے، جب وہاں پہنچ جاؤ گے تو پتہ چلے گا؛ لیکن وہاں پہنچنے کے بعد تمہارے لیے اس کی تلافی کا کوئی موقع نہیں رہے گا کہ اب کچھ کر سکیں۔ کر سکنے کا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

## تندرستی، ہزار نعمت:

اور پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں نعمتوں کے متعلق سوال ہوگا۔ ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: قیامت کے روز سب سے پہلے بندے

سے جس چیز کا حساب ہوگا وہ اس کی تندرستی ہے۔ باری تعالیٰ کی طرف سے سوال ہوگا کہ کیا ہم نے تم کو تندرستی نہیں دی تھی؟ کیا ہم نے تم کو ٹھنڈا پانی نہیں پلایا تھا؟<sup>(۱)</sup> اور تندرستی صرف ایک نعمت نہیں ہے، ہزاروں نعمتیں ہیں۔ ہمارے جسم میں تنے اعضا ہیں؟ آنکھ ہماری ٹھیک ہے، کان ہمارے ٹھیک ہیں، زبان ہماری ٹھیک ہے، ناک ہماری ٹھیک ہے، ہاتھ ہمارے ٹھیک ہیں، ہمارا دل کام کر رہا ہے، دماغ صحیح ہے، کڈنی کام کر رہی ہے، پیر چل رہے ہیں، ہاتھ اپنا کام کر رہے ہیں۔ جسم کے بے شمار اعضا ہیں، ہر ہر عضو اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا ہے، یہ سب کیا ہے؟ تندرستی ہی تو ہے!!! تندرستی کہنے کو تو ایک نعمت ہے؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو بے شمار نعمتیں ہیں۔ اس میں سے ذرا آگے پیچھے ہو جائے، جیسے کسی کی کڈنی خراب ہوگئی پھر دیکھو کیا ہوتا ہے؟ دل کا دورہ پڑ گیا، دیکھو کیا ہوتا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری تندرستیاں عطا فرمائی ہیں، وہ کہنے کو تو ایک نعمت ہے؛ لیکن سوچو گے اور گنو گے تو ہزاروں نعمتیں ہیں۔ اسی لیے گجراتی میں ایک کہاوت ہے: ایک تندرستی، ہزار نعمت۔ واقعہ یہی ہے کہ دکھنے میں تو ایک ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں۔

## کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں:

شمال میں واقعہ موجود ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ اپنے گھر سے دوپہر میں ایسے وقت پر نکلے جو عام طور پر نبی کریم ﷺ کے گھر سے نکلنے کا وقت نہیں تھا، اور کوئی آدمی ملاقات کے لیے بھی اس وقت نہیں جاتا تھا، جب باہر تشریف لائے تو حضرت ابو بکرؓ کی ملاقات ہوگئی کہ کیا بات ہے؟ تو کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کے دیدار اور آپ کی

ملاقات۔ اصل میں ان کو فاقہ تھا، اور بھوک سے بے چین ہو کر نکلے تھے؛ لیکن نبی کریم ﷺ کے چہرہ انور کو دیکھ کر وہ اپنی بھوک بھول گئے اور یہ کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کی زیارت اور آپ کی ملاقات۔ پھر حضرت عمرؓ پہنچ گئے، حضرت عمرؓ کو حضور ﷺ نے پوچھا: اے عمر! کیا بات ہے؟ تو کہا: اے اللہ کے رسول! بھوک کا احساس ہے۔ شدت سے بھوک لگی ہوئی ہے، کھانے کو کچھ نہیں تھا، بے چین ہو کر گھر سے باہر نکلا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میں بھی کچھ بھوک محسوس کر رہا ہوں۔ کہا کہ چلو! ابوالہیثم بن التہیان، ایک انصاری صحابی ہیں جو بیعت عقبہ میں شریک ہوئے، اور جن لوگوں کو نبی کریم ﷺ نے نقیب بنایا تھا، یہ ان میں سے ہیں۔ باغات والے آدمی تھے، حضور اکرم ﷺ ان کے گھر تشریف لے گئے۔ ان کی بیوی سے پوچھا کہ کہاں ہیں؟ تو کہا کہ وہ ٹھنڈا پانی لینے گئے ہیں۔ ابھی تو بات ہو رہی تھی اتنے میں وہ پہنچ گئے، دیکھا کہ حضور ﷺ میرے گھر؟ بس کیا کہنا تھا!!! وہ مشکیزہ نیچے رکھا اور لپٹ گئے۔ اور کہنے لگے اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان! میری قسمت ایسی کہاں کہ میرے گھر آپ؟ پھر حضور ﷺ کو اپنے باغ میں لے گئے اور چادر بچھا کر ان تینوں حضرات کو وہاں بٹھایا۔ اور جلدی سے کھجور کا ایک بڑا خوشہ توڑ کر لائے، اور ان کے سامنے رکھ دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: پورا خوشہ کیوں توڑ کر لائے؟ خوشے میں تو پکی کھجوریں بھی ہوتی ہیں، ادھ پکی ہوئی بھی ہوتی ہیں، کچی بھی ہوتی ہیں۔ تو پکی پکی توڑ کر لاتے!!! انہوں نے جواب میں عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں اس لیے پورا خوشہ توڑ کر لایا کہ لوگوں کی چاہت اور ذوق مختلف ہوتا ہے، کسی کو پکی اچھی لگتی ہیں، کسی کو ادھ پکی اچھی لگتی ہیں، کسی کو کچی کھانے میں لطف آتا ہے، تو میں پورا خوشہ اسی لیے توڑ کر لایا تاکہ آپ کو جیسی پسند ہو وہ کھائیں۔ حضور ﷺ نے ان کی اس سوچ کی تعریف فرمائی، دعا دی،

پھر وہ پانی لائے۔

جب ان حضرات نے کھجوریں کھائیں اور پانی پیا تو نبی کریم ﷺ نے فوراً فرمایا: **هذا والذي نفسي بيده من النعيم التي تسئلون عنه يوم القيامة.** (اللہ کی قسم! یہ ان نعمتوں میں سے ہے جس کے متعلق قیامت کے روز سوال ہوگا) **ظل بارد ورطب طيب و ماء بارد.** (ٹھنڈی چھاؤں اور تازہ، عمدہ کھجوریں اور ٹھنڈا پانی) <sup>۱</sup> حالاں کہ یہ چیزیں کئی روز کی بھوک کے بعد ملی تھیں، پھر بھی حضور ﷺ کو یا متوجہ کر رہے ہیں کہ اللہ کی ان نعمتوں کا سوال ہوگا۔

## پانچ سوالات:

ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے: **لا تزول قدم ابن آدم يوم القيامة من عند ربه حتى يسئل عن خمس.** (قیامت کے روز انسان کے قدم اللہ کے حضور سے ہٹ نہیں پائیں گے یہاں تک کہ پانچ چیزوں کے متعلق سوال ہوگا) **عن عمره فيم أفناه.** (تم نے اپنی زندگی کہاں ختم کی؟) **وعن شبابه فيم أبلاه.** (جوانی کے ان ایام کو کہاں پرانا کیا؟) **وماله من أين اكتسبه وفيم أنفق.** (مال کے متعلق سوال ہوگا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟)

مال کے متعلق دو سوال ہوں گے۔ کن طریقوں سے کمایا؟ ناجائز طریقوں سے تو نہیں کمایا؟ پھر اگر جائز طریقے سے کمایا ہے تو کہاں خرچ کیا؟ جہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کی اجازت اور حکم دیا ہے وہاں یا دوسری جگہ؟ بعض لوگ حلال طریقے سے کم کر بھی

(۱) صحیح مسلم: ۲۰۳۸ و الشمائل المحمدية للترمذی: ۳۶۱.

فضول خرچی کرتے ہیں اور ان کو تنبیہ کی جاتی ہے تو یوں کہتے ہیں کہ میں نے حلال طریقے سے کمایا ہے، میرا مال ہے جس طرح چاہوں استعمال کروں۔ نہیں! اللہ تعالیٰ نے جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہیں خرچ کر سکتے ہیں، دوسری جگہ نہیں۔ اور ضرورت سے زائد بھی نہیں فضول خرچی کی اجازت ہی نہیں ہے۔

## پیسر آؤٹ ہو گیا ہے:

وماذا عمل فیما علم؟ اور جو علم حاصل ہوا، دین کی جو جانکاری ملی اس پر تم نے کتنا عمل کیا؟ یہ دین کی باتیں جو ہم سنتے ہیں ان کے متعلق بھی سوال ہوگا کہ اس کے سننے کے بعد آپ نے اس پر کتنا عمل کیا؟ گویا سوال پیسر آؤٹ ہو گیا ہے۔ دنیا کے امتحان میں اگر ذمہ داروں کو پتہ چلے کہ سوال پیسر آؤٹ ہوا تھا تو دوسرا امتحان دلواتے ہیں۔ یہاں تو اللہ تعالیٰ نے سوال پیسر پہلے سے آؤٹ کر دیا ہے، جواب وہاں دینا ہے۔ یہاں اگر اس پر عمل کرو گے تو جواب دے سکو گے۔

## تین دفتر:

حضرت انسؓ کی ایک اور روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قیامت کے روز جب انسان کو اللہ کے حضور حساب کتاب کے لیے پیش کیا جائے گا تو ساتھ میں تین دفتر (الکتاب) بھی فرشتے پیش کریں گے۔ (۱) ایک دفتر میں اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا تذکرہ ہوگا جو اس نے زندگی بھر استعمال کی ہوں گی۔ ہم پیدا ہوئے تب سے لے کر مرنے تک کتنے گلاس پانی پیا؟ ہمیں تو حساب بھی معلوم نہیں ہے۔ کتنی سانس لی؟ ہوا کے ذریعے ہم نے

سانس لی تھی، اور اپنی زندگی باقی رکھی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی ہوا کو سانس میں لینے میں کتنا استعمال کیا؟ سورج کی کتنی روشنی استعمال کی؟ پیدا ہونے سے لے کر موت تک اللہ تعالیٰ کی جتنی بھی نعمتیں بندہ استعمال کرتا ہے وہ سب اس دفتر میں درج ہوں گی۔ چھوٹی چھوٹی نعمتیں بھی ہوں گی۔ (۲) دوسرے دفتر میں اس کے نیک اعمال کا تذکرہ ہوگا۔ اس نے پوری زندگی کتنی نمازیں پڑھیں؟ کتنے روزے رکھے؟ کتنے حج اور عمرے کیے؟ کتنے قرآن ختم کیے؟ کتنی تسبیحات پڑھیں؟ زندگی بھر کے سارے نیک کام اس دفتر میں درج ہوں گے۔ (۳) تیسرے دفتر میں اس کے گناہوں کا تذکرہ ہوگا۔ یہ تین دفاتر ہوں گے۔ اور انسان کو فرشتے اللہ کے سامنے پیش کر دیں گے کہ اس کا حساب لے لو۔

## ..... ابھی میری قیمت وصول نہیں ہوئی:

اس وقت نعمتوں کے دفتر میں اللہ کی سب سے چھوٹی اور سب سے کم درجے کی جو نعمت ہوگی، اس نعمت سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس کے نیک اعمال میں سے تو اپنی قیمت وصول کر لے۔ چنانچہ وہ نعمت آگے بڑھے گی اور اس کے سارے نیک اعمال کو لے کر ایک طرف کھڑی ہو جائے گی۔ اور کہے گی: اے میرے رب! تیری عزت کی قسم! اس کے تمام نیک اعمال میں نے لے لیے، پھر بھی ابھی میری قیمت وصول نہیں ہوئی، اور ابھی تو گناہ بھی باقی ہیں اور نعمتیں بھی۔ پس جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر رحم کرنے کا ارادہ کریں گے، تو کہیں گے: اے میرے بندے! میں نے تیری نیکیوں کو دو گنا کر دیا، اور تیری خطاؤں سے درگزر کیا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں: میرا گمان ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ فرمائیں گے)

میں نے اپنی نعمتیں تجھے (بغیر کسی عمل صالح کے) ہبہ کر دیں۔ اللہ کی ایک ایک نعمت ایسی ہے کہ ہماری پوری زندگی کی عبادتیں اس نعمت کی قیمت ادا نہیں کر سکتیں۔

## میرے فضل سے جنت میں جا:

حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کے خطبات میں یہ قصہ ہے، اور حضرت کی زبانی میں نے خود بھی سنا ہے (حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ابھی میرے خلیل حضرت جبریل علیہ السلام میرے پاس سے تشریف لے گئے اور کہا کہ اے محمد! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق لے کر مبعوث کیا) کہ بنو اسرائیل میں ایک آدمی تھا، اس نے پانچ سو (۵۰۰) سال سمندر میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر اللہ کی عبادت کی..... وہاں اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے پانی کا ایک چشمہ جاری کر دیا، اور انار کا ایک درخت اگا دیا۔ چنانچہ وہ اس سے اپنی بھوک و پیاس پوری کرتا تھا، پھر اس نے تمنا کی کہ میری موت اس حالت میں آئے کہ میں سجدے میں ہوؤں؛ تاکہ اسی حالت میں رہوں۔ چنانچہ اسی حالت میں موت بھی آئی۔ مرنے کے بعد جب اسے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا جائے گا، تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہیں گے کہ میرے فضل سے اس کو جنت میں لے جاؤ۔ تو وہ کہے گا: میرے رب! میرے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل کیجیے، چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں اور اس کے اعمال میں تقابل کا حکم دیں گے، تو صرف بصارت

(۱) الآثار لأبي يوسف: ۱/۲۰۴ [۹۱۵] (ط: دار الكتب العلمية) و مسند البزار: ۱۳/۹۹ [۶۳۶۲] (ط: مكتبة العلوم والحكم، المدينة المنورة) و المجالسة و جواهر العلم للدينوري المالكي: ۱/۲۹۱ [۵] (ط: جمعية التربية، بحرين و دار ابن حزم، بيروت) و مسند أبي حنيفة رواية أبي نعيم: ۱/۲۰۲ (ط: مكتبة الكوثر، الرياض) و الترغيب والترهيب للمنذري: ۵۴۴۹ (ت: إبراهيم شمس الدين).



کی نعمت ہی پانچ سو سال کی عبادت کا احاطہ کر لے گی۔ جب کہ ابھی مکمل جسم کی نعمت کا کوئی حساب نہیں ہوا ہے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرے بندے کو جہنم میں داخل کرو، چناں چہ اسے جہنم کی جانب کھینچا جائے گا، تو وہ کہے گا: اپنی رحمت سے جنت میں داخل کیجیے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اس کو میرے سامنے حاضر کرو، چناں چہ اسے اللہ کے حضور پیش کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: تجھے کس نے پیدا کیا؟ جب کہ تیرا وجود نہیں تھا، تو وہ کہے گا: میرے رب! تو نے ہی پیدا کیا، پھر اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: تجھے پانچ سو سال عبادت کی قوت کس نے دی؟ وہ کہے گا: تو نے ہی اے میرے رب! تجھے سمندر میں پہاڑ پر کس نے ٹھکانہ دیا؟ اور کس نے تیرے لیے شور پانی سے خوش گوار پانی کا انتظام کیا؟ اور کس نے ہر رات تیرے لیے انار کا انتظام کیا؟ حالاں کہ انار درحقیقت سال میں ایک ہی مرتبہ اگتا ہے، پھر تجھے سجدے کی حالت میں موت کس نے دی؟ وہ کہے گا: تو نے ہی اے میرے رب! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: یہ سب میری رحمت کا کرشمہ ہے اور میری رحمت سے میں تجھے جنت میں داخل کرتا ہوں، پھر اللہ تعالیٰ حکم دیں گے کہ میرے بندے کو جنت میں داخل کرو (اور فرمائیں گے) تو بہت اچھا بندہ تھا، پس اللہ تعالیٰ (اپنی رحمت سے) اسے جنت میں داخل کریں گے۔<sup>۱</sup>

تو یہاں بھی ان تین دفتروں میں سے نعمت والے دفتر کی چھوٹی نعمت سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو اپنی قیمت وصول کر لے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ نعمت اس کی زندگی کی ساری عبادتوں کو لے لے گی، اور ایک طرف کھڑی ہو جائے گی۔ باری تعالیٰ اس سے پوچھیں گے کہ کیا بات ہے؟ تو وہ کہے گی کہ میں نے اس کی ساری عبادتیں لے لی ہیں، پھر

(۱) رواہ الحاکم فی المستدرک فی کتاب التوبۃ والینابۃ: ۶۳۷ (ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت).

بھی میری قیمت وصول نہیں ہوئی ہے۔ وہ آدمی سوچے گا کہ مرے۔ ابھی تو ایک چھوٹی سے چھوٹی نعمت کی قیمت ادا نہیں ہوئی۔ زندگی بھر باقی ساری نعمتیں استعمال کیں ان کا کیا ہوگا؟ اور اب عبادتیں تو ختم ہو گئیں!!! اب تو گناہ رہ گئے!!! اب تو جہنم میں جانے کا موقع آئے گا!! باری تعالیٰ اپنے جس بندے پر اپنا فضل کرنا چاہیں گے، اس سے فرمائیں گے کہ جا! میں نے تیری نیکیاں ڈبل کر دیں، اور میں تجھ سے اپنی نعمتوں کا حساب نہیں لیتا، اور میں نے تیرے گناہ معاف کر دیے۔ اس کا بیڑا پار ہو جائے گا۔

## خلاصہ کلام:

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کے روز ان نعمتوں کا سوال ہوگا۔ ہم ان نعمتوں کو بے دردی کے ساتھ اور غفلت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ کبھی بھول سے بھی خیال نہیں آتا کہ ہمیں کل کو ان کا جواب دینا پڑے گا۔

اس سورت میں باری تعالیٰ نے ہم جو دنیا کی غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اس کا علاج بتلایا ہے۔ علاج میں دو چیزیں ہیں: (۱) جہنم کا خوف (۲) اللہ کی نعمتوں کے حساب کا یقین۔ اگر آدمی دل میں اس بات کا یقین رکھتا ہو کہ مجھے اللہ کی ان نعمتوں کا کل اللہ کو جواب دینا ہے، اور جہنم پر پیش ہونا ہے تو کبھی بھی وہ غفلت میں نہیں رہے گا۔ ہمیں اپنی زندگی کی غفلت کو دور کرنے کی ضرورت ہے، ہمیں اس کا استحضار ہو۔ ہم دنیا کی یہ زیادتی حاصل کرنے کے لیے جو دوڑ لگا رہے ہیں؛ حالاں کہ ہماری ضرورتیں تو اس سے کم میں پوری ہو جاتی ہیں، تو ضرورت ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس سے بچائیں۔ یہی اس سورت کا سبق ہے۔ اللہ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورہ عصر

(مؤرخہ: ۲۵ صفر المظفر ۱۲۴۰ھ - مطابق ۳ نومبر ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل  
عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله  
من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له  
ومن يضلل الله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك  
له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة  
الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله  
تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً .  
أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم ۞ بسم الله الرحمن الرحيم ۞

وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَ

تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

## بقامت کہتر بہ قیمت بہتر:

یہ سورہ عصر ہے، چوں کہ پہلی ہی آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے **عصر** یعنی زمانے  
کی قسم کھائی ہے، اس کلمہ **عصر** کی وجہ سے اس کا نام سورہ **العصر** رکھا گیا ہے۔ یہ قرآن  
پاک کی دوسرے نمبر کی سب سے چھوٹی سورت ہے۔ پہلے نمبر کی سورہ کوثر ہے، اس میں دیگر

سورتوں کے مقابلے میں کم سے کم حروف اور کلمات ہیں۔ اس سے کچھ کم چھوٹی یہ سورۃ العصر ہے۔ گویا یہ دوسرے نمبر کی چھوٹی سورت ہے۔ لیکن اپنے مضامین کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

## زندگی درست کرنے کے لیے:

امام شافعیؒ کا مقولہ ہے کہ اگر لوگ اس سورت میں غور کریں، تو ان کی زندگی کے درست کرنے کے لیے یہ اکیلی کافی ہو جائے گی۔<sup>۱</sup> اور حضرت عبید اللہ بن حصنؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ میں سے دو آدمی جب آپس میں ملتے تھے، تو وہ جدا نہیں ہوتے تھے؛ یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو سورۃ عصر نہ سنا دے۔ گویا اس میں بڑی نصیحت ہے۔ ہر ایک سورۃ عصر پڑھ کر اپنے ساتھی کو سناتا تھا، اس کے بعد سلام کر کے جدا ہوتا تھا۔<sup>۲</sup>

## شان نزول:

اس کے شان نزول کے سلسلے میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ نے تفسیر عزیزی میں لکھا ہے کہ کلب بن اُسید نامی قریش کا ایک آدمی تھا، اس کو ”ابوالاسدین“ سے بھی یاد کیا جاتا تھا، یہ اس کی کنیت تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کا زمانہ جاہلیت میں دوست تھا۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے اسلام قبول کیا تو ایک دن وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا، اور کہنے لگا: ابوبکر! تم تو بڑے عقلمند آدمی تھے!!! اور ہمیشہ تجارت میں اپنی عقلمندی اور دانائی کی وجہ سے

(۱) تفسیر ابن کثیر۔

(۲) المعجم الأوسط للطبرانی: ۵/۲۱۵ [۵۱۲۴] ط: دار الحرمین، القاهرة۔

بہت نفع حاصل کرتے تھے!!! تم نے یہ کیا کیا کہ اسلام قبول کر لیا؟ اور لات اور عزی کے دین اور اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر تم بہت بڑے خسارے میں پڑ گئے، ان کی شفاعت سے محروم ہو گئے۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے جواب میں فرمایا: جو آدمی حق قبول کرتا ہے وہ کبھی خسارے میں نہیں رہتا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسی گفتگو پر حضرت ابوبکرؓ کی تائید میں اور ان کی بات کی خوبی کے بیان میں یہ سورت نازل فرمائی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے یہ شان نزول بتلایا ہے۔<sup>۱</sup>

اللہ تعالیٰ نے زمانے کی قسم کھائی ہے: **وَالْعَصْرِ** - **عصر**: زمانے کو بھی کہتے ہیں، عصر کا وقت بھی مراد لیا جاسکتا ہے، اور آدمی کی زندگی کا زمانہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔

## قسم یقین دہانی کے لیے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہاں جو قسم کھائی ہے، عام طور پر انسان اور لوگ اپنی باتوں میں جب قسم کھاتے ہیں، قسم کا استعمال بسا اوقات مخاطب کو اپنی بات کا اطمینان اور یقین دلانے کے لیے ہوتا ہے۔ گویا وہ اپنی سچائی ظاہر کرنے کے لیے قسم کھاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ کو قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ **وَمَنْ أَضَدِّقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا (النساء: ۱۲۲)** اللہ سے زیادہ کون سچا ہو سکتا ہے؟

## قسم بطور دلیل:

البتہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے کبھی کبھی اپنی بات اور گفتگو میں قوت پیدا کرنے کے لیے بھی قسم استعمال کی جاتی ہے۔ ہاں! اس مقصد کے لیے تسلیم کر سکتے ہیں۔

(۱) تفسیر عزیزی ص: ۶۳۴، کتب خانہ فیض ابراہ، انگلشور، گجرات۔

حضرات مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے کلام میں جو قسم ہے وہ دراصل ایک دلیل اور شاہد کے طور پر ہے، اس چیز پر جس کی اللہ نے قسم کھائی ہے۔ اللہ نے قرآن پاک میں بہت ساری چیزوں کی قسم کھائی ہے۔ زمانے کی، قلم کی، بلدا میں۔ مکہ مکرمہ۔ کی، قیامت وغیرہ۔ لَا أَقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیَمَةِ (الْقِیَمَةُ-۱) وَ هَذَا الْبَلَدِ الْأَمِینِ (التین-۳) وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُونَ (القلم-۱) وَالْعَصَا (العصر-۱) ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جس چیز کی قسم کھائی ہے، وہ مابعد کے مضمون کی صداقت کے لیے بطور دلیل اور شاہد ہے۔ دیکھو! جس چیز کی قسم کھائی جا رہی ہے اگر اس کی حقیقت میں تم غور کرو گے، تو اس کے بعد جو چیز بیان کی جا رہی ہے، تمہیں اس کی سچائی کا اندازہ ہو جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ جو قسمیں کھاتے ہیں، وہ عموماً اسی مقصد کے لیے ہوتی ہیں۔ یہاں بھی اللہ تبارک و تعالیٰ نے زمانے کی قسم کھائی ہے، اس کے بعد حقیقت بیان کی گئی ہے کہ: إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (بے شک تمام انسان خسارے اور گھٹائے میں ہیں) یہاں ایک مضمون بیان فرمایا ہے کہ تمام انسان خسارے اور گھٹائے میں ہیں، اس کی صداقت اور تاکید کے لیے زمانے کی قسم کھائی گئی۔ گویا باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ زمانے کے حالات میں اگر کوئی آدمی غور کرے تو اس کو یہ بات صاف معلوم ہوگی کہ انسان خسارے اور گھٹائے میں ہے۔

## زندگی ایک تجارت:

کیوں؟ اس لیے کہ انسان کو دنیا میں آخرت کی تجارت کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے: یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ. (الصف-۱) گویا اس زندگی کے سارے کاموں کو ایک تجارت سے تعبیر کیا ہے۔ دوسری جگہ

ہے: إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبة-۱۱۱)  
(اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے خرید لیا) گویا جنت اس کی  
قیمت مقرر کی گئی ہے۔ قرآن نے اس کو تجارت سے تعبیر کیا۔

اور حدیث شریف میں بھی نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: **كُلُّ النَّاسِ يَغْدُو، فَبَائِعٌ**  
**نَفْسِهِ فَمُعْتَقُهَا أَوْ مُوبِقُهَا**۔ (ہر انسان جب صبح کو اپنے گھر سے نکلتا ہے تو وہ اپنی جان کا سودا  
کرتا ہے، یا تو وہ اپنے آپ کو بچالے جاتا ہے یا اپنے آپ کو ہلاک کر دیتا ہے) اگر اللہ کی  
اطاعت اور فرماں برداری کی، اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کی، اللہ کے حکم کے مطابق  
دن گزارا، تو وہ اپنے آپ کو بچالے گیا، اپنی جان کو جہنم کے عذاب سے آزاد کرالیا۔ اور اگر  
اس کے خلاف کیا ہے تو اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: **كُلُّ النَّاسِ**  
**يَعْدُو، فَبَائِعٌ نَفْسِهِ**۔ (ہر آدمی جب صبح کو نکلتا ہے تو اپنی جان کا سودا کرتا ہے) اس کو تجارت  
سے تعبیر کیا۔ گویا اللہ نے انسان کو جو دنیا میں بھیجا ہے، اس کے لیے یہ ایک تجارت ہے۔

## ہو رہی ہے عمر مثل برف کم:

اس تجارت کا سرمایہ کیا ہے؟ ہر تجارت کے لیے کوئی نہ کوئی پونجی، کپیٹل (Capital)  
اور سرمایہ ہوا کرتا ہے۔ تاجر سرمایے اور کپیٹل سے تجارت کرتا اور نفع کماتا ہے۔ اور سرمایے  
کو بھی ترقی دیتا اور بڑھاتا ہے۔ تو انسان کی تجارت کے لیے سرمایہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے  
انسان کو تجارت کے لیے جو سرمایہ عطا فرمایا ہے، وہ اس کی زندگی ہے۔ یہ ایک ایسا سرمایہ  
ہے جو ہر وقت گھٹتا جا رہا ہے، اس میں کمی آتی جا رہی ہے۔ ایک عربی شاعر کا شعر ہے:

حیاتک أنفاس تُعَدُّ فکلّما مضى نَفْسٌ منها انتقصت بها جزءاً

(تمہاری زندگی چند سانسوں کا نام ہے، جب تمہاری ایک سانس گزری تو گویا تمہاری زندگی میں اتنی کمی آگئی)

جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے زندگی میں کمی آتی جاتی ہے۔ اور زندگی گزرتی جا رہی ہے، ہم اس کو روک نہیں سکتے۔ حضرت خواجہ صاحب کا شعر ہے:

ہو رہی ہے عمر مثل برف کم چپکے چپکے رفتہ رفتہ دم بہ دم

## دوسرا مایہ:

حضرت مفتی شفیع صاحب فرماتے ہیں: سرمایہ دو طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) منجمد: ایسا سرمایہ کہ آدمی جب اس کو استعمال کرے تب وہ اس کے ہاتھ سے نکلے گا۔ اگر اس کو استعمال نہ کرے تو وہ باقی رہتا ہے۔ مثلاً: آپ کے پاس اگر ایک لاکھ روپے ہیں، تو یہ منجمد سرمایہ ہے۔ آپ ابھی استعمال نہ کرنا چاہیں، تو پیٹی یا تجوری میں رکھ دو، ایک مہینے کے بعد، ایک سال کے بعد، دو سال کے بعد اس کو نکال کر استعمال کر سکتے ہیں، وہ اپنی حالت پر باقی رہیں گے۔

(۲) سیال: یعنی جاری سرمایہ۔ مثلاً: آپ اس سے فوری طور پر فائدہ اٹھالیں تب تو ٹھیک ہے؛ ورنہ رفتہ رفتہ وہ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ جیسے: ایک بزرگ ایک مرتبہ بازار سے گزر رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی برف بیچ رہا ہے۔ وہ آواز لگا رہا تھا: لے لو اس آدمی کی چیز! جو ہر وقت اس کے ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے۔ برف تو پگھلتا رہتا ہے، اب وہ جتنا جلدی اس کو بیچ کر اس کے پیسے بنالے تب تو ٹھیک ہے، اور اگر برف جلدی نہیں



بکا تو وہ دھیرے دھیرے پگھل کر ختم ہو جائے گا۔ اس کا سرمایہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ہماری زندگی کے ایام بھی ایسے ہی ہیں۔<sup>۱</sup>

آج اگر ہم کو کوئی کام نہیں ہے تو آج کے دن کو ہم فریڈ کر کے رکھنا چاہیں، یا تجوری میں بند کر کے رکھنا چاہیں کہ آج تو کچھ کام نہیں ہے، چلو! اس دن کو محفوظ کر لیں، کبھی کام ہوگا تو اس دن کو ہم استعمال کریں گے۔ ایسا کر سکتے ہیں؟ نہیں۔ ہم اس کو بچا کر رکھ نہیں سکتے، وہ ہمارے ہاتھ سے نکلتا چلا جا رہا ہے۔ تو یہ ایک ایسا سیال سرمایہ ہے کہ اگر ہم اس سے ہاتھوں ہاتھ فائدہ اٹھالیں تب تو ٹھیک ہے؛ ورنہ ہم گھٹائے میں ہیں۔

اس کو ایک مثال سے یوں سمجھو کہ اگر کسی آدمی کے پاس سورت شہر کے کسی اعلیٰ مارکیٹ ایریا میں ایک بیکہ زمین ہے، جو کروڑوں کی قیمت کی ہے۔ یہ زمین ایسا منجمد سرمایہ ہے، جو اس کے ہاتھ سے اس وقت تک نہیں نکلے گا، جب تک اس کو بیچ کر اس سے نفع حاصل نہ کر لے۔ اور اس کے پاس پیسے بھی ہیں۔ کسی نے کہا کہ دیکھو! یہ بڑی موقع کی زمین ہے، اگر تم یہاں کوئی تجارتی سینٹر بناؤ، ایک بڑی عمارت بناؤ، جس میں دکانیں بھی ہوں، دفتر بھی ہوں، تو ان سے آپ کو کروڑوں کی شکل میں کرایہ ملے گا۔ چنانچہ اس نے اس زمین پر ایک بہت بڑی عمارت بنائی، دکانیں، آفسیں سب کچھ بنایا۔ اب وہ عمارت تیار ہو گئی۔ خود زمین، دکانیں، دفتر تو منجمد سرمایہ ہیں؛ لیکن اب ان دکانوں اور دفاتروں کو کرایے پر دے کر جو آمدنی حاصل کرے گا، تو وہ کرایہ ایک سیال سرمایہ ہے۔ اس طرح کہ عمارت تیار ہو گئی، آفسیں اور دکانیں بن گئیں، لوگ کرایے پر لینے آرہے ہیں: مجھے تمہاری دکان کرایے پر چاہیے، تو یہ کہتا ہے: ابھی نہیں! میں ذرا سوچتا ہوں! ابھی نہیں! ابھی نہیں! کرتے کرتے

(۱) معارف القرآن - سورہ عصر (حضرت مفتی شفیع صاحب عثمانی)۔

دو سال نکال دیے، تو اب دو سال کا جو کرایہ آسکتا تھا، اس نے اس کو ضائع اور برباد کر دیا۔  
الغرض دکانیں الگ سرمایہ، اور ان سے حاصل ہونے والا کرایہ الگ سرمایہ ہے۔ کرایہ سیال  
سرمایہ ہے، کرایہ پردے کر ہاتھوں ہاتھ نفع حاصل کرتا ہے، تو ٹھیک، ورنہ اتنا نقصان ہوگا۔  
آئندہ بھی جتنی دیر کرتا جائے گا اتنا مزید نقصان ہوگا۔

## گرمیوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹادی:

تو حقیقت یہ ہے کہ ہماری زندگی کے ان ایام کو ہم جتنا زیادہ اللہ کی اطاعت و فرماں  
برداری میں، عبادت میں، ذکر و تسبیح میں اور مامور بہ امور میں صرف کریں گے، تو ان اوقات  
کے ذریعے ہم آخرت کا ذخیرہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اگر ہم نے کچھ نہیں کیا، یہاں تک کہ  
یہ اوقات ہمارے ہاتھ سے نکل گئے، تو کم از کم یہ نقصان تو ضرور ہوا کہ ان اوقات میں ہم  
آخرت کی جو بڑی دولت حاصل کر سکتے تھے وہ حاصل نہیں کر پائے۔ اور اگر خدا نخواستہ ان  
اوقات کو ہم نے اللہ کی نافرمانی میں استعمال کیا، یہ تو اپنا ڈبل نقصان کیا۔ جب آدمی اپنی  
زندگی پر غور کرتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ ہر حال میں اس کے ہاتھ سے نکلی چلی جا رہی ہے، اور  
ہر آدمی نقصان اور گھٹاٹے میں ہے۔ سرمایہ اس کا کم ہوتا جا رہا ہے۔

جب سال پورا ہوتا ہے تو لوگ سال گرہ مناتے ہیں، اور خوشیاں مناتے ہیں؛  
اگرچہ یہ اسلامی طریقہ نہیں ہے، غیر اسلامی طریقہ ہے، لیکن لوگوں کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی  
یہ حرکت کرتے ہیں۔ سال گرہ منانے والے دعوتیں کرتے ہیں، خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ  
ہماری زندگی میں ایک سال بڑھ گیا، ہم بائیس سال کے تھے، اب تیس سال کے ہو گئے۔  
اکبر الہ آبادی بڑے حقائق پیش کرنے والے ہیں۔ انہوں نے ایسے لوگوں سے کہا ہے:

بڑھا کہاں؟ گھٹا ہے۔ مان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ساٹھ سال کی زندگی عطا فرمائی ہے، تو جب ایک سال ہوگا تو یوں کہا جائے گا کہ ساٹھ سال میں سے ایک سال کم ہوا۔ ہم لوگ تعبیر یوں کرتے ہیں کہ بڑھا۔ یہ دھوکا ہے۔ اکبر الہ آبادی اس کو اپنے شعر میں کہتے ہیں:

**جب سال گرہ ہوئی تو عقدہ یہ کھلا یہاں گرہ سے ایک اور برس جاتا رہا**

ہماری گانٹھ میں سے ایک برس گیا۔ پہلے زمانے میں لوگ پیسے اپنی اوڑھی ہوئی چادر کے کنارے میں باندھتے تھے۔ جیسے گجراتی میں کہتے ہیں: داندہ بندھا۔ تو گرہ میں سے یعنی اپنی جیب میں سے۔ یعنی جب سال گرہ ہوئی تو یہ بھید کھلا کہ اپنی جیب میں سے ایک سال گیا، بڑھا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ جو قیمتی سرمایہ عطا فرمایا ہے، اس سے جتنا زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہوا اٹھانا چاہیے۔ جو لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں وہ کامیاب ہیں، ورنہ ہاتھ سے یہ دولت نکلی چلی جا رہی ہے اور انسان گھٹاٹے میں ہے۔

**چالیس سال سے روٹی نہیں کھاتے تھے!!!**

اسی لیے ہمارے بزرگوں کے حالات میں سنتے ہیں کہ وہ ایک ایک منٹ کی اور ایک ایک لمحہ کی قدر کیا کرتے تھے!!! آپ نے فضائل کی کتابوں میں سنا ہوگا کہ شیخ علی جرجانی ایک اللہ والے تھے۔ وہ روٹی کھانے کے بجائے ستو پھانک لیا کرتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت! آپ صرف ستو پھانک لیا کرتے ہیں، روٹی نہیں کھاتے؟ تو فرمایا کہ میں نے حساب لگایا کہ روٹی کھانے میں چبانا پڑتا ہے، اس میں دیر لگتی ہے۔ لہذا میں ستو پھانک لیتا ہوں، تو مجھے ۷۰ مرتبہ سبحان اللہ زیادہ پڑھنے کا فائدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے متعلق لکھا ہے کہ ۴۰ رسال سے وہ روٹی نہیں کھاتے تھے، صرف ستو پھانکتے تھے؛

تاکہ جو وقت بچے اس کو تسبیح پڑھنے میں استعمال کریں۔<sup>۱</sup> آپ اندازہ لگائیں! جو آدمی اپنے کھانے کے ٹائم میں سے کٹنگ کر کے تسبیح پڑھتا ہو وہ کبھی دوسرے وقت کو ضائع کر سکتا ہے؟

## قرآن پاک کی پچاس آیتیں پڑھ سکتا ہوں:

حضرت داود علیہ السلام کے متعلق منقول ہے کہ وہ روٹی چبا کر کھانے کے بجائے پانی میں بھگو دیتے تھے۔ کھانے کے لیے روٹی آتی تو اس کو پانی میں بھگو دیتے تھے، جب نرم ہو جاتی تو منہ میں ڈال کر حلق سے نیچے اتار لیتے تھے۔<sup>۲</sup> روٹی کا مقصد ہے غذا، جب حلق سے نیچے جائے گی تب بھی وہ مقصد حاصل ہو جائے گا۔ البتہ بھگو کر کھانے کی وجہ سے لذت اور ذائقہ نہیں رہے گا۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ جب پلیٹ میں پانی کے ایک دو قطرے رہ گئے ہوں اور روٹی کا جو حصہ وہاں لگا ہوا ہے، وہ جب منہ میں آتا ہے تو ذائقہ نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا موڈ خراب ہو جاتا ہے؛ لیکن انہوں نے زندگی بھر اسی طرح روٹی کھائی۔ کیوں؟ وہ کہتے تھے کہ میں نے روٹی چبا کر کھانے اور بھگو کر کھانے کے درمیان حساب لگایا، تو معلوم ہوا کہ میں اتنی دیر میں قرآن پاک کی پچاس آیتیں پڑھ سکتا ہوں۔ یہ وہ حضرات تھے جو اپنی زندگی کے اوقات کو وصول کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ اور ایک ایک منٹ کی قدر کرتے تھے۔

آخرت کی تجارت بڑی نفع بخش ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو جو خصوصیات و

(۱) إحياء علوم الدين للغزالي، كتاب كسر الشهوتين، الفائدة السابعة: تيسير المواظبة على العبادة و الضوء اللامع للسخاوي: ۵/ ۳۲۸ - ۳۳۰ (ط: دار مكتبة الحياة، بيروت) والبدرا الطالع للشوكاني: ۱/ ۴۸۸ - ۴۹۰ (ط: دار المعرفة، بيروت).

(۲) حلية الأولياء للأصفهاني: ۴/ ۳۲۵ و ۴/ ۳۲۸ - ۳۵۰ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

انتیازات عطا فرمائے، ان میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نیکی کا بدلہ دس گنا رکھا ہے۔ یہ تو کم سے کم ہے، اور جب بڑھتے ہیں تو دس گنا سے سات سو گنا تک۔ اور اگر مال خرچ کیا جاتا ہے تو اس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے، **أَصْعَافًا مِّضَاعَةً** کا وعدہ فرمایا ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَتَتْ سَنَابِلَ سَبْعِ سَنَابِلٍ فِي كُلِّ سَنَابِلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللَّهُ يُضَعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ (البقرة-۲۶۱)

اللہ جس کو چاہیں اس کو سات سو سے بھی زیادہ دے سکتے ہیں۔ روزے کے متعلق وارد ہے کہ اس کا ثواب اللہ تعالیٰ دیتے ہیں۔ تو اس امت کو نیکیوں کا اتنا زیادہ بڑھا دیا ہے، جب آدمی اس کو سوچے اور آخرت کے لیے عمل کرے تو بہت کچھ ذخیرہ آخرت کے لیے جمع کر سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ اس عمر سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور ان کی عمر یوں ہی گزرتی جا رہی ہے وہ گھائے میں ہیں۔

## حیارات:

اسی کو کہا گیا: وَالْعَصَا، إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ۔  
(قسم ہے زمانے کی، بے شک انسان بڑے گھائے میں ہے)  
انسان سے مراد نوع انسانی ہے۔ البتہ کون لوگ گھائے اور خسارے میں نہیں ہیں؟  
جو چار کام کرتے ہیں، وہ گھائے اور خسارے میں نہیں ہیں:  
إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ کیے) گویا انہوں نے اپنی ذات کو ٹھیک کر لیا، کامل بن گئے، اپنے اندر کمال پیدا کر دیا۔  
وَتَوَّاصُوا بِالحَقِّ وَتَوَّاصُوا بِالصَّبْرِ (اور ایک دوسرے کو حق بات کی اور صبر کی نصیحت کریں) دوسروں کو حق بات اور صبر کی نصیحت کرنا، دوسروں کو درجہ کمال تک پہنچانا

ہے۔ خود کامل بنیں اور دوسروں کو کامل بنانے کے لیے محنت کریں، مکمل بنیں۔ یہ چار صفیتیں جس کے اندر ہوں گی وہ خسارے میں نہیں ہے۔

## ..... ہم خسارے سے نہیں بچ سکتے:

اس سے معلوم ہوا کہ خسارے سے بچنے کے لیے آدمی کا صرف اپنے طور پر کامل بن جانا کافی نہیں ہے۔ ہم نے ایمان قبول کر کے اعمال صالحہ کا اہتمام کر لیا، اپنی زندگی ٹھیک کر لی؛ پھر بھی ہم گھاٹے سے نکلے نہیں ہیں۔ گھاٹے سے نکلے ہوئے اس وقت کہلائیں گے جب دوسروں کی بھی اصلاح اور کمال کی فکر کریں گے۔ بالخصوص اپنے ماتحتوں اور جن پر ہمیں اقتدار و اختیارات حاصل ہیں، ان کو جب تک کامل و مکمل بنانے کی محنت نہیں کریں گے، حق کی نصیحت و وصیت نہیں کریں گے، تب تک ہم خسارے سے بچ نہیں سکتے۔

حق سے مراد عقائد حقہ اور اعمال صالحہ اور صبر سے مراد گناہوں سے بچنے کی تاکید ہے۔ بعض حضرات نے حق سے مراد صرف عقائد حقہ، اور صبر سے اعمال صالحہ اور گناہوں سے بچنے کی تاکید دونوں کو شامل کر لیا ہے، یعنی یہ دونوں کام بھی ساتھ ہونے چاہیے۔ جب تک یہ نہیں ہوگا تب تک آدمی اپنے آپ کو خسارے اور گھاٹے سے نہیں بچا سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ گھاٹے سے بچنے کے لیے صرف اپنے آپ کو ٹھیک کر لینا کافی نہیں ہے؛ بلکہ دوسروں کو کامل بنانے کے لیے محنت کرنا بھی ضروری ہے۔ حق اور صبر کی وصیت اور گناہوں سے بچنے کی تاکید، یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضروری ہے، اس کے بغیر آدمی اپنے آپ کو خسارے اور گھاٹے سے نہیں بچا سکتا۔

## جب کوئی برائی دیکھے تو.....

امر بالمعروف کے سلسلے میں آپ نے فضائل تبلیغ میں سنا ہوگا، بخاری شریف میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے: حضور ﷺ نے فرمایا: **من رأى منكم منكراً فليغيره بيده**. (تم میں سے کوئی آدمی جب کوئی غلط کام دیکھے، تو اس کو اپنے ہاتھ سے سدھارے) **ومن لم يستطع فبلسانه** (جو اس کو ہاتھ سے روکنے اور سدھارنے کی طاقت نہیں رکھتا وہ اپنی زبان سے روکے) **ومن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيمان**. (اور جو ہاتھ سے بھی درست کرنے کی طاقت نہیں رکھتا وہ اپنے دل سے اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے) <sup>(۱)</sup>

## ہاتھ سے روکنے کا مطلب:

ہاتھ سے روکنے کی طاقت سے مراد یہ ہے کہ اس کو اقتدار حاصل ہو۔ علماء نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو لوگ صاحب اقتدار ہیں وہ اپنے ہاتھ سے برائیوں کو دور کرنے کا اہتمام کریں۔ صاحب اقتدار، مثلاً: بادشاہ وقت ہے، حاکم وقت ہے یا اس کے ماتحت مختلف علاقوں کے حکام، جن کو بادشاہ کی طرف سے حاکم بنایا گیا ہے، وہ اپنے اس اقتدار سے جس علاقے پر ان کو حکومت حاصل ہے، اس سے برائیوں کو دور کر سکتے ہیں، کوئی ان کو روکنے والا نہیں ہے۔ اگر ان کے پاس طاقت ہے، تو اس طاقت کے ذریعے سے وہ ان برائیوں کو دور کر سکتے ہیں۔ طاقت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فلاں برا کام کر رہا ہے تو میں ڈنڈا لے کر جاؤں۔ نہیں! اگر آپ ڈنڈا لے کر جائیں گے، تو وہ آپ کے مقابلے پر

آئے گا، اور پھر جھگڑے ہوں گے۔ شریعت نے ہاتھ سے دور کرنے کا حکم اسی کو دیا ہے جس کو اقتدار حاصل ہو۔

اقتدار کی مختلف شکلیں ہیں۔ بعض حضرات کو محدود اقتدار حاصل ہوتا ہے، جیسے اپنے گھر میں ہم میں سے ہر ایک کو اپنی بیوی، اپنی اولاد اور اپنے ماتحتوں پر اقتدار حاصل ہے۔ اگر وہ کوئی برا کام کر رہے ہیں تو ہم طاقت سے ان کو روک سکتے ہیں۔ وہاں یہ کام کرنا چاہیے، نہیں کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ اس کے علاوہ دوسروں کو وہی روکے جو صاحب اقتدار ہو، اقتدار نہ ہو تو وہاں دوسرا طریقہ ہے۔

## ایمان کا کمزور درجہ:

ومن لم يستطع فبلسانہ۔ زبان سے روکے۔ اگر ہم لوگوں کو برائی کرتا ہوا دیکھیں اور ہمارے پاس اقتدار نہیں ہے، تو ڈنڈا لے کر نہیں جائیں گے؛ بلکہ ان کو زبان سے روک دیں گے، ان چیزوں کی برائی ان کے سامنے بیان کریں گے، نیکی کا کام ہے تو اس کی اہمیت اور فضائل بیان کریں گے، اور اس پر عمل کرنے کے لیے آمادہ کریں گے۔ اس کے بعد وہ عمل نہ کرے تو ہماری جو ذمہ داری تھی وہ پوری ہو گئی۔ فبلسانہ۔ اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو کہ زبان سے روکنے کی صورت میں سامنے والے کی طرف سے شدید اور ناقابل برداشت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو اس صورت میں صرف دل سے برا سمجھے؛ لیکن یہ ایمان کا کمزور درجہ ہے۔

## وصیت کے معنی:

بہر حال! وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۖ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۚ میں بھلی باتوں کا حکم اور بری باتوں



سے روکنا ہے۔ جس کو **تواصی** سے تعبیر کیا ہے۔ وصیت دراصل اس نصیحت کو کہتے ہیں جو آدمی موت کے وقت اپنے متعلقین کو کرتا ہے۔ وہ بڑی تاکید اور دل سوزی کے ساتھ کی جاتی ہے، بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ کی جاتی ہے، اس لیے اس کو وصیت سے تعبیر کیا گیا ہے، تو گویا آپ بھی کسی کو بھلی بات کا حکم کریں تو اسی انداز سے کریں۔ بھلی بات کا حکم کرنے میں بھی ہمارا طریقہ درست ہو۔

## حق بات حق طریقے سے:

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ حق بات، حق نیت سے اور حق طریقے سے اگر کہی جائے تو کبھی نقصان نہیں کرتی۔ (اصلاحی خطبات ۸/۳۵) بعض لوگ یوں کرتے ہیں کہ میں بڑا ہوں، میری بزرگی ان کے سامنے ظاہر ہو، اپنی بڑائی ظاہر کرنے یا سامنے والے کو بے عزت کرنے والا انداز اختیار کریں تو یہ نیت درست نہیں ہے۔ نیت بھی درست ہے؛ لیکن اس کے لیے لوگوں کے ساتھ جو طریقہ اپناتا ہے، وہ اس انداز سے کہتا ہے کہ سننے والا اپنی بے عزتی محسوس کرتا ہے، تو بہت سی مرتبہ یہ طریقہ ہی سامنے والے کو ضد پر آمادہ کرتا ہے، وہ بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

بہر حال! تینوں باتوں کا دھیان رکھنا چاہیے۔ بات بھی درست ہو، صحیح نیت سے کہنا چاہیے اور صحیح طریقہ سے کہنا چاہیے تو ان شاء اللہ کبھی نقصان نہیں ہوگا۔ تو جو لوگ ایمان اور عمل صالح سے اپنے آپ کو کامل بنا لیتے ہیں اور دوسروں کو کامل بنانے کے لیے آپس میں ایک دوسرے کو حق کی اور صبر کی نصیحت کرتے رہتے ہیں وہ البتہ گھائے میں نہیں ہیں۔ ان کا استثناء کر دیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورہ ہمزہ

(مورخہ: ۱۸ صفر ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۷ اکتوبر ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً .  
أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم ٠ بسم الله الرحمن الرحيم ٠

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۚ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۚ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۚ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۚ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۚ نَارُ اللَّهِ الْمُبْقَدَةُ ۚ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْآفِئَةِ ۚ إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّوَصَّدَةٌ ۚ فِي عَمَدٍ مُّبَدَّدَةٍ ۚ

## وجہ تسمیہ:

یہ سورہ ہمزہ ہے۔ چوں کہ اس کی پہلی آیت میں لفظ ہمزہ آیا ہے، اس مناسبت سے اس کا نام سورہ ہمزہ رکھا گیا۔

## شان نزول:

اس سورت کے شان نزول کے سلسلے میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا شروع کیا اور رفتہ رفتہ لوگ آپ ﷺ پر ایمان لانے لگے اور ایمان والوں کا حلقہ آہستہ آہستہ بڑھنے لگا، تو مکہ کے سردار قسم کے لوگوں نے محسوس کیا کہ اگر اس طرح ان کے ماننے والوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جائے گی، تو ہماری چودھراہٹ اور ہماری ریاست خطرے میں پڑ جائے گی، چناں چہ جب انہوں نے خطرہ محسوس کیا، تو حسد، عداوت اور بغض کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کی غیبت اور آپ ﷺ پر طعن و تشنیع شروع کر دی۔ وہ اپنی مجلسوں میں غائبانہ نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کی برائیاں کرتے تھے، اور باقاعدہ اس کا پروپیگنڈہ شروع کیا۔ اور بسا اوقات ان میں سے بعض تو روبہ رو نبی کریم ﷺ کو اور مسلمانوں کو طعن و تشنیع کرتے تھے۔ اور اس کو انہوں نے اپنا مشغلہ اور مشن بنا لیا تھا۔ بعض لوگوں کے نام بھی مختلف روایات میں وارد ہوئے ہیں مثلاً: اخنس بن شریق ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف، جمیل بن عامر جحی اور ابی بن خلف۔ یہی مکہ مکرمہ کے سردار قسم کے لوگ تھے۔ اور یہی لوگ حضور ﷺ اور مسلمانوں کی برائیاں (پیٹھ پیچھے اور سامنے) اور طعن و تشنیع کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ اس پرتسلی کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر یہ سورت نازل فرمائی۔<sup>۱</sup>

اس سورت میں کسی کا نام نہیں لیا گیا، بلکہ ان کی برائیوں اور کرتوت کو ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ جو لوگ بھی ایسے کرتوتوں کے مرتکب ہوں گے، اُن

(۱) تفسیر الطبری و بحر العلوم للسمرقندی و معالم التنزیل للبغوی.

کے لیے وہی وعیدیں ہیں، جو ان کے لیے اس سورت میں بیان کی گئی ہیں۔

### العبرة لعموم اللفظ:

حضرات اصولیین کا قاعدہ ہے کہ کوئی آیت کسی خاص شخصیت کے سلسلے میں، اس کے کسی خاص عمل کی وجہ سے نازل ہوئی، تو وہ اُسی کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی؛ بلکہ اس قسم کی حرکت جو بھی کرے گا، وہ اس میں شمار کیا جائے گا۔ یہاں بھی ایک عمومی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اُن کے ان کرتوتوں اور ایذا رسانیوں کی وجہ سے نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو بہت تکلیف پہنچتی تھی۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ پر باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ ﴿٩٤﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ﴿٩٥﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ﴿٩٦﴾ (الحجر)** (اے نبی! ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اُن کی باتوں سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے، لیکن [ہم آپ کو یہ تاکید کرتے ہیں کہ] آپ اپنے رب کی پاکی حمد و ثنا کے ساتھ بیان کیجیے اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونے والے بیٹے، اور اللہ کی عبادت میں لگے رہیے موت تک) گویا ان کے ان طعنوں، غیبت اور شرارتوں کا کوئی جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیگر مقامات پر بھی ان چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اور یہی تلقین کی گئی ہے کہ صبر اور تقویٰ سے کام لیا جائے۔ یہاں اس سورت میں ان کی ان ہی حرکتوں کو ذکر فرما کر اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے وعید سنائی گئی ہے۔

### ہمزہ اور لمزہ کی تحقیق:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ

ہمزہ اور لمزہ دونوں فُعْلَةٌ کے وزن پر ہیں، یہ مبالغے کے صیغے ہیں، ہمزہ: یعنی

بڑی خرابی ہے اس آدمی کے لیے جو پیٹھ کے پیچھے دوسروں پر عیب لگانے والا ہے۔ **لمزہ**: منہ پر طعنہ دینے کے عادی کو کہتے ہیں۔ <sup>۱</sup> بعض حضرات مفسرین اور اہل لغت نے اس کے برعکس بھی ترجمہ کیا ہے۔ یعنی **ہمزہ** کا ترجمہ طعنہ دینے والا اور **لمزہ** کا ترجمہ پیٹھ پیچھے برائی کرنے والا۔ صاحب تفسیر قرطبی نے یہ دونوں چیزیں بیان کی ہیں۔ <sup>۲</sup> لیکن عام طور پر ہمارے اکابر جو اردو میں ترجمہ کرتے ہیں وہ اسی کو اختیار کرتے ہیں کہ **ہمزہ**: غائبانہ دوسروں پر عیب لگانے والا، اور **لمزہ**: منہ پر طعنہ دینے کا عادی۔

## اس کو اپنے مال پر اعتماد ہے:

**ویل** بہت بڑی خرابی، ہلاکت اور بربادی کو کہتے ہیں۔ گویا اس سے ہر اس آدمی کو بہت بڑی بربادی اور ہلاکت کی وعید سنائی گئی، جو لوگوں کو تکالیف پہنچاتا ہے اور پیٹھ پیچھے عیب لگاتا ہے، اور منہ زبانی طعن و تشنیع کرتا ہے۔

الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ. (جس نے مال اکٹھا کیا اور گن گن کر رکھا)

ان دونوں باتوں کے ذکر کرنے کی وجہ کیا ہے؟ وہ بھی بتلائی۔ اس لیے کہ دراصل اس نے مال جمع کر رکھا ہے، اور اس سے محبت ہے۔ اور اس کو اپنے مال پر اس قدر اعتماد ہے کہ وہ یوں سمجھتا ہے کہ میری مال کی فراوانی اور دولت کی وجہ سے کوئی میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ اس لیے وہ ایسی حرکتیں کرتا ہے۔

(۱) نقلہ الطبري عن مجاهد.

(۲) نقلہ الطبري عن مجاهد قبله.

## تین برائیاں:

الحاصل! اس سورت میں تین برائیوں کی طرف خاص طور سے تنبیہ کی گئی ہے:

(۱) غائبانہ اُن لوگوں پر عیب لگانا جو بری ہیں۔ یہ کہہ کر گویا مسلمانوں کو بھی متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اپنے آپ کو ایسے کرتوتوں اور حرکتوں سے باز رکھو، ورنہ یہی وعید تم پر بھی صادق آسکتی ہے۔

(۲) گن گن کر رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مال کو خرچ نہیں کرتا ہے۔

(۳) اس میں لالچ اور حرص ہے، اس کی وجہ سے مال جمع کرتا ہے۔ اور بخل کی وجہ سے گن گن کر رکھتا ہے، خرچ نہیں کرتا ہے۔

## مال کے ذریعے بھی اللہ کا قرب:

کوئی آدمی شریعت کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق، جائز طریقے سے مال کمائے، اور اللہ تعالیٰ نے جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہاں خرچ کرے، بخل سے کام نہ لے، مالی حقوق کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ کرے، تو کوئی حرج نہیں۔ مال بھی اللہ کی ایک نعمت ہے، اس کے ذریعے سے آدمی اللہ کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔

## اللہ کی حبلائی ہوئی آگ:

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ (وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا)  
گویا اس کو اپنے مال پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ یوں سمجھتا ہے کہ اس مال کی وجہ سے میں ہمیشہ رہوں گا، یہ مال مجھے ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ حالاں کہ اس دنیا میں کون ہمیشہ زندہ رہنے

کے لیے آیا ہے؟ یہ دنیا ہی باقی رہنے والی نہیں ہے!!! كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ. (الرحمن: ۲۶) ہر ایک کو دنیا سے جانا ہے۔

یہاں تک اللہ تعالیٰ نے ان کی عادتیں اور خصلتیں بتلائیں۔ آگے وعید سنائی جا رہی ہے۔ ویل کہہ کر وعید سنائی تھی۔ اب مزید سنائی جا رہی ہے۔

كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ. (ہرگز نہیں!) اس کو تو ایسی جگہ میں ڈالا جائے گا جو اس کو چورا چورا کر دے گی)

حَطَمٌ يَّحْطِمُ کے معنی ہیں کسی چیز کو توڑ پھوڑ کر چورا بنا دینا۔ تو جہنم میں آگ کا ایک طبقہ ہے، اس طبقے کا نام حطمة ہے، اس کو اس میں ڈالا جائے گا، جو اس کے جسم کو توڑ پھوڑ کر چورا چورا کر دے گا۔

وَمَا أَذْرٰكَ مَا الْحُطَمَةُ (اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ چورا چورا کرنے والی چیز کیا ہے؟) یعنی جس جگہ میں اس کو ڈالا جائے گا، جو چورا چورا کرنے والی اور توڑ پھوڑ کرنے والی ہے، وہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ آگے اس کی وضاحت فرماتے ہیں۔

نَارُ اللَّهِ الَّتِي تَلْقٰهُ. (اللہ کی جلائی ہوئی آگ ہے)  
الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْآفِئَةِ. (جو دلوں پر غالب آ جاتی ہے)

## دلوں کو جلا نے والی آگ:

دیکھو! دنیا میں اگر کسی آدمی کو آگ میں ڈالا جائے، تو پہلے آگ اس کی کھال پر اثر کرتی ہے، پھر اس کے بعد گوشت، پھر ہڈی پر۔ اور عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اسی میں آدمی کی موت واقع ہو جاتی ہے، اور دل تک اس کا اثر پہنچنے کی نوبت نہیں آتی۔ لیکن جب جہنمیوں

کو جہنم میں ڈالا جائے گا، تو جہنم میں لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ۔ (الاعلى: ۱۳) (وہ نہ تو مرے گا، نہ زندہ رہے گا) یعنی وہ زندگی، زندگی نہیں ہے۔ موت نہیں آئے گی۔ جب موت نہیں آئے گی، تو دنیا میں تو آگ کا اثر دل تک پہنچے اس سے پہلے موت آ جاتی ہے اس لیے وہ اثر نہیں پہنچ پاتا؛ لیکن جہنم میں تو دل پر بھی اثر پہنچے گا۔ لہذا وہ اس کے لیے بہت زیادہ تکلیف دہ ہوگی۔

## حپار گرمیاں:

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ فرماتے ہیں کہ دنیا میں ایک تو آگ کی گرمی ہوتی ہے، جس کی کیفیت تو سب جانتے ہیں۔ دوسری سورج کی گرمی ہوتی ہے۔ گرمی کے زمانے میں سورج جب قریب آتا ہے، اس کی وجہ سے لوگوں کو کتنی تکلیف محسوس ہوتی ہے؟ لوگ اے سی (A.C.) میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اور تیسری گرمی آدمی کے اندر کی ہوتی ہے۔ آدمی کو جب بخار آتا ہے تو اس کے جسم کی گرمی ہوتی ہے۔ تو بخار کی گرمی کی وجہ سے آدمی بہت زیادہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔ بخار اندر ہی اندر ہے، اس لیے اس کو تکلیف کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ البتہ بخار مسامات کے ذریعے، پسینے کی شکل میں باہر نکل جائے تو کچھ چین و سکون محسوس ہوتا ہے۔ یہ تین قسم کی گرمیاں ہیں جس کو لوگ جانتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہاں چوتھی قسم کی گرمی بیان کی ہے، وہ اللہ کی جلالتی ہوئی آگ ہے۔ تو جس گرمی سے لوگ دنیا میں واقف نہیں ہیں۔ اسی کو فرمایا جارہا ہے: نَارُ اللَّهِ الْمُبْقَدَةُ (اللہ کی جلالتی ہوئی آگ) النَّارُ تَطْدَعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ (جو دل کے اندر تک جا پہنچے گی) ۱

(۱) تفسیر عزیزی: ۶۴۲ (کتب خانہ فیض ابرار، انگلشور، گجرات)۔



## نا قابل برداشت آگ:

إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّوَصَّدَةٌ (بے شک وہ ان پر بند کر دی جائے گی)۔

آگ اگر کھلی ہو تو اس کا اثر دھیرے دھیرے کم ہو جاتا ہے؛ لیکن اگر آگ کو بند کر دیا جائے، تو اس صورت میں اس کی شدت اور تاثیر مزید تیز ہو جاتی ہے۔ گویا آگ کو باہر نکلنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ جیسے کسی بند ڈبے میں رکھا جائے۔

فِي عَذَابٍ مُّتَدَاةٍ (وہ آگ کے لمبے لمبے ستونوں میں گھرے ہوئے ہوں گے)

یعنی جہنم میں آگ کے ایسے لمبے شعلے ہوں گے، جو چاروں طرف سے ایسے معلوم ہوں گے جیسے ان کو آگ کے ستونوں میں بند کر دیا گیا ہو۔ تو اس آگ کی شدت ناقابل برداشت ہوگی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو یہ وعیدیں سنائیں۔

## ایک وقت آئے گا:

حاصل یہ ہے کہ جو لوگ ایسی حرکتیں کرتے ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ان کو بتلادیا گیا ہے کہ آج وہ اپنے مال و دولت کی فراوانی کی وجہ سے، اور اپنے روپیے پیسے پر اترانے کی وجہ سے یوں سمجھتے ہیں کہ کون ہمارا کچھ بگاڑ سکتا ہے؟ لیکن ایک وقت آئے گا کہ موت آئے گی اور پھر اللہ تعالیٰ ان کو جہنم کے اس طبقے میں ڈالیں گے، جہاں ان پر یہ عذاب سختی کے ساتھ مسلط کر دیا جائے گا۔ بہر حال! نبی کریم ﷺ کے ساتھ جن لوگوں نے اس طرح کا معاملہ کیا تھا ان کے لیے یہ وعیدیں ہیں۔

## آج بھی ایسے لوگ ہیں.....!!!

اور یہ اُسی زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ آپ ﷺ جب تک دنیا میں رہے،

آپ ﷺ کے ساتھ اس طرح کا معاملہ ہوا۔ آپ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آج بھی دنیا میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو۔ نعوذ باللہ۔ نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں، آپ ﷺ پر عیب لگاتے ہیں، آپ ﷺ کو طعن دیتے ہیں۔ تو یہ بات اسی زمانہ کے ساتھ خاص نہیں تھی۔ آج بھی لوگ ایسا کرتے ہیں۔ جیسے ایک شخص نے ساری دنیا کے کارٹون بنانے والوں کو۔ نعوذ باللہ۔ دعوت دی تھی، کہ فیس بک پر نبی کریم ﷺ کے کارٹون بنائے جائیں، اور اس کے لیے بہت بڑا انعام بھی رکھا۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ تو ہین کے اس معاملے پر ان لوگوں کے لیے بھی یہی وعید ہے۔ کہ دنیا میں ایسے کم بخت رذیل اور کمینے لوگ ہیں کہ جو دلیل سے بات نہیں کرتے، جب ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی، تو وہ اس طرح سب و شتم، گالی گلوچ اور برائی پر اتر آتے ہیں۔ دنیا کا دستور یہی ہے کہ جب کسی کے پاس دلیل نہیں ہوا کرتی، تو وہ دوسرے طریقے اور ہتھکنڈے اپناتا ہے۔ یہاں بھی اسی طرح ہو رہا ہے کہ جو اپنے آپ کو جدید تہذیب کے دعوے دار کہتے ہیں، حقوق انسانی کے علم بردار کہتے ہیں وہ بھی۔ نعوذ باللہ۔ نبی کریم ﷺ کی شان میں اسی طرح گستاخیاں اور برائیاں کرتے ہیں۔ اور اس کے لیے لوگوں کو باقاعدہ دعوت دی جا رہی ہے، ان کے لیے یہ سب وعیدیں ہیں۔

## اہل ایمان کی آزمائش:

اس میں خود اہل ایمان کے ایمان کی بھی بڑی آزمائش ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ کی جانے والی اس گستاخی پر آپ کیا ایکشن لے رہے ہیں؟ آپ اس کا کیا جواب دے رہے ہیں؟ گویا ہمارے ایمان کو چیلنج کیا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی محبت تو ہمارے

ایمان کا جزو ہے۔ لایؤمن أحدکم حتی اکون أحب إلیه من نفسه ووالده وولده والناس أجمعین۔ (نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی آدمی مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کی جان، باپ، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں) (۱) جب تک حضور ﷺ کی محبت سب کی محبت پر غالب نہ ہو، تب تک آدمی کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ آپ ﷺ کی شان میں اس طرح کی گستاخیاں کر کے اہل ایمان کو غیرت دلائی جا رہی ہے، اور چیلنج کیا جا رہا ہے کہ ان کو چاہیے کہ ایسا کرنے والوں کی اس حرکت پر اپنا تاثر دیں۔ وہ تاثر کیا ہے؟ جوش میں آکر ان کو گالیاں دینے کے بجائے ایسا جواب دینا چاہیے، جو ان پر اثر انداز ہو۔

## فیس بک کا استعمال چھوڑ دیجیے:

اور وہ جواب کیا ہے؟ حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے کسی موقع پر فرمایا تھا کہ یہ فیس بک ہے، اسی کے ذریعے یہ لوگ ایسی حرکت کرتے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ جب کوئی آدمی فیس بک کو کلک کرتا ہے تو ایک مرتبہ کلک کرنے پر فیس بک والے کو ڈھائی ڈالر کا فائدہ ہوتا ہے۔ تو یہ لوگ ایسے لاکھوں ڈالر کماتے ہیں۔ آپ اس فیس بک کے استعمال کو چھوڑ دیجیے۔ ہم لوگ کثرت سے موبائل استعمال کرنے کی وجہ سے اس کے ایسے عادی بن چکے ہیں کہ ہم اپنے دشمنوں کو، حضور ﷺ کی برائی کرنے والوں کو، نادانستہ طور پر فائدہ اور طاقت پہنچا رہے ہیں۔ ان کا جواب یہی ہے کہ جب پیسے کی مار پڑے گی، تو سیدھے ہو جائیں گے۔ آپ ان کے خلاف احتجاج کرتے رہو، وہ اس کا کوئی

(۱) صحیح البخاری: ۱۵ و صحیح مسلم: ۴۴۔

اثر قبول نہیں کرتے۔ لیکن جب پیسے کی مار پڑتی ہے، تو وہ خود بخود سیدھے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اہل ایمان کی ایمانی غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ ان چیزوں کو استعمال نہ کریں؛ تاکہ اس کی وجہ سے جو نقصان ہو تو وہ خود ہی ایسی چیزوں سے باز آجائیں گے۔

## یہی اصل جواب ہے:

حاصل یہ ہے کہ یہ وعید آپ ﷺ کے زمانے میں مکہ مکرمہ کے سردار ایسی حرکتیں کرتے تھے، ان کے لیے اصل تو اس سورت میں نازل ہوئی؛ لیکن ان کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ ہمارے اس ملک میں بھی ایسے لوگ ہیں جو۔ نعوذ باللہ۔ نبی کریم ﷺ کی شان میں ایسے گستاخانہ الفاظ استعمال کرتے ہیں، جس کو ہم پڑھتے ہیں تو ہماری ایمانی غیرت جوش میں آ جاتی ہے۔ لہذا اُن کو ایسے انداز میں جواب دینا چاہیے، جس سے ان کو نقصان پہنچے۔ یہی اصل جواب ہے۔ جوش میں آ کر ایسا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے کہ ان کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، ہم بلا وجہ بدنام ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورہ فیل

(مؤرخہ ۱۱/صفر المظفر ۱۴۴۰ھ مطابق ۲۰/اکتوبر ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل  
عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله  
من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له  
ومن يضلل الله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك  
له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة  
الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله  
تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً .  
أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم ۝ بسم الله الرحمن الرحيم ۝

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ۝<sup>(۱)</sup> أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ  
۝ وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ۝<sup>(۲)</sup> تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ۝<sup>(۳)</sup> فَجَعَلَهُمْ  
كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۝<sup>(۴)</sup>

## وجہ تسمیہ:

یہ سورہ فیل ہے۔ فیل عربی زبان میں ہاتھی کو کہا جاتا ہے۔ یہ اصل میں فارسی زبان  
میں لفظ فیل تھا، اور اسی کو عربی میں منتقل کیا گیا، تو ”پ“ کو ”ف“ سے بدل کر فیل ہو گیا۔ اہل

عرب بھی ہاتھی کو فیل ہی کہتے ہیں۔ اس سورت میں بھی ہاتھی والوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے اس لیے اس کا نام سورہ فیل ہے۔

## عام الفیل:

اس سورت میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہ نبی اکرم ﷺ کی ولادت سے پہلے پیش آیا۔ ربیع الاول ۶۰ھ میں نبی کریم ﷺ کی ولادت ہوئی۔ اور یہ واقعہ آپ ﷺ کی ولادت سے ۵۰ یا ۵۵ دن پہلے محرم میں پیش آیا۔ اسی لیے جہاں آپ ﷺ کی ولادت کا تذکرہ کیا جاتا ہے، وہاں مؤرخین لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت عام الفیل میں ہوئی۔

## واقعہ فیل:

واقعہ یہ ہے کہ یمن میں پہلے شاہان حمیر کی حکومت تھی۔ ان کا سب سے آخری بادشاہ ذونو اس تھا۔ یہ لوگ بت پرست تھے، اس زمانے میں یمن ہی میں کچھ لوگ نصرانی بھی تھے، حضرت عیسیٰ علیٰ نبیہا وعلیہ الصلاۃ والسلام پر ایمان رکھنے والے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے والے تھے۔ یہ بادشاہ بت پرست تھا، لہذا اس نے اہل ایمان پر بڑے مظالم ڈھائے۔ اس نے ایک بہت بڑی، لمبی چوڑی خندق کھدوائی اور اس کو آگ سے بھر دیا، اور اس میں تقریباً بیس ہزار (۲۰۰۰۰) ان عیسائیوں کو جو خدائے واحد کی عبادت کرنے والے تھے۔ ڈال کر ختم کر دیا۔ یہ اصحاب اخدود کا واقعہ ہے، جو قرآن کریم میں، سورہ بروج میں ہے۔ اس میں سے دو آدمی کسی طرح بھاگ کر نکل گئے اور ملک شام پہنچے۔ وہاں قیصر روم کی حکومت تھی، اس حکومت سے انہوں نے ذونو اس جو شاہان حمیر میں سے ہے۔ کی شکایت

کی کہ اس نے نصاریٰ (خدائے واحد کی عبادت کرنے والوں) پر مظالم ڈھائے ہیں۔ تو اس سے انتقام لیا جائے۔

## یمن میں شاہِ حبشہ کی حکومت:

قیصر کے پاس جب شکایت پہنچی، تو قیصر نے حبشہ کے بادشاہ کو خط لکھا، وہ بھی نصرانی تھا اور یہ واقعہ چوں کہ یمن میں پیش آیا تھا، اور یمن حبشہ سے قریب ہے۔ (بحر احمر کے شمال میں یمن ہے، جنوب میں براعظم افریقہ ہے، اور وہیں حبشہ (ایتھوپیا) واقع ہے) الغرض قیصر روم نے حبشہ کے بادشاہ کو خط لکھا کہ تم اُس سے انتقام لو۔ چناں چہ اس نے ایک عظیم الشان فوج اپنے دو کمانڈروں ارباط اور ابرہہ کی ماتحتی میں یمن بھیجی۔ اور انہوں نے ایسا زوردار حملہ کیا کہ یمن کو ذونواس کی حکومت اور اس کے مظالم سے نجات دلائی۔ ذونواس تو بھاگ گیا اور سمندر میں ڈوب گیا اور اس کی موت واقع ہوئی۔ اور اب یمن میں شاہِ حبشہ کا جوشکر آیا تھا اس کی حکومت قائم ہوئی۔

## کنیسہ کی تعمیر:

بعد میں ان دونوں کمانڈروں میں بھی ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے لیے آپس میں مقابلہ ہوا، اس میں ابرہہ دوسرے پر غالب آیا، اور شاہِ حبشہ نے پھر اسی کو یمن میں اپنا گورنر مقرر کیا۔ اس طرح شاہِ حبشہ کا تسلط یمن میں ہوا۔ ابرہہ چوں کہ نصرانی مذہب کا ماننے والا تھا اور بڑا پر جوش تھا، تو اس نے سوچا کہ میں ایک بہت بڑا کنیسہ تعمیر کروں۔ چناں چہ اپنی اس سوچ کے مطابق اس نے قُلَیْس نام کا ایک بڑا کنیسہ تعمیر کروایا۔ اس کی اونچائی اتنی تھی کہ اگر کوئی آدمی اس کے نیچے کھڑا رہ کر دیکھے تو اس کی اونچائی تک اس کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی

تھی۔ اور اس کو سونے، چاندی اور جواہرات سے مرصع کیا، اور بہت شاندار بنایا۔ اور بنانے کے بعد اس نے لوگوں میں اعلان کیا کہ تم لوگ مکہ مکرمہ میں کعبہ کی زیارت اور حج کے لیے جاتے ہو، تو وہاں جانے کے بجائے یہاں آکر عبادت کیا کرو۔

### ابرہہ کی قسم:

یمن کے عربوں میں اگرچہ بت پرستی رائج ہو چکی تھی؛ لیکن دین ابراہیمی اور اسی طرح کعبۃ اللہ کی محبت ان کے مزاجوں میں پیوست تھی، تو یہ اعلان ان کو بہت گراں گزرا، اور ان تمام قبائل میں جو عرب تھے: عدنان، قحطان، قریش تمام میں غم و غصہ کی ایک لہر پھیل گئی۔ اور وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ ان میں سے ایک آدمی اس کنیسہ میں جا کر پاخانہ کر کے آگیا۔ اور جب ابرہہ کو پتا چلا تو اس کو بہت غصہ آیا۔ اور ایک قافلہ اس کنیسہ کے قریب ٹھہرا ہوا تھا، اس نے اپنی ضرورت کے لیے آگ جلائی تھی، پھر وہاں سے اس آگ کو جلتا ہوا چھوڑ کر روانہ ہو گیا، تو وہ آگ پھیلی اور کنیسہ کے کچھ حصے کو بھی جلا دیا، اور نقصان پہنچایا، تو ابرہہ کو اور زیادہ غصہ آیا۔ اور اس نے قسم کھائی کہ جس کعبہ کے خاطر انہوں نے میرے کلیسا کے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔

### کعبۃ اللہ کو ڈھانے کی پلاننگ:

چنانچہ اس نے ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا اور کعبہ پر حملہ کرنے کے لیے پہلے تو اس نے شاہ حبشہ سے اجازت مانگی۔ تو شاہ حبشہ نے صرف اجازت ہی نہیں دی؛ بلکہ اپنا ایک عظیم الشان اور بے نظیر ہاتھی، جس کا نام محمود تھا، وہ بھیجا کہ اس پر بیٹھ کر حملہ کرو، اور اس کے علاوہ بھی آٹھ بڑے بڑے ہاتھی بھیجے؛ تاکہ ان کے ذریعے کعبۃ اللہ کی عمارت کو ختم کرنے



میں مدد لی جاسکے۔ تجویز یہ تھی کہ کعبۃ اللہ کی عمارت جن ستونوں پر قائم ہے ان ستونوں کو لوہے کی زنجیروں سے باندھ کر ان زنجیروں کو ان ہاتھیوں کی گردنوں میں ڈالا جائے اور چلایا جائے؛ تاکہ پورا کعبہ - نعوذ باللہ - اکھڑ کر ختم ہو جائے۔ بہر حال! ساٹھ ہزار (۶۰۰۰۰) کی فوج اور ان ہاتھیوں کو لے کر کعبۃ اللہ کو ڈھانے کے لیے ابرہہ روانہ ہوا۔

## درمیانی طاقتوں سے مقابلہ:

چوں کہ خود یمن میں بھی عرب آباد تھے، جن کے دلوں میں کعبۃ اللہ کی محبت پیوست تھی، وہ سب اس کے مقابلے کے لیے جمع ہوئے۔ اور ذونفر نامی ایک آدمی کی ماتحتی میں وہ ابرہہ کے لشکر کے مقابلے پر آئے؛ لیکن اس کو شکست ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ یہ آگے بڑھے، اور اس پر اللہ کا عذاب آئے۔ شکست ہوئی تو ابرہہ نے ذونفر کو قید کر لیا۔ ارادہ تو قتل کا تھا؛ لیکن اس نے کہا: مجھے قتل مت کرو، ہو سکتا ہے تمہارے کام آؤں۔ تو اس نے زنجیروں میں قید کر کے اپنے ساتھ رکھا۔ پھر آگے بڑھا اور قبیلہ خثعم کے علاقے سے جب گزر ہوا تو قبیلہ خثعم کے سردار نفیل بن حبیب نے بھی اپنے قبیلے کی دونوں شاخوں کے نوجوان لڑاکوؤں کے ذریعے اس کا مقابلہ کیا؛ لیکن ان کو بھی شکست ہوئی۔ اور نفیل بن حبیب کو بھی ابرہہ نے قید کر کے اپنے ساتھ لے لیا۔

## اہل طائف کی رہنمائی:

اب یہ لشکر آگے بڑھا اور جب طائف کے پاس پہنچا تو طائف والوں کو پہلے سے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے مقابلے میں جو لوگ آئے ہیں، انہوں نے شکست کھائی ہے۔ تو انہوں نے اپنی خیر اسی میں سمجھی کہ مقابلے پر نہ آئیں۔ اس لیے کہ طائف والوں کا بت

لات تھا، وہ اس کی پوجا کرتے تھے، اور انہوں نے اس کی ایک مستقل عبادت گاہ بنا رکھی تھی، ان کو یہ ڈرتھا کہ اگر ہم مقابلے پر آئیں گے، تو ہمارے لات کی عبادت گاہ کو ابرہہ اجاڑ دے گا۔ تو انہوں نے مقابلے کے بجائے اس کے ساتھ مقابلہ نہ کرنا طے کیا؛ بلکہ جب وہ ان کے قریب سے گزرا تو انہوں نے کہا کہ ہم تمہارا مقابلہ نہیں کریں گے؛ بلکہ تمہارا تعاون کریں گے۔ ہم اپنے ایک سردار ابورغال کو تمہارے ساتھ بھیجتے ہیں تاکہ وہ راستہ بھی بتلائے۔ چنانچہ اس کو بھیجا۔ پھر اسی کی رہنمائی میں یہ لوگ آگے بڑھے۔

### اونٹوں پر قبضہ:

پھر مکہ کے قریب مُغَمَّس نامی مقام پر ابرہہ نے پڑاؤ ڈالا۔ وہاں لشکر ٹھہرا ہوا تھا اور وہیں قریب میں مکہ والوں کے اونٹ چرا کرتے تھے، تو لشکر نے مکہ والوں کے تمام اونٹوں پر قبضہ کیا۔ اس میں نبی کریم ﷺ کے دادا حضرت عبدالمطلب کے دو سو (۲۰۰) اونٹ بھی تھے۔ ان سب اونٹوں پر انہوں نے قبضہ کیا۔ اس کے بعد قبیلہ حمیر کا حناطہ نامی ایک آدمی اس کے ساتھ تھا، اس کے ساتھ ابرہہ نے مکہ والوں کو پیغام بھیجا کہ دیکھو! میں تو کعبہ کی عمارت کو ختم کرنے کے لیے آیا ہوں، اگر تم میرا مقابلہ نہیں کرو گے، تو میں تم کو نہیں چھیڑوں گا، کوئی تعرض نہیں کروں گا۔ چنانچہ جب وہ یہ پیغام لے کر مکہ مکرمہ لوگوں کے پاس پہنچا، تو مکہ والوں نے کہا کہ سردار عبدالمطلب ہیں، ان سے ملو۔

### وہ آپ کو نہیں چھوڑے گا:

جب وہ حضور ﷺ کے دادا عبدالمطلب سے ملا، تو عبدالمطلب نے کہا کہ بھائی! یہ تو اللہ کا گھر ہے، جس کا گھر ہے وہ اس کی حفاظت کرے گا۔ اللہ اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔ تم اس کو

میری بات پہنچا دو۔ تو حناطہ نے کہا کہ میں آپ کی اس کے ساتھ ملاقات کروادیتا ہوں، آپ خود اس سے بات کر لیجیے۔ چنانچہ جب حناطہ عبدالمطلب کو ابرہہ کے پاس لے گیا۔ تو جب وہ وہاں پہنچے تو ابرہہ تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت عبدالمطلب کو قد اونچا اور چہرہ بھی وجیہ عطا فرمایا تھا۔ ان کی وجاہت اور رعب کو دیکھ کر ابرہہ اپنے تخت سے نیچے اتر آیا، اور نیچے بیٹھا، اور عبدالمطلب کو بھی اپنے ساتھ بٹھایا۔ ابرہہ نے پوچھا کہ کیا ہے آپ کی بات؟ عبدالمطلب نے کہا کہ میرے دوسو (۲۰۰) اونٹ پر آپ کے لشکر نے قبضہ کر لیا ہے، ان کو چھوڑ دیجیے۔ تو ابرہہ کہنے لگا کہ آپ کو دیکھ کر آپ کی عظمت اور بڑائی میرے دل میں قائم ہوئی تھی؛ لیکن آپ کی یہ بات سن کر سب ختم ہو گئی۔ میں تو یوں سمجھتا تھا کہ یہ کعبہ جس کو میں ڈھانے کے لیے آیا ہوں، جو تمہارے دین کی بنیاد ہے، تم مجھ سے اس کے متعلق درخواست کرو گے کہ ایسا مت کرو۔ اس کے بجائے تم نے تو اپنے اونٹوں کے چھڑانے کی درخواست کی۔ تو حضرت عبدالمطلب نے جواب میں کہا: میں اونٹوں کا مالک ہوں، مجھے اپنے اونٹوں کی فکر ہے، اس لیے میں نے یہ درخواست کی۔ اور جس گھر کو تم اجاڑنے کے لیے آئے ہو، اس کا ایک مالک ہے، وہ اس کی حفاظت کرے گا، ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے، اور ہم بھی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتے؛ کیوں کہ ہمارے پاس اتنے اسباب اور طاقت نہیں ہے۔ لیکن یاد رکھو! وہ آپ کو چھوڑے گا نہیں۔

## عبدالمطلب کی دعا:

خیر! یہ بات کر کے عبدالمطلب وہاں سے واپس آئے، اور قریش کے کچھ سردار قسم کے لوگوں کو ساتھ لے کر کعبۃ اللہ پر پہنچے، اور اس کے دروازے کا کڑا پکڑ کر اللہ تبارک و

تعالیٰ سے دعا کی: اے اللہ! ہر آدمی اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے، تو اپنے گھر کی حفاظت فرما، یہ صلیب اور اس کی طاقت تیری طاقت پر غالب نہ آنے پائے۔ یہ دعا کر کے انہوں نے لوگوں سے کہا کہ یہاں سے ہٹ جاؤ، اور پہاڑوں اور وادیوں میں چلے جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر کوئی عذاب آئے اور ہم بھی اس میں پھنس جائیں۔ بہر حال! یہ لوگ وہاں سے پہاڑ پر چلے گئے، اور اس انتظار میں رہے کہ ابرہہ کیا کرتا ہے؟

## ہاتھی کے کان میں کیا کہا.....؟؟؟

دوسرے دن ابرہہ نے اپنے لشکر کو تیار کیا، صف بندی کی اور سب سے پہلے محمود ہاتھی کو اٹھانا چاہا۔ نفیل بن حبیب۔ جو اس کے ساتھ تھے۔ نے جا کر اس ہاتھی کے کان میں کہا کہ تو اللہ کے حرم میں ہے!!! چناں چہ اس ہاتھی کو اٹھانا چاہا، نہیں اٹھا۔ بڑی مشکل سے آنکڑے اس کے کانوں میں ڈالے، تبر مارے، تب اٹھا، اس کو کعبۃ اللہ کی طرف چلانا چاہتے، تو نہیں چلتا تھا۔ یمن کی طرف چلانا چاہتے، تو چلتا تھا۔ شام کی طرف چلانا چاہتے، تو چلتا تھا۔ مشرق کی طرف چلانا چاہتے، تو چلتا تھا؛ لیکن مغرب کی طرف کعبۃ اللہ تھا، اس طرف جب چلانے کی نوبت آتی، تو نہیں چلتا تھا۔

## خدائی لشکر:

اسی دوران سمندر کی طرف سے پرندوں کے غول درغول آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان میں سے ہر پرندے کی چونچ میں ایک کنکری اور اس کے دونوں پنجوں میں چنے یا مسور کے برابر ایک کنکری تھی، اس طرح ہر پرندے کے پاس تین کنکریاں تھیں۔ انہوں نے آ کر لشکر پر یہ کنکریاں برسائیں۔ جس کے سر پر پڑتی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا یو الو

(revolver) کی گولی ہے، سیدھی پورے جسم کو پھاڑ کر نیچے زمین میں چلی جاتی تھی بہت سے وہیں ختم ہو گئے، بہت سے تو وہاں سے بھاگے؛ لیکن ان گولیوں کے اثر کی وجہ سے ان کے جسم میں چپک کی طرح بڑے بڑے پھوڑے نکل آئے۔

## ابرہہ کا عبرت ناک انجام:

خود ابرہہ کے جسم میں بھی یہی کیفیت پیدا ہو گئی؛ البتہ وہ وہاں مرا نہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے قابل عبرت بنانا چاہتے تھے۔ کیوں کہ سب یہاں مر جاتے تو یمن والوں کو پتا کیسے چلتا کہ ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوا؟ تو کچھ تو یہاں مرے، کچھ بھاگ کر یمن کی طرف گئے۔ اور راستے میں خود ابرہہ کی انگلیاں کٹ کٹ کر پیپ سے بہہ رہی تھیں، اسی حالت میں وہ یمن پہنچا۔ اور یمن پہنچ کر اس کا سینہ پھٹ گیا، اور اس کا پورا جسم پیپ سے بہہ کر ختم ہو گیا۔ لوگوں نے اس کا یہ عبرت ناک انجام دیکھا، دوسرے لوگ بھی اسی طرح مرے۔ اور اس ہاتھی کو سنبھالنے والے دو پیل بان وہیں مکہ مکرمہ میں اندھے اور اپاہج بن گئے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے بھی ان دونوں کو مکہ میں دیکھا ہے۔ وہ مکہ ہی میں تھے، بھیک مانگتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی واقعے کو اس سورت میں بیان فرمایا ہے۔<sup>۱</sup>

## ارہاص؛ نہ کہ محبزه:

اس واقعے کو حضرات محدثین نے نبی کریم ﷺ کا معجزہ قرار دیا ہے؛ لیکن معجزہ کی جو اصطلاحی تعریف کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کرے، اور اپنی

(۱) السيرة النبوية لابن إسحاق: ۳۶-۵۲ و ۱۱۳-۱۱۵ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان) و

تفسير الطبري، سورة الفيل، نقلاً عن ابن إسحاق.

نبوت کی دلیل اور علامت کے طور پر جو چیز خرق عادت پیش کرے، اس کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ بخاری شریف میں بھی نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: **مَامِنَ الْأَنْبِيَاءُ نَبِيٍّ إِلَّا أُعْطِيَ مَا مِثْلُهُ أَمِنْ عَلَيْهِ الْبَشَرُ**۔ (ہر نبی کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ایسی نشانی دی جاتی ہے جس کو دیکھ کر لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں) <sup>۱</sup> تو اسی کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ اور جب یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت نبی کریم ﷺ کی ولادت بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اس کو معجزہ کا نام دینا تو ٹھیک نہیں ہے۔ ہاں! اس کو ارہاس کہا گیا ہے۔ یعنی کسی نبی کی ولادت سے پہلے یا اس کی ولادت کے بعد نبوت ملنے سے پہلے کچھ ایسی چیزیں، علامات، نشانیاں جو معجزہ جیسی ہوں، ان سے ظاہر ہوں، تو اس کو معجزہ نہیں کہا جاتا؛ بلکہ ارہاس کہا جاتا ہے۔ جیسے: نبی کریم ﷺ کی ولادت ہوئی، تو کسریٰ کے محل کے کنگرے گر گئے تھے، اور آتش پرستوں کے عبادت خانے میں وہ آگ جو ساہا سال سے نہیں بجھی تھی، وہ بجھ گئی تھی۔ یہ سب ارہاسات کہلاتے ہیں۔ تو اس (ہاتھی والے قصے) کو بھی ارہاس سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بہر حال! اس واقعے کو اس سورت میں بیان کر کے قریش پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے جو انعام فرمایا، اس کو بیان کیا جا رہا ہے کہ دیکھو! جو کعبۃ اللہ کو برباد کرنے کے لیے آیا تھا، اس کو ہم نے اس طرح ٹھکانے لگایا اور اس طرح ہم نے تمہاری حفاظت کی۔

## دفع مضرت اور جلب منفعت:

چنانچہ اس واقعے کے بعد پورے ملک حجاز اور اطراف میں قریش کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور لوگ کہنے لگے کہ یہ تو اللہ والے ہیں، ان کو چھیڑا نہیں جاسکتا۔ جو بھی ان کے

(۱) صحیح البخاری: ۴۹۸۱۔

مقابلے پر آئے گا وہ برباد ہوگا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے قافلے سال میں دو مرتبہ۔ گرمی کے زمانے میں شام، اور سردی کے زمانے میں یمن کی طرف۔ تجارت کے لیے ایسے علاقوں میں جاتے تھے جہاں کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا تھا، کوئی ان کے ان تجارتی قافلوں کو چھیڑتا نہیں تھا۔ اسی نعمت کو اللہ تعالیٰ نے سورہ قمریش میں بیان کیا ہے، جو آپ سن چکے ہیں۔ اس سورت میں چوں کہ دفع مضرت ہے، اس لیے اس کو پہلے بیان کیا اور سورہ قمریش میں جلب منفعت ہے، اس لیے اس کو سورہ قمریش میں بیان کیا گیا ہے۔

## ترجمہ و وضاحت:

باری تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ

(کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟)

اَلَمْ یَجْعَلْ كَیْدَهُمْ فِیْ تَضْلِیْلِ

(کیا اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کی ساری تدبیریں بیکار نہیں کر دیں؟)

وَ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ

(اور ان پر اللہ تعالیٰ نے غول کے غول پرندے بھیجے)

ابابیل یا تو یہ اسم جمع ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اُبُول کی جمع ہے، اُبُول پرندوں

کے غول (جھنڈ) کو کہا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں ایک پرندہ ہوتا ہے، اس کو لوگ ابابیل کہتے

ہیں، وہ یہاں مراد نہیں ہے۔ تمام مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے۔

تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلِ

(وہ پرندے) ان کے اوپر مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے)

**سجیل** اصل میں فارسی لفظ ہے، سنگ اور گل کے مجموعے سے بنا ہے۔ مٹی کا گارا بنا کر اس کی گولیاں بنائی جائیں، اور ان گولیوں کو آگ میں پکایا جائے، تو وہ پتھر جیسی مضبوط ہو جاتی ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کا ترجمہ ”کنکر کی پتھریاں“ کیا ہے۔<sup>۱</sup>

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ

(چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا بنادیا جیسے کھایا ہوا بھوسا)

کھیت میں سے جب کھیتی کاٹ لی جاتی ہے، تو کھیتی کٹ چکنے کے بعد کھیت میں کھیتی کے کٹے ہوئے ذرات کو بھوسا کہتے ہیں۔ اس بھوسے کو جانور کھالیں، پھر کھانے کے بعد جانور جگالی (qulluq) کرتا ہے، وہ باہر نکالتا ہے تو بالکل نرم اور قابل نفرت ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا بنادیا۔

(۱) تفسیر عزیزی، سورہ فیل۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورہ قمریش

(مؤرخہ: ۲۶، محرم الحرام ۱۴۴۰ھ مطابق ۷ اکتوبر ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً .  
أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم ۞ بسم الله الرحمن الرحيم ۞

لَا يَلْفِ قَمْرِيَشٌ ۝ الْفِهُمُ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ۝ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ ۝ وَأَمَّنَّهُمْ مِنْ خَوْفٍ ۝

## قمریش کون ہیں.....؟؟؟

یہ سورہ قمریش ہے بقول جمہور مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اور بقول ضحاک وکلبی مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔

قمریش، عرب کے ایک بڑے قبیلے کا نام ہے۔ نبی کریم ﷺ کا تعلق اسی قبیلے سے

ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا نسب مبارک اس طرح ہے: محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لؤی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ۔ نضر بن کنانہ تیرھویں پشت پر نبی اکرم ﷺ کے جد اعلیٰ ہیں، ان کی اولاد قریش کہلاتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں کنانہ کو منتخب فرمایا، اور ان کی اولاد میں قریش کو، اور قریش میں بنو ہاشم کو، اور بنو ہاشم میں مجھے یعنی نبی کریم ﷺ کو منتخب فرمایا۔<sup>۱</sup>

نضر بن کنانہ۔ جو نبی کریم ﷺ کے تیرھویں نمبر کے جد اعلیٰ ہیں۔ کی اولاد کو قریش کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ حرم کے باہر بھی پھیلے ہوئے اور منتشر تھے۔ تو نبی کریم ﷺ کے پانچویں جد اعلیٰ قصی بن کلاب نے جو قریش حرم سے باہر منتشر تھے ان کو جمع کر کے حرم میں آباد کیا کہ آپ لوگ حرم ہی میں آباد رہو، حرم سے باہر نہیں۔ اسی لیے ان قصی کو مُجَمِّع کہا جاتا ہے۔ اور گویا یہی قریش کو حرم میں لا کر آباد کرنے والے ہوئے۔ اس کے بعد سے قریش کے تمام قبائل حرم ہی میں آباد تھے۔

## قریش کی وجہ تسمیہ:

قریش کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ تو منتشر تھے، ان کو پھر حرم میں لا کر جمع کیا اور آباد کیا، علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں **نَقَرُش** منتشر لوگوں کے اکٹھا ہو جانے کو کہتے ہیں، تو چوں کہ یہ منتشر تھے، اور حضرت قصی بن کلاب کی کوششوں سے پھر حرم میں مجتمع ہوئے، اور وہیں آباد ہوئے اس اعتبار سے قریش کہا جاتا ہے۔<sup>۲</sup>

(۱) صحیح مسلم: ۲۲۷۶۔

(۲) تفسیر القرطبی، سورۃ قریش۔

اور دوسری وجہ تسمیہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ نے تفسیر فتح العزیز میں بیان کی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی منقول ہے، فرماتے ہیں کہ قریش ایک سمندری جانور کا نام ہے، جو تمام جانوروں پر غالب آتا ہے، تو یہ قبیلہ بھی اپنی فصاحت و بلاغت اور شجاعت و سخاوت کی وجہ سے عرب کے تمام قبائل پر غالب تھا، اس لیے اس کو قریش نام دیا گیا۔<sup>(۱)</sup> قریش کی یہ دو وجہ تسمیہ زیادہ مشہور ہیں، اور بھی اس سلسلے میں کچھ باتیں کہی گئی ہیں۔

بہر حال! قریش ہی کے ان تمام قبائل کی شاخیں حرم ہی میں کعبۃ اللہ کے آس پاس آباد تھیں، ان ہی کے نام پر اس سورت کو نام دیا گیا ہے۔

## وادی غیر ذی زرع میں آباد قوم:

یہ سب مکہ مکرمہ میں حرم میں آباد تھے، اور حرم، مکہ مکرمہ ایک ایسی وادی ہے۔ وادی پہاڑوں کے درمیان کے ہموار علاقے کو کہتے ہیں، جس کو گجراتی میں وادی کہا جاتا ہے۔ جہاں معیشت کا کوئی سبب موجود نہ تھا، نہ کھیتی باڑی، نہ باغات، نہ ہی کوئی صنعت۔ ایسی جگہوں پر عموماً لوگ آباد نہیں ہوتے، بلکہ لوگ ایسی جگہوں پر آباد ہوتے ہیں، جہاں معیشت کے اسباب میسر ہوں، جن کے ذریعے وہ اپنا گذر بسر اطمینان و سکون کے ساتھ کر سکیں؛ لیکن مکہ ایک وادی غیر ذی زرع تھی۔

قرآن پاک میں وہ دعا موجود ہے، جو سیدنا حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی بیوی حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیلؑ کو وادی غیر ذی

(۱) تفسیر القرطبی و تفسیر عزیزی وغیرہما۔

زرع میں چھوڑتے وقت کی تھی: رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ. (ابراہیم: ۳۴) (اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو ایک ایسی وادی میں، جہاں کوئی کھیتی نہیں ہوتی ہے، بٹھرایا ہے تیرے حرمت والے گھر کے پاس، مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ نماز کو قائم کریں۔ اور اے اللہ! لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل فرمادے، اور ان کو پھلوں سے روزی عطا فرما) ان ہی کی اس دعا کی برکت ہے کہ وہاں خود کوئی پیداوار نہ ہونے کے باوجود ساری دنیا کے پھل آتے ہیں، اور لوگ اطمینان اور سکون کے ساتھ ان کو استعمال کرتے ہیں۔

### اہل مکہ پر بہت بڑا انعام:

ایک اور موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی: رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ. (البقرہ: ۱۲۶) (اے اللہ! اس مکہ مکرمہ کو امن والا شہر بنا، اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں کی روزی عطا فرما) عرب قبائل میں آپسی عداوتیں، دشمنیاں ہوا کرتی تھیں، اور اس علاقے میں کوئی ذریعہ معیشت نہ ہونے کی وجہ سے ان میں غربت اور افلاس تھا، جس کے نتیجے میں وہ آپس میں لوٹ مار کرتے تھے، عداوتوں کی بنا پر ایک دوسرے کا قتل کرتے تھے، نہ جان محفوظ، نہ مال محفوظ، نہ عزت و آبرو محفوظ تھی؛ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کی برکت سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کو امن والا شہر بنایا کہ وہاں کوئی کسی کو چھیڑتا نہیں تھا۔ سب کی جان، مال اور عزت و آبرو بھی محفوظ تھی۔ یہاں تک کہ حرم اور کعبۃ اللہ کی برکت سے شکار کے جانور تک وہاں محفوظ رہتے

تھے۔ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا اہل مکہ پر ایک بہت بڑا انعام تھا۔

## تجارت کے دو سفر:

نبی کریم ﷺ کی ولادت سے پہلے قریش کا جو قبیلہ وہاں آباد تھا، ان کے لیے ایسی جگہ میں جہاں بظاہر معیشت کا کوئی سامان نہیں تھا، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے لیے ایک سبب یہ پیدا فرما دیا کہ نبی کریم ﷺ کے پردادا، حضرت عبدالمطلب کے والد، ہاشم نے باقاعدہ تجارتی اسفار کا سلسلہ شروع کیا، وہ لوگوں کا مال لے کر سفر کرتے تھے۔ اور قریش کے تمام قبائل، شاخوں میں سے ہر ایک کا مال مضاربت کے طور پر لے کر جاتے تھے، تجارت کے ذریعے کمائی حاصل کرتے تھے، اور سب کو ان کے حصے کے مطابق پہنچاتے تھے جس کی وجہ سے سب لوگ بڑے اطمینان اور سکون سے اپنی زندگیاں گزارتے تھے۔

اور یہ تجارت کے سفر دو ہوتے تھے: (۱) گرمی کے زمانے میں شام کا تجارتی سفر کرتے تھے؛ شام کا علاقہ ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے۔ وہاں کی چیزیں مکہ مکرمہ میں لاتے تھے اور مکہ میں بیت اللہ کی زیارت کے لیے، حج و عمرہ کے لیے آنے والے لوگ وہ چیزیں ان سے خریدتے تھے اس طرح ان کی تجارت ہوا کرتی تھی۔ (۲) سردی کے زمانے میں ان کا دوسرا تجارتی سفر یمن کی طرف ہوتا تھا؛ یمن گرم علاقہ ہے، تو وہاں کم سردی ہوتی تھی، لہذا وہ سردی کے زمانے میں آب و ہوا کے اعتبار سے زیادہ موافق رہتا تھا۔

تو یہ لوگ تجارت کی غرض سے یہ دو بڑے سفر کرتے تھے۔ اور اس کے عادی تھے۔ عادی ہونے کی وجہ سے اتنے طویل طویل سفر بھی ان کے لیے کوئی دشوار اور مشکل نہیں تھے۔ جب مشکل چیز کا بھی آدمی عادی بن جاتا ہے، تو اس کے لیے عادت کی وجہ سے وہ چیز آسان

ہو جاتی ہے۔ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ان کے اوپر ایک انعام تھا کہ ذریعہ معاش کے طور پر انہوں نے تجارت کو اختیار کیا تھا، اور دونوں موسموں میں الگ الگ جگہ کا تجارتی سفر کرتے تھے، اور اس کی عادت ہونے کی وجہ سے ان کے لیے یہ تجارتی اسفار طویل ہونے کے باوجود بڑے آسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس انعام کا اس سورت میں تذکرہ فرمایا ہے۔

## حرم کی نسبت پر امن و امان:

دوسری بات یہ ہے کہ پورا علاقہ بالخصوص حجاز وغیرہ کا علاقہ جہاں نبی کریم ﷺ کی پیدائش ہوئی، وہاں مستقل کبھی کوئی حکومت قائم نہیں رہی، اور عام طور پر امن و امان قائم کرنا قانون کو جاری کرنا یہ حکومتوں کا کام ہوا کرتا ہے۔ اور وہاں آج تک ایسی کوئی معقول حکومت نہیں تھی جو قانون کو جاری کرتی اور امن و امان قائم کرتی۔ جس کی وجہ سے آپس میں بہت کچھ قتل و غارت اور لوٹ مار ہوتی تھی؛ لیکن اس کے باوجود قریش چوں کہ اللہ کے گھر کے متولی اور نگہبان تھے، اس بیت اللہ کی نسبت کی وجہ سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے لوگوں کے قلوب میں محبت ڈالی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اتنے طویل سفر میں وہ تجارت کے بڑے بڑے قافلے لے کر جاتے تھے۔

قافلے کی لمبائی کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ غزوہ بدر کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے ابوسفیان کی ماتحتی میں جانے والے قریش کے جس قافلے کا تعاقب کیا تھا، اس میں سامان سے لدے ہوئے ایک ہزار اونٹ تھے۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک ایک ہزار اونٹوں کا قافلہ سامان سے لدا ہوا!!! اور لے جانے والے چالیس پچاس آدمی!!! گویا ایسے بدامنی کے ماحول میں بھی یہ لوگ اس طرح جاتے تھے کہ ان کی جان و مال پر حرم

کی نسبت کی وجہ سے کوئی ہاتھ نہیں ڈالتا تھا۔ اتنے طویل اسفار میں بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے مال و جان کی حفاظت حاصل تھی۔ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ایک بہت بڑا انعام تھا، جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے انہیں دیا گیا تھا۔ نیز ان تجارتی اسفار کے نتیجے میں ان کو کھانے پینے اور معیشت کے اسباب بآسانی میسر تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں تھیں جن نعمتوں کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس سورت میں بیان کیا ہے، کہ اس گھر کے مالک یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو بھوک میں کھانا دیا اور خوف سے امن دیا، یعنی ساری دنیا تو ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے۔ قرآن پاک میں سورہ عنکبوت میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: **أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا مِّمَّا أُمِنَّا وَيَتَخَفَتُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ**۔ (العنکبوت-۶۷) (کیا یہ لوگ اس بات کو دیکھتے نہیں کہ ہم نے حرم کو امن والی جگہ بنایا جہاں یہ لوگ پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں؟ حالاں کہ اس کے آس پاس کا جو علاقہ ہے وہاں سے لوگ اچک لیے جاتے ہیں) یعنی وہاں ان کی جانیں محفوظ نہیں ہیں، لیکن حرم کی نسبت پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو یہ امن و امان اور سکون عطا فرمایا ہے۔ تو یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ایک بہت بڑا انعام ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں ذکر کیا ہے۔

## تین احسانات:

اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اپنے تین احسانات گنوائے ہیں۔ (۱) سردی اور گرمی دونوں موسموں میں تجارت کے طویل طویل دوسفر امن و سکون کے ساتھ کرنا، کوئی ان کے مال کو چھیڑتا نہیں تھا۔ (۲) ایک وادی غیر ذی زرع میں آباد ہونے کے باوجود کھانے پینے کی چیزیں اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے کثیر مقدار میں دوسری جگہوں سے وہاں پہنچائی

جاتی تھیں۔ (۳) کوئی امن قائم کرنے والی حکومت موجود نہ ہونے کے باوجود وہاں ہر طرح کا امن و امان تھا۔ ان احسانات کو گنوا کر اللہ تبارک و تعالیٰ ان لوگوں کو متوجہ کر رہے ہیں کہ جس اللہ نے تم کو ان نعمتوں سے نوازا ہے؛ چاہیے تو یہ تھا کہ تم بتوں کی پوجا کرنے کے بجائے اس گھر کے مالک یعنی اللہ کی عبادت کرتے۔

## ایک سبق:

اس میں ہمارے لیے سبق یہ ہے کہ دین کی نسبت پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اگر کسی کو دنیوی نعمتوں سے نوازا ہو، یا اعزاز و اکرام کی شکلیں عطا فرمائی ہوں تو اس کا شکر یہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت اور فرماں برداری میں زیادہ اہتمام کیا جائے۔ بخاری شریف میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ تہجد کی نماز میں اتنا طویل قیام فرماتے تھے کہ آپ ﷺ کے پاؤں مبارک پر درم آجاتا تھا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کی تو اگلی پچھلی خطائیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے معاف کر دی ہیں۔ لِيَغْفَرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ. (الفتح-۲) اس کے باوجود آپ اتنی مشقتیں اٹھاتے ہیں؟ طویل طویل عبادتیں کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں پاؤں پر درم آجاتا ہے؟ اس کے جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا: أَفَلَا أَكُونُ عَبْدًا شَكُورًا؟ (کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟) یعنی جب اللہ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے، تو اب اس کی شکر گزاری یہ ہے کہ میں اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری میں اور زیادہ اہتمام کا لحاظ کروں۔ تو اس میں ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ دین کی نسبت پر اللہ کی طرف سے جو نعمتیں دی جاتی ہیں ان کا حق یہ ہے کہ آدمی اللہ



تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری میں مزید اہتمام کرے۔ نہ یہ کہ اللہ کی طرف سے غفلت کا معاملہ برتے۔ اسی کو اس سورت میں بتایا گیا ہے۔

## ترجمہ:

لَا يُلْفِ قُرَيْشٍ

**ایلِف:** عادی ہونا، مانوس ہونا، کسی چیز کے ساتھ طبعی طور پر مناسبت ہونا۔ چوں کہ قریش کے لوگ عادی ہیں۔

إِنْفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ

وہ سردی اور گرمی کے موسموں میں سفر کرنے کے عادی ہیں (سردی میں یمن کی طرف اور گرمی میں شام کی طرف)

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ .

اس لیے ان کو چاہیے کہ وہ اس گھر کے مالک کی عبادت کریں۔ (کون اس گھر کا مالک؟)

الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ

جس نے بھوک کی حالت میں ان کو کھانا دیا اور بد امنی سے انہیں محفوظ رکھا۔

جب اللہ تعالیٰ کے یہ انعامات تم پر ہیں، لہذا تم کو بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی عبادت کا حق

ادا کرنا چاہیے، اور اس کے علاوہ کسی اور کو ماننا نہیں چاہیے۔ اس سورت میں یہ سبق دیا گیا ہے۔

## دوسرا سبق:

اس سورت میں ایک سبق اور بھی ہے کہ جہاں لوگوں کی معاشی ضرورتیں اللہ تعالیٰ

کی طرف سے پوری کی جاتی ہوں، اور جہاں وہ رہتے ہیں وہاں امن و امان کی فضا ہو، تو یہ دو

اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں، ان کی قدر کرنی چاہیے۔ جس علاقے میں آپ رہتے ہیں وہاں آپ کے لیے اسباب معاش آسانی کے ساتھ میسر ہیں، آپ اپنا گذر بسر اطمینان کے ساتھ کر لیتے ہیں، اور وہاں کوئی خوف او ڈر بھی نہیں ہے، امن و امان کی فضا ہے تو یہ دو ایسی بڑی نعمتیں ہیں کہ دنیا کی کوئی دوسری نعمت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اللہ تعالیٰ ہم کو بھی ان نعمتوں کی قدردانی کی توفیق اور سعادت عطا فرمائے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورة ماعون

(مؤرخہ ۵ محرم ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۵ ستمبر ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً .  
أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم ۝ بسم الله الرحمن الرحيم ۝

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالْذِّينِ ۝ فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحْضُ عَلَى طَعَامِ الْبُسْكِينِ ۝ فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرَآءُونَ ۝ وَيَتَنَعَّوْنَ الْبَاعُونَ ۝

## وجہ تسمیہ:

یہ سورة الماعون ہے۔ اس کا آخری کلمہ الماعون ہے، اسی مناسبت سے اس کا نام

سورة الماعون رکھا گیا۔

## مکی یا مدنی؟

اکثر حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ یہ سورت مکی ہے؛ لیکن حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ یہ مدنی ہے۔<sup>۱</sup> بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ اس کا آدھا حصہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوا۔ وَلَا يَحُضُّ عَلَى طَعَامِ الْيَتَامَىٰ تِلْكَ۔ جس میں مشرکین کی حرکتوں اور ان کے کرتوتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ گویا یہی مناسب ہے کہ اس کا نزول مکہ میں ہوا ہو۔ اور باقی آدھا حصہ جس میں منافقین کی حرکتیں اور ان کے کرتوت ذکر کیے گئے ہیں۔ تو یہی مناسب ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں نازل ہوا ہو۔<sup>۲</sup>

## شان نزول مع اختلاف روایات:

اوپر والا جو آدھا ہے اس کے شان نزول کے سلسلے میں مختلف روایات ہیں: حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ نے تفسیر فتح العزیز میں لکھا ہے کہ ابو جہل کی عادت تھی کہ جب کسی صاحب مال آدمی کا انتقال ہونے والا ہوتا، تو وہ اس کے

(۱) ابن عطیہ اندلسیؒ "الحرر الوجیز" میں تحریر فرماتے ہیں: "ہی مکیۃ بلا خلاف علمتہ۔" زجاج و نحاس بھی اس کے مکی ہونے کے قائل ہیں، اور علامہ ابن جوزیؒ نے جمہور سے اس کے مکیہ ہونے اور ابن عباس و قتادہؓ سے اس کے مدنیہ ہونے کی صراحت کی ہے۔

(۲) ابن حزم اندلسیؒ "النسخ والمنسوخ" میں رقم طراز ہیں: اس سورت کا نصف مکی ہے اور نصف مدنی۔ یہ سورت شروع سے وَلَا يَحُضُّ عَلَى طَعَامِ الْيَتَامَىٰ تِلْكَ مکہ مکرمہ میں عاص بن وائل کے باب میں نازل ہوئی۔ اور فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ سے آخر تک مدینہ منورہ میں عبداللہ بن ابی بن سلول کے باب میں نازل ہوئی۔ ابن سلامہ مقرئ، زمخشری اور ابن جوزی نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔

پاس جا کر کہتا کہ تم اپنے یتیموں کو میرے حوالے کر دو، میں ان کی کفالت کروں گا اور خبر گیری کروں گا، اور دوسرے ورثاء ان کو نہ ستائیں، ان کا حق ضائع اور برباد نہ کر دیں، میں اس کا خیال رکھوں گا۔ اس طرح مرنے والے سے ان کے یتیموں کی ذمہ داری خود لیتا تھا اور اس طرح ان کے مال پر قابض بھی ہوتا تھا، اور اس کے بعد ان یتیموں کے حقوق کو ضائع کرتا تھا، ان کو ننگا، بھوکا چھوڑ دیتا تھا۔ ایسے یتیموں میں سے ہی ایک یتیم جو اس کا ستایا ہوا تھا، ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، اور آپ ﷺ سے فریاد کی۔ تو نبی کریم ﷺ اس کو لے کر ابو جہل کے پاس گئے اور اس کو قیامت کا ڈر بتا کر کہا: ڈر! قیامت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا جواب دے گا؟ اس کا حق ادا کر۔ تو اس نے کہا کہ قیامت کیا چیز ہے؟ میں کسی قیامت کو مانتا نہیں ہوں۔ اس کے اس جواب سے نبی کریم ﷺ دل گرفتہ ہوئے، تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے یہ سورت نازل کی گئی۔<sup>۱</sup>

بعض روایات میں دوسرے کفار کے بھی نام آتے ہیں۔ کسی نے عاص بن وائل، کسی نے ولید بن مغیرہ، کسی نے ابوسفیان کا نام بھی لیا ہے۔ گویا مشترک طور پر یہ حالت ان لوگوں کی بیان کی گئی ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے تھے، دوبارہ پیدا کیے جانے اور اس کے بعد آدمی کو اس کے اعمال صالحہ کا اچھا بدلہ، اور برے اعمال کی بری سزا ملنے کے قائل نہیں تھے، ایسے لوگوں ہی کا قصہ ہے۔

## کیا آپ نے دیکھا.....؟؟؟

اس لیے اس کی شروعات اَدْعَيْتِ الَّذِي يُكْذِبُ بِالْآيَاتِ سے کی گئی۔ (کیا آپ

(۱) تفسیر عزیزی: ۶۵۵-۶۵۶ (کتب خانہ فیض ابراہ، انگلشور، گجرات)۔

نے اسے دیکھا جو جزاء و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ (لفظ دین کے متعلق سورہ فاتحہ میں گزرا تھا: مُلْكُ يَوْمِ الدِّينِ) (روزِ جزاء کا مالک) جس دن اللہ تبارک و تعالیٰ نیکو کاروں کو ان کے نیک اعمال کا اچھا بدلہ اور گنہگاروں کو ان کے گناہوں کی سزا دیں گے۔ تو جزاء و سزا اس دن دی جائے گی، اس لیے اس کو یوم الدین کہا گیا۔ تو دین اسی بدلے کو کہا جاتا ہے۔ گویا باری تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کیا آپ نے اس آدمی کو دیکھا جو جزاء و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ یعنی جو اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جائیں گے، اور اُس دوسری زندگی میں جن لوگوں نے نیک اعمال کیے تھے ان کو نیک اعمال کا اچھا بدلہ، اور جن لوگوں نے گناہ کیے تھے ان کو گناہوں کی سزا دی جائے گی۔

## دوبارہ زندگی؛ عقلی دلیل:

ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی زندگی بھر اچھے اور نیک اعمال کا اہتمام کرتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی زندگی کے دن تکلیفوں میں گزرتے ہیں، ان نیک اعمال کی وجہ سے اس کو دنیا میں کوئی بھلائی پہنچی ہو، اچھے حالات آئے ہوں، ایسا نظر نہیں آتا۔ اور بسا اوقات دیکھتے ہیں کہ ایک ظالم ہے، بدکار ہے، اپنی بدکاری اور ظلم و زیادتی میں پھل پھول رہا ہے، لوگوں کو ستا رہا ہے، لوگوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کا معاملہ کرتا ہے، پوری زندگی اسی طرح گزرتی ہے، اور ہمیں کچھ ایسا نظر نہیں آتا کہ اس کو ان برے کاموں کی وجہ سے دنیا میں کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ تو اگر دوبارہ زندہ ہونے والے نہیں ہیں تو پھر ان کا کیا؟ باری تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں: أَفَبُكَ كَانَ مُؤْمِنًا كُنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ (السجدة ۱۸) (جو ایمان والا ہے بھلا وہ فاسق اور بدکار کی طرح ہو سکتا ہے؟ دونوں برابر نہیں ہو سکتے) نیکو کار کو اپنی

نیکی کا اور بدکار کو اپنے گناہوں کا بدلہ ملے گا۔ نیکو کار کو اچھا بدلہ اور بدکار کو اس کی سزا ضرور ملے گی۔ گویا ایک قدرتی نظام ہے، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ دوبارہ زندگی ہو، آدمی دوبارہ پیدا کیا جائے۔ یہ اس کی عقلی دلیل ہے۔

بہر حال! یہاں تو اللہ تبارک و تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو خطاب فرماتے ہوئے تسلی دے رہے ہیں کہ کیا آپ نے اس آدمی کو دیکھا جو جزاء و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ یعنی آخرت کا قائل نہیں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو آخرت کا قائل نہیں ہے، تو اس سے یہ امید رکھنا کہ وہ حق داروں کے حق کو ادا کرے گا، فضول ہے۔

آگے اس کی کچھ اور علامتیں اور اس کے کچھ اور کرتوت بھی اللہ تبارک و تعالیٰ نے بتلائے:

### إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا:

فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ الْيَتِيمَ (وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے)

اب دیکھیے! اس آیت میں یتیم کو دھکے دینے کو آخرت کے انکار کرنے والے کی ایک نشانی کے طور پر بتلایا گیا، یہ بتلا کر گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ حرکتیں اصل تو ایسے ہی آدمی کی ہو سکتی ہیں جو آخرت کا قائل نہ ہو، جزاء و سزا کا انکار کرتا ہو۔ اگر کسی مؤمن میں بھی پائی جاتی ہیں، تو اس کے ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ اس میں یہ چیز ہونی نہیں چاہیے۔ یہ حرکتیں اصل تو کافر ہی کی ہونی چاہیے۔ اب یتیموں کے حقوق کو ضائع اور برباد کرنا بھی بڑا خطرناک ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں میں دستور یہ تھا کہ بچہ اگر نابالغ ہے، تو اس کو اس کا مال نہیں دیتے تھے۔ جو بڑا ہوتا

تھا وہی مال لے لیتا تھا۔ ان کے ہاں ایک جملہ تھا کہ جو آدمی گھوڑے پر سوار ہو، ہاتھ میں نیزہ اور تلوار لے، اور دشمن کا مقابلہ کرے وہی اس بات کا حق دار ہے کہ اس کو وراثت اور مال دیا جائے۔ نابالغ بچے میں اس کام کی طاقت نہیں ہے۔<sup>(۱)</sup> لہذا وہ لوگ اس کا حق مار لیا کرتے تھے۔ قرآن کریم میں اس طرح یتیموں کا مال کھا جانے اور اس کے حق کو مارنے پر بڑی سخت وعیدیں سنائی گئیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتِیْمِیْنَ ظُلْمًا اِنَّہُمْ یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِہُمْ نَارًا (النساء: ۱۰) (جو لوگ بطور ظلم کے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ ڈال رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کو آگ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بڑا خطرناک عمل ہے۔ اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔

## معاشرے کا جائزہ لینا چاہیے:

دیکھیے! ہمیں اپنے معاشرے کا جائزہ لینا چاہیے۔ ہمارے معاشرے میں کوئی کہنے اور ماننے کے لیے تیار نہیں ہوگا کہ میں یتیم کا حق کھاتا ہوں؛ لیکن معاشرہ میں کچھ سلسلے جاری ہیں۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو فوری طور پر وراثت تقسیم نہیں کی جاتی، بلکہ اگر ان سے کہا بھی جائے کہ بھائی! شریعت کا حکم ہے کہ جب کسی کا انتقال ہو جائے، تو اس کے مال میں وارثوں کے جو حصے رکھے ہیں، اس کے مطابق اس کو فوری طور پر تقسیم کرے کہ ہر ایک حصے دار کو اس کا حصہ، اور حق دار کو اس کا حق پہنچا دو۔

تو لوگ کہتے ہیں کہ مولانا صاحب! ابھی تو کفن بھی میلانا نہیں ہوا، اور آپ بانٹنے کی بات کرتے ہیں!!! یہ تو اجنبی پنہ کی باتیں ہوئیں، ہم تو آپس میں مل جل کر رہتے ہیں، ایسی

(۱) تفسیر القرطبی، سورة النساء و سورة الماعون.



بات کریں گے۔ لیکن تھوڑے دنوں کے بعد ہی آپس میں جھگڑے شروع ہوتے ہیں۔ ایک کہے گا کہ اس نے زیادہ کھا لیا، دوسرا کہے گا کہ میرے حصہ میں کم آیا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ خاص کر اگر وارثوں میں کوئی صغیر اور نابالغ ہو، جیسے کبھی باپ کا انتقال ہو جاتا ہے، اس کی کئی اولاد میں ایک۔ دو لڑکے تو بالغ ہوتے ہیں، اور باقی چھوٹے ہیں، تو شریعت نے اس بات کی تاکید فرمائی کہ ہر ایک کے حصے کا قاعدہ تقسیم کر کے الگ کر دیے جائیں، اور جو نابالغ کا حصہ ہے اس کے نام سے اس کو محفوظ کر لیا جائے، اس کا ذاتی، ضروری خرچ ہے، وہ اس میں سے لیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ ایک پائی بھی اس میں سے نہیں لی جاسکتی ہے۔

اب ہمارے یہاں تقسیم نہیں کرتے، اس کا حصہ مشترکہ مال میں موجود ہے، اور سب اس کو کھاتے پیتے ہیں۔ تو عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ یتیم کے اپنے خرچے سے زیادہ اس کے مال سے لیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرح لوگ یتیم کے مال کو کھانے کے جرم میں گرفتار ہوتے ہیں، اور کہنے کو یوں کہتے ہیں کہ ہم تو یتیم کا مال نہیں کھاتے۔ حالاں کہ یہ وحی ان کو بھی لاگو پڑتی ہے۔

## یتیم کے معاملے میں احتیاط:

چنانچہ جب حضور ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ اتنے ڈر گئے کہ جن کے ہاں یتیم ہوا کرتا تھا اس کا سب مال الگ کیا، اس کا کھانا پکانا بھی الگ کیا، اپنے ساتھ نہیں؛ تاکہ یتیم کا مال کھانے کی نوبت نہ آئے۔<sup>(۱)</sup> اس کی وجہ سے کچھ دشواریاں پیش آئیں کہ اس یتیم اکیلے کے لیے الگ کھانا پکے، اور گھر کے دوسرے لوگوں کے لیے الگ پکے، اس پر

(۱) تفسیر الطبری وبحر العلوم للسمرقندی وأسباب النزول للواحدي وغيرها.

قرآن پاک نے تنبیہ بھی فرمادی: وَإِنْ تَخَاطَبُوهُمْ فَاخْوَانُكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (البقرة: ۲۲۰) اگر مل جل کر رہتے ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں، جو یتیم کے مال کو بگاڑنا چاہتا ہے اور جو اس کو ٹھیک رکھنا چاہتا ہے اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ یعنی جس کے دل میں یتیم کے مال کی حفاظت کی نیت ہے اس کو اللہ خوب جانتا ہے۔ اس لیے اگر مقصد یتیم کے مال کو ضائع ہونے سے بچانا ہے، اور الگ سے پکانے کی صورت میں اس کا خرچ زیادہ ہوگا، تو مال ملانے میں کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ ایک آدمی کا کھانا الگ سے پکانیں تو خرچ زیادہ ہوگا۔ ہاں! حساب پکار کھو، تاکہ ضرورت سے زیادہ خرچ اس کے حصے میں نہ ڈالا جائے۔ بہر حال! جب یہ آیت نازل ہوئی تو پھر صحابہؓ نے ان یتیموں کا حصہ ساتھ کیا۔ حاصل یہ ہے کہ شریعت مطہرہ نے یتیم کے معاملے میں بہت تاکید فرمائی ہے۔

## بچوں کے ہدایا کا حکم:

عام طور پر بچوں کا ہدیہ بچوں کے نام سے آتا ہے کہ یہ فلاں کے لیے ہے، اب وہ باپ کے پاس ہے، تو باپ، باپ ہونے کے باوجود اس بچے کے مال کو اس کی حقیقی ضرورتوں کے علاوہ میں استعمال نہیں کر سکتا ہے۔ اگر کرے گا، تو وہ زیادتی کرنے والا قرار دیا جائے گا۔ نابالغ کے مال میں بڑی احتیاط برتی گئی ہے، اس کا خاص لحاظ کرنا چاہیے۔ فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ آپ نے اپنے بچے کی نیت سے کپڑے بنوائے، جب اس کو پہنائے تو اس کے ہو گئے، بڑا ہونے کے بعد اسی کے کپڑے جس کا سائز چھوٹا پڑ گیا، اس کو بعد والے بھائیوں کو دے دیتے ہیں، یہ جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ اسی نابالغ بچے کی ملکیت ہے، آپ کو اس میں تصرف کرنے کا حق نہیں ہے۔ اگر آپ دینا چاہتے ہیں تو اس کی موجودہ

حقیقی قیمت تجویز کرو، اتنی قیمت اس کے نام پر الگ جمع کرو، پھر وہ کسی کو دو۔ اسی لیے فقہاء نے احتیاط اسی میں لکھا ہے کہ بچوں کو باقاعدہ مالک قرار نہ دیا جائے، اپنی ملکیت میں رکھتے ہوئے ان کو پہنایا جائے۔ بہر حال! شریعت نے احتیاط کا پہلو مد نظر رکھا ہے۔ لیکن عام طور پر ہمارے ہاں اس کو نہیں دیکھا جاتا۔ بچوں کے لیے ہدیے، پیسے اور بہت سی چیزیں آتی ہیں، عام طور پر عورتیں ان کے ہدیے کے پیسے خرچ ہی کر ڈالتی ہیں، یہ بہت خطرناک چیز ہے۔ کل قیامت میں حساب دینے کا وقت آئے گا تو پتا چلے گا۔ بہر حال! یہ نابالغ کا مسئلہ بڑا کٹھن ہے۔ یہ تو مطلق نابالغ کی بات ہوئی۔

## یتیم کا مسئلہ سنگین:

اور اگر نابالغ یتیم ہے، جیسے شوہر کا انتقال ہو گیا، چاہے بچے کی ماں ہے؛ لیکن بچہ تو نابالغ ہونے اور باپ کے انتقال ہو جانے کی وجہ سے یتیم ہے۔ اس کا مسئلہ بڑا سنگین ہے۔ تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں: فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ الْيَتِيمَ (وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے) ذرا ہمیں بھی اپنا جائزہ لینے، سوچنے اور دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کہیں ہم تو اس وعید میں نہیں آتے ہیں؟ ہر آدمی اپنے آپ کو دیکھ لے، اپنے حالات کا جائزہ لے لے۔

## دے دے یا دلادے:

وَلَا يَحْضُ عَلَى طَعَامِ الْيَتَامَىٰ. (اور وہ مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا) یعنی کسی غریب کو کھانا کھلانے اور دینے کی ترغیب نہیں دیتا۔ خود تو کیا کھلاتا؟ کسی دوسرے کو بھی یہ نہیں کہتا کہ غریبوں کو کھلاؤ۔ یعنی وہ اس درجہ کا بخیل ہے۔ اگر ایک آدمی استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے غریبوں کو کھانا نہیں کھلاتا تو کوئی حرج نہیں، گنہگار نہیں ہے۔ لیکن اگر ایسا

کوئی موقع ہو کہ مسکین اور غریب بھوک میں مبتلا ہیں، حاجت مند ہیں، تو لوگوں کو ان کو کھلانے کی ترغیب دینی چاہیے۔ مصیبت زدہ کی مصیبت دور کرنے کی ترغیب دینی چاہیے۔ جیسے آج کل کیرالہ کے سیلاب زدگان کا مسئلہ ہے، ان کے لیے خود مدد نہیں کر سکتا تو ترغیب دینی چاہیے۔

### .....تو ترغیب دینا واجب ہے:

البتہ یہ جانتا ہے کہ میں اس شخص کو ترغیب دوں گا تو اس پر کوئی اثر ہونے والا نہیں ہے؛ بلکہ الٹا ناراض ہوگا تو اس کو ترغیب دینا ضروری نہیں ہے۔ ایسے لوگ جن سے امید اور توقع ہو ان کو ترغیب دی جاسکتی ہے۔ اور اگر بھوک کی وجہ سے بالکل مرنے کے قریب ہو جائے، تو اگر طاقت ہے تو خود کھانا اور نہ دوسروں کو ترغیب دینا واجب لکھا ہے۔

بہر حال! جزاء و سزا کا انکار، یتیم کو دھکے دینا اور مسکین کو کھانا کھلانے اور کھانا دینے کی ترغیب نہ دینا، یہ تین باتیں مشرکین کے متعلق بتلائی گئیں۔

### نماز سے غفلت؛ تین صورتیں:

فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ

ویل بڑی خرابی کو کہتے ہیں۔ عذاب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس سورت کے آخری حصے میں جو برائیاں بتلائی گئی ہیں وہ منافقین میں تھیں، اور مکی دور میں منافقین نہیں تھے، بلکہ مدنی دور میں منافقین وجود میں آئے ہیں، اس لیے بہت سے اہل علم یوں کہتے ہیں کہ یہ آخری حصہ مدینہ میں نازل ہوا۔

فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (پھر بڑی خرابی ہے ان نماز

پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت سے برتنے ہیں۔

نماز سے غفلت برتنے کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً: بہت سے منافقین وہ تھے کہ کوئی دیکھ رہا ہو تو نماز پڑھتے تھے، کوئی نہ دیکھ رہا ہو، تنہائی میں ہوں تو چھوڑ دیتے تھے، آج مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ ہیں کہ لوگوں کو معلوم ہو رہا ہے تو نماز پڑھیں گے تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ یہ نماز نہیں پڑھتا۔ اور تنہا ہوں، جہاں کوئی دیکھنے والا موجود نہ ہو تو نماز چھوڑ دیتے ہیں۔

نماز کے معاملے میں غفلت سے کام لیتے ہیں، مثلاً: آگے پیچھے کر دیتے ہیں، وقت کی رعایت نہیں کرتے، کبھی وقت میں پڑھی، کبھی اس کو چھوڑ بھی دی۔

### بے توجہی:

یا جیسی توجہ، دھیان اور جی لگا کر پڑھنی چاہیے ویسی نہیں پڑھتے ہیں۔ یہ سب نماز سے غفلت میں داخل ہے۔ یا جیسے اس کے فرائض، واجبات، مستحبات، سنن کو ادا کرنے کا اہتمام نہیں کرتے۔ بہت سے لوگ وقت ملتا ہے تو پڑھتے ہیں، دنیوی کام کاج آگیا تو نہیں پڑھتے، وہ بھی اس میں داخل ہے۔ یہ باتیں جو بیان کی گئی ہیں اصل میں وہ تو منافقین کی حرکتیں ہیں؛ لیکن ان کو بیان کر کے مومنین کو بھی متنبہ کیا جا رہا ہے کہ یہ منافقین کے کام ہیں، اپنے آپ کو ان سے بچاؤ۔ تاکہ کہیں تم پر یہ لیبیل نہ لگ جائے۔

الَّذِينَ هُمْ يُرَآءُونَ (جو دکھاوا کرتے ہیں، دکھلانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں)

بہت سے وہ ہوتے ہیں کہ کوئی دیکھ رہا ہو تو پڑھ رہے ہیں، ورنہ نہیں پڑھتے۔ یاد دیکھ رہا ہو تو ذرا اچھی طرح پڑھتے ہیں، اور کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو ایسے ہی مرغ کی طرح ٹھونکیں مار کر

جلدی جلدی پوری کر دیتے ہیں۔

## یہ ایک قدم آگے نکل گیا:

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ فرماتے ہیں کہ یہ ریاکار بعض چیزوں میں شرک سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ریاکار انسانوں کو یعنی جن کو دکھلانے کے لیے یہ عمل کر رہا ہے ان کو اللہ کے مقابلے میں ترجیح دے رہا ہے۔ وہ تو جانتا ہے کہ اللہ بھی دیکھ رہے ہیں، تو یہ اللہ کی خاطر عمل نہیں کرتا؛ بلکہ انسانوں کے دکھلانے کے لیے کرتا ہے۔ تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں انسانوں کو عظمت دیتا ہے۔ مشرکین تو شریک کرتے ہیں، یہ تو ایک قدم آگے نکلا۔ پھر یہ کہ شرک کرنے والے اپنی دنیوی ضرورتوں کے معاملے میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں، جیسے کسی کے پاس اولاد مانگی، کسی سے روزی کا سوال کیا؛ لیکن یہ تو خالص عبادت، نماز، جو اللہ کے لیے پڑھی جانی چاہیے، وہ دوسروں کو دکھلاتا ہے تو یہ ایک قدم آگے نکل گیا۔ الحاصل شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ دکھلاوے والا شرک بہت خطرناک ہے۔<sup>۱</sup>

## ماعون سے مراد:

وَيَسْتَعُونُ الْبَاعُونَ. (اور دوسروں کو معمولی چیز دینے سے بھی انکار کرتے ہیں) ایک تو جتنے بھی اعمال خیر کرتے ہیں، دکھلانے کے لیے کرتے ہیں، یہ منافقین کی خاصیت ہے۔ اور دوسرا ماعون سے بھی انکار کرتے ہیں۔

ماعون کا کیا مطلب؟ اس سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، ابن عمر اور حضرت

(۱) تفسیر عزیزی: ۶۵۸-۶۵۹ (کتب خانہ فیض ابراہ، انگلشور، گجرات)

علیؑ سے منقول ہے کہ یہاں ماعون سے زکوٰۃ مراد ہے۔<sup>۱</sup> یعنی وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ اصل ماعون تو تھوڑی سی چیز کو کہتے ہیں۔ چوں کہ مال میں فرض زکوٰۃ مال کا چالیسواں حصہ ہے، (ڈھائی فی صد) تو ڈھائی فی صد کوئی بڑی چیز نہیں ہے، معمولی چیز ہے۔ لیکن یہ ڈھائی فی صد ہونے کے باوجود بہت سے لوگ اس کو ادا نہیں کرتے۔ گویا یہ منافقین زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ ان پر دوسرے حقوق ہیں جن کے طلب کرنے والے بندوں میں سے ہیں ان کے حقوق تو ان بندوں کے ڈر سے ادا کرتے ہیں، اس لیے کہ اگر ادا نہیں کریں گے، تو لوگوں میں ہماری رسوائی ہوگی، وہ ہمارا (Allah) کریں گے، یا حاکم کے ہاں نالش کر دیں گے، اس کی وجہ سے لوگوں میں ہمارا نام بدنام ہوگا؛ لیکن زکوٰۃ نہیں دیتے تو کس کو پتا چلتا ہے؟ وہ اللہ سے نہیں ڈرتے اس لیے زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ بہر حال! حضرت عبداللہ بن عباسؓ (کی ایک روایت میں) حضرت علیؑ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے نزدیک ماعون سے زکوٰۃ مراد ہے۔

## دوسرا مطلب:

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی دوسری روایت میں اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ ماعون سے وہ معمولی چیز مراد ہے جس کے آپس میں استعمال کے لیے، عاریتہ کے طور پر لوگوں میں لینے دینے کا دستور ہوتا ہے۔<sup>۲</sup> جیسے آپ کے ہاں مہمان زیادہ آگئے، ضرورت پیش آگئی، آپ کے ہاں کوئی بڑا پتیلا نہیں ہے۔ پڑوسی کے پاس گئے کہ آج ہمارے ہاں آٹھ دس مہمان ہو گئے ہیں، تمہارا بڑا پتیلا دے دو۔ تو دیتے ہیں۔ یا دیگر

(۱) تفسیر الطبری و تفسیر القرطبی۔

(۲) تفسیر الطبری و تفسیر القرطبی۔

استعمال کی چیزیں، ڈول، آگ، پانی، نمک وغیرہ۔ اُس زمانے میں عام طور پر ایسا ہوتا تھا۔ تو ان چیزوں کا پڑوسیوں میں عاریت کے طور لینے دینے کا رواج ہے، یہ لوگ بخل کی وجہ سے وہ بھی نہیں دیتے۔ اور اہل حرفت، اہل صنعت، پیشہ ور لوگوں کے آپس کے اوزار بھی اس میں آجاتے ہیں۔ ایک الیکٹریٹین ہے، دوسرے الیکٹریٹین کو کسی اوزار کی ضرورت پیش آئی تو وہ آپس میں دیتے ہیں؛ لیکن اگر کوئی نہ دے تو اسی ماعون کا مصداق بنے گا۔ یا ایک پلمبر دوسرے پلمبر کو کسی اوزار کی ضرورت پڑے، تو اس کو اپنے اوزار دیتا ہے؛ لیکن اگر کوئی نہ دے تو وہ اسی ماعون میں داخل ہو جائے گا۔ یا اہل علم ہے، تو وہ واپس میں قلم، کاغذ وغیرہ اشیاء کی آپس میں لین دین کرتے ہیں۔ اور کوئی ہونے کے باوجود نہ دے، تو یہ بھی اسی ماعون میں داخل ہوگا۔ کیوں کہ عام طور پر ایسی چیز سے منع نہیں کیا جاتا۔ بہر حال! اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ کفار اور منافقین کی چیزوں سے اپنے آپ کو ان برائیوں سے بچانے کا اہتمام کریں۔ تاکہ ان کے حق میں جو وعیدیں آئی ہیں، ان کا مصداق بننے کی نوبت نہ آئے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہم سب کو ان چیزوں کا اہتمام نصیب فرمائے۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورہ کوثر

(مؤرخہ: ۲۸/ ذی الحجہ ۱۲۳۹ھ مطابق ۸/ ستمبر ۲۰۱۸ء شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً. أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم ۝ بسم الله الرحمن الرحيم ۝

إِنَّا أَعْطَيْنَكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝

## مکی یا مدنی.....؟

یہ سورہ کوثر ہے، مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ یہ سورت مکی ہے یا مدنی؟ اس سلسلے میں دونوں باتیں کہی گئی ہیں۔ حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور جمہور سے منقول ہے کہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اور مسلم شریف میں حضرت انسؓ کی روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی؛ لیکن عام طور پر حضرات مفسرین اس کو مکی ہی شمار

(۱) صحیح مسلم: ۵۳۰ [۲۰۰]۔

کرتے ہیں۔ اور حضرت انسؓ کی روایت کے متعلق بتلایا جاتا ہے کہ جب حضور ﷺ کے صاحب زادے حضرت ابراہیمؑ جو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے تھے، اور وہیں اُن کا انتقال ہوا، اس موقع پر بھی کافروں اور منافقوں نے خوشیاں منائی تھیں، ہو سکتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے اس موقع پر اس کو دوسری مرتبہ نازل کیا گیا ہو۔<sup>۱</sup>

## شان نزول:

اس سورت کے شان نزول کے متعلق بتلایا جاتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کے صاحب زادے کا انتقال ہوا، تو اس وقت کافروں نے بطور خاص عاص بن وائل نے بڑی خوشیاں منائیں۔ حضور اکرم ﷺ کی سب اولاد، سوائے حضرت ابراہیمؑ کے، حضرت خدیجہؓ سے تھیں۔ آپ ﷺ کی چار صاحب زادیوں نے تو بڑی عمر پائی، اور ایمان بھی لائیں۔ البتہ آپ ﷺ کے صاحب زادے بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی حکمت و مشیت کا یہی تقاضا تھا، چوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو خاتم النبیین بنایا تھا، اور عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ نبی کی اولاد بھی نبی ہوتی ہے، ان کو بھی پیغمبری سے نوازا جاتا ہے، اور ماننے والوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو غلو کے شکار ہوتے ہیں، وہ ان کے بڑے ہونے کے بعد ان کو کوئی مسئلہ نہ بنالیں، اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ ﷺ کی نرینہ اولاد کو بچپن ہی میں اٹھالیا۔

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سیہلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

## (۱) حضرت زینبؓ:

آپ ﷺ کی صاحب زادیاں چار تھیں۔ سب سے بڑی صاحب زادی حضرت زینبؓ ہیں۔ جب نبی کریم ﷺ کا نکاح حضرت خدیجہؓ سے ہوا، اس وقت حضور اکرم ﷺ کی عمر شریف پچیس سال تھی، نکاح کے پانچ سال بعد حضرت زینبؓ پیدا ہوئیں، یہ صاحب زادیوں میں سب سے بڑی ہیں۔ اس وقت نبی کریم ﷺ کی عمر شریف تیس سال کی تھی۔

## (۲) حضرت رقیہؓ:

اور ان کے تین سال بعد حضرت رقیہؓ پیدا ہوئیں۔ اس وقت حضور اکرم ﷺ کی عمر شریف تینتیس سال تھی۔ حضرت زینبؓ کا نکاح ان کے خالہ زاد بھائی حضرت ابوالعاص بن ربیعؓ - حضرت خدیجہؓ کے بھانجے - سے ہوا تھا۔ بعد میں وہ بھی ایمان لائے اور حضرت زینبؓ جب ہجرت کے لیے روانہ ہوئیں، تو بعض مشرکین نے پیچھا کیا، اور آپؐ کے ہودج پر برچھا لگایا، اس سے آپؐ نیچے پتھر پر گریں، حمل سے تھیں، اسی وقت سے بیمار ہوئیں، اور اسی بیماری میں آپؐ کا انتقال ہوا۔ حضرت شیخؒ نے حکایات صحابہؓ میں پورا قصہ تفصیل سے ذکر کیا ہے، وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ ۸۔ میں ان کا انتقال ہوا۔

## (۳) حضرت ام کلثومؓ:

دوسری صاحب زادی حضرت رقیہؓ اور تیسری صاحب زادی حضرت ام کلثومؓ دونوں کا نکاح حضور ﷺ نے پہلے ابولہب کے دونوں بیٹوں سے کرایا تھا، بڑا بیٹا عتبہؓ، اور چھوٹا بیٹا عتیبہؓ تھا۔ حضرت رقیہؓ کا نکاح عتبہؓ سے کرایا تھا، اور حضرت ام کلثومؓ کا نکاح عتیبہؓ سے کرایا تھا۔

سے کرایا تھا۔ رخصتی ہونے سے قبل ہی حضور اکرم ﷺ کی دعوتِ اسلام کا سلسلہ شروع ہوا، اور ابولہب نے آپ ﷺ کی مخالفت شروع کی، اس موقع پر سورہ لہب نازل ہوئی۔ یہ پورا قصہ آپ سن چکے ہیں۔ اس وقت ابولہب نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا: اگر تم ان (حضور ﷺ) کی بیٹیوں کو طلاق نہیں دو گے تو میرا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ چناں چہ اس کے دونوں بیٹوں نے حضور ﷺ کی دونوں صاحب زادیوں کو طلاق دے دی۔ یہ قصہ بھی سورہ لہب کے ضمن میں آپ کو بتلایا گیا ہے۔ اس وقت ان دونوں کی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔

## تین ہجرتوں کی سعادت:

پھر حضور اکرم ﷺ نے حضرت رقیہؓ - دوسرے نمبر کی صاحب زادی - کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کیا۔ وہ بھی ایمان لائے تھے۔ اور جب مسلمانوں نے مکہ والوں کے مظالم سے تنگ آ کر حبشہ کی ہجرت کی، تو ان ہجرت کرنے والوں میں یہ جوڑا - حضرت عثمانؓ، اور آپ ﷺ کی صاحب زادی حضرت رقیہؓ - بھی تھا۔ پھر حبشہ میں کسی نے افواہ چلا دی کہ مکہ والے سب ایمان لے آئے، تو جو لوگ ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے وہ یہ سوچ کر کہ ہم تو ان کی ایذاؤں کی وجہ سے یہاں آئے ہوئے تھے، اب وہ سب ایمان لے آئے ہیں، تو ہم واپس چلے جائیں۔ لیکن جب واپس آئے، تو معلوم ہوا کہ یہ خبر تو جھوٹی تھی، تو دوبارہ ہجرت کی۔ حبشہ کی دونوں ہجرتیں حضرت رقیہؓ نے اپنے شوہر حضرت عثمانؓ کے ساتھ کی ہیں۔ پھر وہاں سے وہ مدینہ بھی پہنچے۔ گویا تین ہجرتیں ہوئیں۔

حضور ﷺ جب غزوہ بدر کے لیے نکلے تو اس وقت حضرت رقیہؓ بیمار تھیں، اور حضرت عثمانؓ حضور ﷺ کے ساتھ غزوہ بدر میں شرکت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن نبی کریم ﷺ

نے ان کو روک دیا، اور تاکید فرمائی کہ تم ان کی خبر گیری میں رہو۔ چنانچہ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے غزوہ بدر میں مسلمانوں کو کامیابی عطا فرمائی اور اس کی خوش خبری لے کر جب آدمی مدینہ منورہ پہنچا، تو اُس نے دیکھا کہ لوگ حضرت رقیہؓ کو دفن کر کے فارغ ہوئے ہیں۔ ان کا انتقال ۳۰ھ میں ہوا۔

## ذوالنورین:

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے حضور ﷺ نے دوسری صاحب زادی حضرت ام کلثومؓ کو بھی حضرت عثمانؓ کے نکاح میں دیا، یہ کہہ کر کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے میں ان کے نکاح میں دے رہا ہوں۔ اسی لیے حضرت عثمانؓ کا لقب ذوالنورین تھا دونوں والے۔ نبی کریم ﷺ کی دو صاحب زادیاں ان کے نکاح میں تھیں، اس لیے ان کو ذوالنورین کہا جاتا تھا۔ حضرت ام کلثومؓ کا انتقال ۹ھ میں ہوا۔ حضور ﷺ ان کی تدفین میں شریک رہے ہیں۔

## (۴) حضرت فاطمہؓ:

اور چوتھی صاحب زادی حضرت فاطمہؓ۔ نبوت کے ایک سال بعد پیدا ہوئیں۔ گویا آپ ﷺ پر وحی کا سلسلہ شروع ہوا، اس کے بعد ان کی پیدائش ہوئی۔ حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے ہوا، اور پھر ان ہی سے آپ ﷺ کی اولاد چلی۔ آج تک سادات کا سلسلہ ان ہی سے ہے۔ یہ تو صاحب زادیاں ہیں۔

## (۱) حضرت قاسمؓ:

اور صاحب زادوں میں نبی کریم ﷺ کے بڑے صاحب زادے حضرت قاسمؓ

حضرت زینبؓ سے پہلے پیدا ہوئے، یا بعد میں؟ اس سلسلے میں مؤرخین میں اختلاف ہے بعض حضرات فرماتے ہیں: پہلے حضرت زینبؓ، پھر حضرت قاسم پیدا ہوئے۔ بعض حضرات کا قول اس کے برعکس ہے۔ بہر حال! دو سال کی عمر میں حضرت قاسمؓ کا انتقال ہو گیا تھا۔

## (۲) حضرت عبداللہؓ:

دوسرے صاحب زادے حضرت عبداللہؓ نبوت کے بعد پیدا ہوئے۔ اور ان کی پیدائش کے بعد ان کے علاوہ صاحب زادوں میں ایک حضرت ابراہیمؓ ہیں، جو مدینہ منورہ میں آپ ﷺ کی باندی حضرت ماریہ قبطیہؓ سے پیدا ہوئے تھے۔ ان تین صاحب زادوں کے متعلق سب کا اتفاق ہے۔ ان کے علاوہ کے سلسلے میں بعض کہتے ہیں کہ طیب بھی تھے، طاہر بھی تھے۔ یعنی کل ملا کر پانچ تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ طیب اور طاہر ایک ہی صاحب زادے کا لقب تھا۔ تو کل چار ہوئے۔ بعضوں نے کہا کہ طیب اور طاہر حضرت عبداللہؓ جو نبوت کے بعد پیدا ہوئے تھے، نبوت کے بعد پیدا ہونے کی وجہ سے ان ہی کے لقب تھے۔ اور اسی کو حضرات مؤرخین نے رائج قرار دیا ہے۔

## جب کوئی نرینہ اولاد باقی نہ رہی:

حضرت عبداللہؓ بچپن ہی میں انتقال کر گئے، اس کے بعد آپ ﷺ کی کوئی نرینہ اولاد باقی نہ رہی۔ اس وقت مکہ کے مشرکین نے جو آپ ﷺ کے دشمن تھے اور ان میں خاص طور پر عاص بن وائل، اور آپ ﷺ کا چچا ابولہب، ان لوگوں نے خوشیاں منائیں۔ اور یوں کہا کہ اب ان کی تو کوئی نرینہ اولاد نہ رہی۔ اور عرب لوگ جس کی نرینہ اولاد ختم ہو

جاتی / نہ ہوتی، اس کو ابتر کہتے تھے۔ گویا ان کے دنیا سے جانے کے بعد دنیا میں ان کا نام لینے والا کوئی باقی نہیں رہے گا۔ اولاد ہی سے آدمی کا سلسلہ چلتا ہے، اور جب وہ ختم ہوگئی تو یہ بے نام و نشان ہو گیا۔ اس پر عاص بن وائل نے کہا تھا کہ یہ ابتر ہیں۔ اور اسی پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے بشارت سناتے ہوئے یہ سورت نازل فرمائی۔<sup>۱</sup>

## سب سے چھوٹی سورت:

کلمات اور حروف کے اعتبار سے قرآن کی سورتوں میں یہ سب سے چھوٹی سورت ہے۔ کلمات ۱۴، بتلائے گئے ہیں، اور حروف ۴۲ ہیں۔ گویا تمام سورتوں میں یہ سب سے چھوٹی سورت کہلاتی ہے۔

اس سورت میں آپ ﷺ کو دو خوش خبریاں دی گئی ہیں، اور دو حکم دیے گئے ہیں۔ پہلی خوش خبری تو یہ دی گئی: اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ (اے نبی! یقین جانو! ہم نے آپ کو کوثر عطا کر دی ہے)۔

## کوثر کیا ہے؟

کوثر کیا ہے؟ یہ کلمہ کثرۃ سے بنا ہے۔ لغت اور ڈکشنری کے اعتبار سے کوثر خیر کثیر کو کہتے ہیں، یعنی بہت زیادہ بھلائی۔<sup>۲</sup> اللہ تبارک و تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو دنیوی، اخروی، مادی اور روحانی بہت ساری بھلائوں سے نواز ا تھا۔ آپ ﷺ کو نبوت عطا فرمائی، قرآن

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

(۲) کتاب العین للفراہیدی: ۵/۳۴۸ (ط: مکتبۃ الہلال)

عطا فرمایا، آپ ﷺ کو اتنی بڑی امت دی۔ سب بھلائیاں ہی بھلائیاں ہیں۔ دنیا کی بھی اور آخرت کی بھی۔ گویا ان سب کی طرف اشارہ ہے۔

## جنت کی نہر:

اور ان ہی میں سے ایک وہ نہر بھی ہے، جو اللہ تعالیٰ نے جنت میں بنائی ہے، جس کا نام نہر کوثر ہے۔ اور ان ہی میں سے وہ حوض بھی ہے جو میدان حشر میں ہوگا، جو چوکور (مربع) ہوگا۔ کوثر حوض بھی ہے اور نہر بھی ہے۔ نہر تو جنت میں ہے، اور اسی نہر سے دو پر نالے۔ ایک چاندی کا اور ایک سونے کا۔ میدان حشر میں اس حوض میں پانی ڈالنے کے لیے لائے گئے ہیں۔ اور ان سے پانی اس حوض میں گرتا رہتا ہے۔ اور وہ پانی اسی نہر سے پہنچتا رہتا ہے۔ اس حوض کا نام بھی حوض کوثر ہے۔ جب محشر میں لوگ دوبارہ زندہ کر کے پہنچائے جائیں گے تو پیاسے ہوں گے، اس وقت نبی کریم ﷺ اپنی امت کے لوگوں کو اسی میں سے پانی پلائیں گے۔ تو یہ کوثر حوض بھی ہے، اور اس حوض میں پانی جنت کی جس نہر سے آتا ہے اس نہر کا نام بھی نہر کوثر ہے۔<sup>۱</sup>

## اولاد کی زیادتی:

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی تفسیر فتح العزیز (تفسیر عزیزی) میں فرماتے ہیں کہ کوثر سے آپ ﷺ کی اولاد کی زیادتی بھی مراد ہے۔ آپ ﷺ کی اولاد دو طرح کی ہے: حقیقی اور مجازی۔ حقیقی اولاد جو آپ ﷺ کی صاحب زادی حضرت فاطمہؓ کے

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔



بطن سے پیدا ہوئی، آج دنیا میں دیکھیے! سادات پورے عالم میں بڑی تعداد میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد کو اتنا کثیر بنایا کہ پورے عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ سادات کا سلسلہ آپ جہاں جہاں جائیں گے، وہاں نظر آئے گا۔ تو آپ ﷺ کی اولاد کی اتنی کثرت ہے۔ جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت فاطمہؓ کے ذریعہ فرمائی۔ کہ کسی کی اولاد کی اتنی کثرت نہیں ہے۔ یہ تو حقیقی اولاد ہے جو آپ ﷺ کی صاحب زادی سے وجود میں آئی۔

## محازی اولاد:

اور دوسری محازی اولاد ہے۔ وہ آپ ﷺ پر ایمان لانے والے تمام اہل ایمان ہیں۔ ان کی تعداد تو اتنی زیادہ ہے کہ قیامت کے روز تمام امتوں میں سب سے زیادہ بڑی امت آپ ﷺ کی ہوگی۔<sup>۱</sup>

ترمذی شریف کی روایت ہے کہ میدان حشر میں اہل جنت کی ۱۲۰ صفیں لگیں گی، ان میں سے ۸۰ یعنی دو تہائی صفیں امت محمدیہ کی ہوں گی۔<sup>۲</sup> اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ ﷺ کی روحانی اور محازی اولاد کی کتنی بڑی تعداد ہے!!! اور وہ سب میدان حشر میں حوض کوثر پر آپ ﷺ کے دست مبارک سے پانی پیے گی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یہ بشارت سنائی۔

## تمام علوم پائے:

شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ علوم کی کثرت یہ بھی اس کوثر میں آجاتی ہے۔<sup>۳</sup>

(۱) حضرت حسن، مکرّمہ، مجاہد اور نقادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

(۲) سنن الترمذی: ۲۵۴۶۔

(۳) تفسیر عزیزی/ ۶۶۰۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس امت کو جتنے علوم عطا فرمائے کسی اور امت کو اتنے علوم نہیں دیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سے پہلے جتنی بھی امتیں گزری ہیں، ان تمام کے علوم اس امت نے پائے ہیں، اس لیے کہ یہ بعد میں آئی۔ نیز خود اس امت نے بہت سے علوم کی ایجاد کی: نحو، صرف، معانی، بلاغت، تفسیر، حدیث، اصول تفسیر، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم رجال وغیرہ اس امت نے ایجاد کیے ہیں۔ تو اگلوں اور پچھلوں کے سارے علوم اللہ تعالیٰ نے اس امت کو عطا فرمائے۔ اور کوثر کا عرفی معنی نہر یا حوض ہے، وہ بھی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا فرمایا۔<sup>۱</sup>

بہر حال! اس پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے سب باتیں اڑائیں، خوشیاں منائیں اس کی وجہ سے آپ ﷺ کا دل رنجیدہ ہوا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس خوش خبری کے ذریعے آپ ﷺ کو خوشی عطا فرمائی۔

## پہلی خوش خبری:

مسلم شریف میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ہمارے درمیان نبی کریم ﷺ تشریف فرما تھے کہ آپ ﷺ پر ایک غشی کی سی کیفیت طاری ہوئی، جو وحی کے نزول کے وقت طاری ہوتی تھی، جب وہ کیفیت دور ہوئی، تو آپ ﷺ مسکرانے لگے۔ ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کیوں مسکراتے ہیں؟ تو جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ابھی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ایک سورت نازل فرمائی، اور پھر آپ ﷺ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سیہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

پڑھ کر پوری سورت سنائی، پھر خود ہی سوال کیا کہ جانتے ہو کوثر کیا ہے؟ اور پھر آپ ﷺ نے کوثر کی تشریح فرمائی۔<sup>(۱)</sup> بہر حال! اس سورت کو نازل فرما کر اللہ تبارک و تعالیٰ نے دو خوش خبریاں عطا فرمائی تھیں۔ ان میں سے ایک خوش خبری تو یہ ہے۔

## چشم اقوام یہ نظاہ ابد تک دیکھے:

دوسری خوش خبری تیسری آیت میں ہے: إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ۔ **شَنَاءُ** - یشنأ کا معنی ہے بغض و عداوت رکھنا، دشمنی رکھنا۔ وَلَا يَجْرِيَنَّكُمْ شَنَاٰنٌ قَوْمٍ عَلَىٰ آلَا تَعْدِلُوا (المائدة: ۸۰) (کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کے تقاضوں کو پورا نہ کرو) اسی سے اسم فاعل کا صیغہ ہے **شَانِئٌ** یعنی دشمن، اسی سے کہا: إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ (یقین جانو! تمہارا دشمن ہی ہے وہ جس کی جڑ کٹی ہوئی ہے) **ابتر** یعنی جس کی دم کٹی ہوئی ہو، جڑ کٹی ہوئی ہو۔ جو بے اولاد ہو اس کو بھی **ابتر** کہتے ہیں، جس کا اب نام و نشان نہیں۔ وہ آپ کو بے نام و نشان کہتا ہے!!! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: نہیں! آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں، یہ آپ کا دشمن ہی بے نام و نشان ہے۔

چنانچہ آج پورے عالم میں کروڑوں کی تعداد میں آپ ﷺ کے ماننے والے ہیں، وہ ہر وقت اپنی جان آپ ﷺ کی عزت و آبرو کے لیے چھڑکنے کے لیے تیار ہیں، آپ ﷺ پر درود شریف پڑھنے کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں، آپ ﷺ کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ حاضری کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں، اور آپ ﷺ ہی کی نسبت سے اپنی اولاد کے نام احمد یا محمد رکھتے ہیں ان کی تعداد اور کثرت دیکھو۔

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سیہلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے | رفعت شان ورفعتنا لک ذکرک دیکھے

(اقبال)

## وہی دُم بریدہ ہے:

نیز اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے نام کے ساتھ آپ ﷺ کا نام اذان میں بھی جڑوایا اور اقامت میں بھی۔ دنیا میں سورج گردش کرتا ہے، تو ہر لمحہ کسی نہ کسی جگہ نئی نماز کا وقت شروع ہوتا ہے۔ ہمارا غروب تو کب سے ہو گیا؛ لیکن اس وقت کسی نہ کسی جگہ سورج غروب ہو رہا ہوگا، اور اس کے بعد مغرب کی اذان ہوگی۔ اس وقت کہیں عشاء کا وقت شروع ہو رہا ہوگا، کہیں فجر کا وقت شروع ہو رہا ہوگا، کہیں ظہر کا وقت شروع ہو رہا ہوگا، کہیں عصر کا وقت شروع ہو رہا ہوگا۔ گویا پورے عالم میں ہر وقت کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی نماز کا وقت شروع ہو رہا ہے، اور نماز بھی پڑھی جا رہی ہے۔ تو اذان اور اقامت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے نام کے ساتھ آپ ﷺ کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ آپ ﷺ کا نام لینے والے اللہ تعالیٰ نے لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں پیدا فرمائے۔ تو جو آپ ﷺ کو بے نام و نشان کہتا تھا، آج آپ ﷺ سے زیادہ کسی کا نام لینے والا نہیں ہے۔ اور عاص بن وائل وغیرہ جو آپ ﷺ کو بے نام و نشان کہتے تھے ان کو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: وہی ابتر اور دم بریدہ ہے۔ آج اس کا کوئی نام جاننے والا بھی نہیں، اور اگر اس کا نام لیا بھی جاتا ہے تو اس واقعے کی نسبت سے، اور وہ بھی اچھائی کے ساتھ نہیں؛ بلکہ برائی کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ورنہ نام بھی کون جانتا ہے؟ اور اس کے نام پر نام رکھنے والے آج دنیا میں کتنے ہیں؟ کسی نے بھی اس کے نام پر اپنی اولاد کا نام رکھا؟ تو حقیقت میں وہی بے نام و نشان ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بڑی

عزت عطا فرمائی ہے۔

یہ دو خوش خبریاں تھیں، پہلی آیت میں، اور تیسری آیت میں۔ بیچ کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو حکم بھی دے دیے۔

## دو حکم:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ

جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اتنی بڑی خیر عطا فرمائی ہے تو اے نبی! فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (تم اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نماز پڑھو، اور قربانی کرو)۔  
نحر اونٹ کے ذبح کرنے کو کہتے ہیں؛ لیکن یہاں مطلق قربانی مراد ہے۔

## نماز عید و قربانی واجب ہے:

یہاں کون سی نماز مراد ہے؟ تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت تو یہ ہے کہ اس سے پانچوں وقت کی فرض نمازیں مراد لی گئی ہیں۔<sup>۱</sup> اور حضرت انسؓ کی ایک روایت جو علامہ قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں ذکر کی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے عید الاضحیٰ کی نماز مراد لی گئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ پہلے نبی کریم ﷺ کا معمول یہ تھا کہ قربانی پہلے کرتے تھے، اور پھر نماز پڑھتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی، تو آپ ﷺ پہلے عید کی نماز پڑھنے لگے، اور اس کے بعد قربانی کرنے لگے۔<sup>۲</sup> تو اس سے معلوم ہوا کہ نماز سے عید

(۱) رواہ الضحاك عن ابن عباس رضي الله عنهما (تفسير القرطبي) ورواه الطبري بسنده عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه.

(۲) حضرت حسن، مکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

کی نماز مراد ہے۔ اور فضِّل اور وانحر یہ دونوں امر کے صیغے ہیں اسی لیے احناف اس بات کے قائل ہیں کہ عید کی نماز بھی واجب ہے، اور قربانی بھی واجب ہے۔ ان ہی آیتوں کی وجہ سے ان کے وجوب کے قائل ہیں، ان ہی سے وجوب پر استدلال کیا گیا ہے۔

## دشمن کی ناکامی کا غیبی نسخہ:

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی کسی کی مخالفت پر آمادہ ہے، دشمنی پر اتر اہوا ہے، اس کی طرف سے اس کے خلاف اسکیموں کو اگر وہ ناکام و نامراد بنانا چاہے، تو اس کا غیبی نسخہ بھی اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس سورت میں بتلادیا کہ نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ اس کا اہتمام کرو گے تو اللہ تعالیٰ آپ کے دشمن کو ناکامی عطا فرمائیں گے۔

اب کوثر کے سلسلے میں نبی کریم ﷺ کے کچھ ارشادات ہیں، مشکوٰۃ شریف میں صاحب مشکوٰۃ نے کوثر کی مناسبت سے جو روایات ذکر کی ہیں ان ہی کا ترجمہ آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

## چند احادیثِ حوضِ کوثر:

### مشک کے مانند خوشبودار:

(۱) حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں شبِ معراج میں جنت میں چل پھر رہا تھا، اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہر کی دونوں جانب موتیوں کے بنائے ہوئے قبے ہیں کہ موتیوں کو اندر سے تراش کر اس نہر پر ایک ایک موتی کا ایک ایک قبہ بنا دیا گیا ہے۔ میں نے دریافت کیا: اے جبریل! یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا

کہ یہ کوثر ہے، جو آپ کے رب نے آپ کو عطا فرمائی ہے، اس کے اندر کی مٹی بہت تیز خوشبودار مشک ہے۔<sup>۱</sup> گویا یہ جنت کی نہر ہے، نہر بھی ہے، اور اسی سے پانی لا کر میدان حشر میں حوض بھی بنایا گیا ہے۔

## آسمان کے تارے، کوثر کے پیالے:

(۲) حضرت عبداللہ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ آں حضرت، سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے حوض کا طول و عرض یعنی لمبائی اور چوڑائی اتنی زیادہ ہے کہ اس کی ایک طرف سے دوسری طرف جانے کے لیے ایک مہینے کی مدت درکار ہے۔ یعنی اُس زمانہ میں جو سفر کے ذرائع تھے، ان کے ذریعے سے ایک مہینے کی مسافت کے بقدر اس کی لمبائی بھی ہے، اور چوڑائی بھی۔ حوض کوثر چوکور ہے، اس کے گوشے برابر ہیں، یعنی طول و عرض دونوں برابر ہیں۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید ہے، اس کی خوشبودار مشک سے زیادہ عمدہ ہے، اس کے لوٹے اتنے ہیں جتنے آسمان کے ستارے، جو اس میں سے پیے گا کبھی پیاسا نہ ہوگا۔<sup>۲</sup> جس نے ایک مرتبہ پی لیا تو کبھی اس کو پیاس نہ ستائے گی۔ پھر جنت میں جو پینا وغیرہ ہوگا وہ صرف لذت حاصل کرنے کے لیے ہوگا، پیاس بجھانے کے لیے نہیں۔

## ضرور پہچانیں گے:

(۳) حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرا حوض اس قدر لمبا اور چوڑا ہے کہ اس کے دونوں طرفوں کے درمیان اُس فاصلے سے بھی

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

(۲) رواہ الشیخان: البخاری: ۶۰۹۳ و مسلم: ۴۲۴۴۔

زیادہ فاصلہ ہے جو ”ایلہ“ سے ”عدن“ تک ہے۔<sup>(۱)</sup> (ایلہ فلسطین کے علاقے میں ایک بندرگاہ ہے، اور عدن یمن میں واقع ہے۔ ان دونوں کے درمیان جتنا فاصلہ ہے، حوض کوثر کا ایک سرادوسرے سرے سے اتنا دور ہے) سچ جانو! وہ برف سے زیادہ سفید اور اُس شہد سے زیادہ میٹھا ہے جو دودھ میں ملا ہوا ہو، اور اس کے برتن ستاروں کی تعداد سے زیادہ ہیں، اور میں دوسری امتوں کو اپنے حوض پر آنے سے ہٹاؤں گا، جیسے دنیا میں کوئی شخص دوسروں کے اونٹوں کو اپنے حوض سے ہٹاتا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا اُس روز ہم کو آپ پہچانتے ہوں گے؟ یعنی ہم آئیں گے تو آپ ہم کو پہچانیں گے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں! ضرور پہچانیں گے۔ اس لیے کہ تمہاری ایک علامت ہوگی، وہ کسی اور امت کی نہیں ہوگی، وہ یہ کہ تم حوض پر میرے پاس ایسی حالت میں آؤ گے کہ وضو کے اثر سے تمہارے چہرے روشن ہوں گے، اور ہاتھ پاؤں سفید ہوں گے۔<sup>(۲)</sup> تو وضو کرو گے اور نمازیں پڑھو گے تب یہ چیز پائی جائیں گی نا!!!! اس لیے اس کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔

(۴) مسلم شریف کی دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: آسمان کے ستاروں کی تعداد کے برابر حوض میں سونے چاندی کے لوٹے نظر آ رہے ہوں گے۔<sup>(۳)</sup>

## دوپرنالے، سونے اور چاندی کے:

(۵) مسلم شریف کے حوالے سے ایک اور روایت کے الفاظ ہیں: آپ ﷺ نے فرمایا: اُس حوض میں دو پرنا لے کر رہے ہوں گے جو جنت کی نہر سے اس کے پانی میں

(۱) رواہ الشیخان: البخاری: ۶۰۹۳ و مسلم: ۴۲۴۴.

(۲) رواہ الشیخان: البخاری: ۶۰۹۳ و مسلم: ۴۲۴۴.

(۳) رواہ الشیخان: البخاری: ۶۰۹۳ و مسلم: ۴۲۴۴.



اضافہ کر رہے ہوں گے۔ ایک پر نالہ سونے کا اور دوسرا چاندی کا ہوگا۔ یعنی محشر میں جو حوض بنایا جائے گا اس کا پانی جنت کی نہر کوثر سے آئے گا۔<sup>۱</sup>

بہر حال! احادیث شریفہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نہر کوثر جنت میں ہے اور میدان حشر میں اس میں سے ایک شاخ لائی جائے گی، جس میں اوپر سے پانی آتا رہے گا، اور ایمان والے اس میں سے پیتے رہیں گے۔

## حمام کوثر کس کے لیے:

(۶) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک اور روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میرا حوض اتنا بڑا ہے کہ جتنا عدن اور عمان کے درمیان فاصلہ ہے۔ (عدن یمن میں ہے، عمان جو ردن میں ہے) برف سے زیادہ ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ میٹھا، اور مشک سے بہتر اس کی خوشبو ہے۔ اس کے پیالے آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ ہیں، جو اس میں سے ایک مرتبہ بھی پی لے گا اس کے بعد کبھی بھی پیاسا نہ ہوگا۔ سب سے پہلے اس پر مہاجرین، فقراء آئیں گے۔ کسی نے مجلس میں سے پوچھا: یا رسول اللہ! ان مہاجرین، فقراء کا حال بتا دیجیے! تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ لوگ وہ ہیں کہ دنیا میں جن کے سروں کے بال بکھرے ہوئے اور چہرے بھوک، محنت اور تھکن کے باعث بدلے ہوئے ہوتے تھے، ان کے لیے بادشاہوں اور حاکموں کے دروازے نہیں کھولے جاتے تھے، اور عمدہ عورتیں ان کے نکاح میں نہیں دی جاتی تھیں۔<sup>۲</sup> اور ان کے معاملات کی خوبی کا حال یہ تھا کہ ان کے ذمے کسی کا حق ہوتا تھا وہ ادا کر دیتے تھے، اور ان کا حق جو کسی کے ذمے ہوتا وہ پورا نہ وصول کرتے تھے؛ بلکہ تھوڑا

(۱) صحیح مسلم: [۳۷] ۲۳۰۱۔

(۲) رواہ الشیخان البخاری: ۶۰۹۳ و مسلم: ۴۲۴۴۔

بہت چھوڑ دیتے تھے۔ گویا ان صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارا حق کسی پر ہے تو اس کو وصول کرنے میں کچھ چھوڑ دیا جائے، دوسروں کا حق پورا ادا کیا جائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے جب یہ حدیث سنی تو کہا کہ میرے نکاح میں تو عبدالملک بن مروان کی بیٹی ہے، اور میرے لیے تو بادشاہوں کے دروازے کھولے جاتے ہیں، تو میں کیسے ان لوگوں میں سے ہوسکوں گا؟ تو پھر انہوں نے یہ اہتمام کیا کہ بال جب تک خشک ہو کر بکھرنے نہ لگتے تھے تب تک وہ تیل استعمال نہیں کرتے تھے؛ تاکہ بکھرے ہوئے بال والی صفت اپنے اندر پائی جائے۔<sup>۱</sup>

اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ نعمت عطا فرمائے، اس کے لیے جن اعمال کا اہتمام کرنا ہے اس کے لیے ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق اور سعادت عطا فرمائے۔

(۱) مسند عمر بن عبدالعزیز: ۱/۱۲۲ [۶۳] (ط: مؤسسة علوم القرآن، دمشق)۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورہ کافرون

(مؤرخہ: ۱۵/ ذی قعدۃ الحرام ۱۲۳۹ھ - مطابق: ۲۳/ جولائی ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

(قسط-۱)

الْحَمْدُ لِلَّهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ  
بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ  
أَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ  
وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ أَرْسَلَهُ إِلَى  
كَافَّةِ النَّاسِ بِشِيرٍ أَوْ نَذِيرٍ أَوْ دَاعِيٍّ إِلَى اللَّهِ بِأَذْنِهِ وَسِرَّاجًا مُنِيرًا صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَ  
عَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا. آمَنَّا بَعْدُ.

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ. بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ.

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ﴿١﴾ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ﴿٢﴾ وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ ﴿٣﴾ وَلَا  
أَنَا عَابِدُ مَا عَبَدْتُمْ ﴿٤﴾ وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ ﴿٥﴾ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ﴿٦﴾.

## شان نزول:

یہ سورہ کافرون ہے۔

(۱) اس کے شان نزول کے بارے میں بتلایا گیا ہے کہ جب پورا عرب بت پرستی  
میں مشغول تھا، اور وہی ان کا دین اور مذہب تھا، اس وقت آپ ﷺ نے توحید کی دعوت دی  
کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور اپنی تمام صفات میں وہ یکتا ہے، اسی کی عبادت کرو، کسی کو اس کے

ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سعادت مند بندوں کو توفیق عطا فرمائی، اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے ایمان قبول کیا، اور توحید پر عمل کرنے لگے۔ اچھی خاصی تعداد مکہ مکرمہ میں بھی اہل ایمان کی ہو گئی۔ لیکن بڑی تعداد وہ تھی جو آپ ﷺ پر ایمان نہیں لائی تھی، بالخصوص سرکردہ لوگ، ان کی اکثریت نے دعوت ایمان کو قبول نہیں کیا تھا۔ اور وہ لوگ نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے والے اہل ایمان پر ظلم کے پہاڑ توڑتے تھے۔ اب اس موقع پر چوں کہ ایمان والوں اور کافروں کے درمیان ایک کشمکش رہتی تھی، تو بعض سردارانِ قریش نے نبی کریم ﷺ کے سامنے صلح کی پیشکش کی۔ چنانچہ سردارانِ قریش، حارث بن قیس سہمی، عاص بن وائل، ولید بن مغیرہ، اسود بن عبد یغوث، اسود بن مطلب، امیہ بن خلف، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں صلح کی یہ صورت لے کر آئے کہ آپ ایسا کریں کہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں اور ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں۔ گویا اس طرح ہمارے درمیان جو کشمکش اور جھگڑا ہے وہ ختم ہو اور صلح کی کوئی صورت پیدا ہو۔ اس کے جواب میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ (۱)

(۲) بعض روایات میں یہ بھی وارد ہے کہ ان لوگوں نے کہا کہ آپ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہیں، ان کی برائی بیان کرتے ہیں، یہ سلسلہ ختم کریں۔ آپ جتنا مال چاہیں ہم دینے کے لیے تیار ہیں۔ یا آپ عرب کی کسی حسین ترین عورت کو اپنے نکاح میں لانا چاہیں تو

(۱) تفسیر عبدالرزاق الصنعانی و تفسیر الطبری و تفسیر ابن ابی حاتم و تفسیر البغوی و تفسیر ابن عطیة [سورة الکفرون]۔

ہم اس کا بھی انتظام کیے دیتے ہیں۔ یا آپ اگر سرداری کے خواہش مند ہیں تو ہم آپ کو اپنا سردار تسلیم کیے دیتے ہیں۔ لیکن آپ ہمارے معبودوں کی برائی کا سلسلہ ختم کر دیجیے۔<sup>(۱)</sup>

(۳) بعض روایات میں وارد ہے کہ پیشکش میں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ اللہ کی عبادت کرتے رہیں؛ لیکن ہمارے معبودوں کو بھی کم از کم ہاتھ لگا دیا کریں، بوسہ دے دیا کریں۔<sup>(۲)</sup> انہوں نے یہی مختصر مطالبہ کیا، بہت لمبا چوڑا مطالبہ نہیں کیا۔

لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے ان مطالبوں اور صلح کی جو صورتیں پیش کی گئی تھیں، ان کے جواب میں سورہ کافرون نازل فرمائی، جس میں ان کو صاف الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ تم شرک میں مبتلا ہو، اور حضور ﷺ تو حید کے علم بردار ہیں۔ ایک موحد تو حید پر قائم رہتے ہوئے کفر و شرک کی کوئی شکل اختیار نہیں کر سکتا، جیسے تم مشرک رہتے ہوئے تو حید اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ تم اپنے دین پر مصر ہو، اڑے ہوئے ہو، اور میں اپنے دین پر مضبوطی سے جما ہوا ہوں۔ ہر ایک کے اپنے اپنے دین پر رہتے ہوئے، تم صلح کی جو شکل پیش کر رہے ہو وہ ناممکن ہے۔

## سورت کا ترجمہ:

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ (آپ کہہ دیجیے کہ اے کافرو! اے حق کا انکار کرنے والو!)  
لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ (میں نہیں عبادت کرتا اس چیز کی جس کی تم عبادت کرتے ہو)

(۱) تفسیر الطبری و تفسیر ابن عطیة [سورة الكافرون]۔

(۲) تفسیر عبدالراق الصنعانی و بحر العلوم للسمرقندی و تفسیر القرآن العزیز لابن أبی زَمَنِین،

سورة الکفرون۔

وَلَا أَنْتُمْ عِبِدُونَ مَا أَعْبُدُ (اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں) [تم بتوں کی عبادت کرتے ہو، جن کی میں عبادت نہیں کرتا۔ اور میں اللہ کی عبادت کرتا ہوں، تم اس کی عبادت نہیں کرتے]

وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ وَلَا أَنْتُمْ عِبِدُونَ مَا أَعْبُدُ. (اور آئندہ بھی میں اس چیز کی عبادت کرنے والا نہیں ہوں، جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو، جس کی میں عبادت کرتا ہوں)

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین)

## دونوں جملوں کا مطلب مختلف ہے:

وَلَا أَنْتُمْ...: یہاں ایک ہی طرح کے جملے دو مرتبہ آئے ہیں۔ یہ دو مرتبہ ایک ہی طرح کے جملے آئے تو دونوں کا الگ الگ مطلب ہے یا ایک ہی مطلب ہے؟

(۱) امام بخاریؒ نے کتاب التفسیر میں اس سورت کی تفسیر میں دونوں کا مفہوم الگ الگ نقل کیا ہے۔ <sup>(۱)</sup> پہلے جملے کا مطلب تو یہ ہے کہ اس وقت (زمانہ حال) میں ان چیزوں (تمہارے بتوں) کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور تم بھی اس ذات کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ پہلے دو جملوں کا تعلق زمانہ حال سے ہے۔ اور بعد میں آنے والے ان ہی دو جملوں کا تعلق زمانہ استقبال سے ہے۔ یعنی نہ آئندہ میں ان چیزوں کی عبادت کروں گا، جن کی تم عبادت کرتے ہو، اور نہ تم اس کی عبادت

(۱) صحیح البخاری، کتاب التفسیر [باب سورة قل يأتها الكفرون] وبحر العلوم للسمرقندي و تفسیر البغوي [سورة الكفرون].

## کرو گے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔

(۲) ان دو جملوں کا مطلب حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں یہ بیان کیا ہے:

پہلے دو جملوں (لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ) میں لفظ ”ما“ آیا ہے۔ اسی طرح دوسرے دو جملوں (وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ) میں بھی ”ما“ ہے، اس مجلس میں اہل علم موجود ہیں، وہ جانتے ہیں کہ لفظ ”ما“ عربی زبان میں اسم موصول بمعنی الذی (relative pronoun) کے آتا ہے۔ اور لفظ ”ما“ مصدری (masculine noun) معنی کے لیے بھی آتا ہے۔ اگر پہلی دو آیتوں میں لفظ ”ما“ سے اسم موصول بمعنی الذی مراد لیں، تو عبارت یوں ہوگی: لا اعبد الذی تعبدون (جن چیزوں کی تم عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کرتا) ولا انتم عابدون الذی اعبد (جس ذات کی میں عبادت کرتا ہوں، اس کی تم عبادت نہیں کرتے)

اور دوسرے دو جملوں میں لفظ ”ما“ مصدریہ ہے۔ ”ما“ مصدریہ جب کسی فعل (verb) پر داخل ہوتا ہے، تو اس فعل کو مصدر کے معنی میں کر دیتا ہے۔ تو اب عبارت یوں ہوگی: ولا أنا عابد عبادتکم (یعنی تمہارے جیسی عبادت میں نہیں کرتا اور میرے جیسی عبادت تم نہیں کرتے) (۱) یعنی ہمارا معبود بھی الگ ہے اور عبادت کا طریقہ بھی الگ ہے۔ اور تمہارا معبود بھی الگ ہے اور عبادت کا طریقہ بھی الگ ہے۔ دونوں میں فرق ہے، جب دونوں میں فرق ہے تو بھلا جو صلح تم پیش کر رہے ہو وہ کیسے ہو سکتی ہے؟

## تذکرہ:

(۳) بعض حضرات نے تیسرا مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ دونوں جگہ دونوں آیتیں ایک ہی معنی میں ہیں۔ اس صورت میں یہ اشکال ہوتا ہے کہ تکرار ہوگئی؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ تکرار ہر جگہ ناپسندیدہ نہیں ہے، کہیں پسندیدہ بھی ہوتی ہے۔ جیسے: فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا<sup>۱</sup>۔ (الشرح: ۵-۶) میں تکرار ہے، اور تکرار ہی کے معنی مراد ہیں۔ اسی طرح یہاں (سورہ کافرون میں) بھی تکرار ہے۔ چوں کہ ایسی باتیں ان کی طرف سے بار بار پیش آتی تھیں، اس لیے اس کا جواب دینے اور اس کی نفی کرنے کے لیے ایک جملہ کو مکرر کہا گیا کہ ایسی کوئی صلح ہمارے درمیان نہیں ہو سکتی اور اس کی توقع بھی مت رکھو۔ اس صورت میں دونوں جملے ایک ہی معنی میں ہوں گے اور دوسرا جملہ پہلے جملے کی تاکید کے لیے ہے۔<sup>(۱)</sup>

یہ تین مطلب بیان کیے گئے ہیں۔

## دین سے کیا مراد ہے.....؟؟

لکم دینکم ولی دین (تمہارے لیے تمہارا دین، اور میرے لیے میرا دین)  
دین کا کیا مطلب ہے؟

(۱) حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہؒ نے دین کا ترجمہ بدلہ سے کیا ہے۔<sup>(۲)</sup>

(۱) جامع البیان للطبری ومعالم التنزیل للبغوی والمحرر الوجیز لابن عطیة [سورة الكفرون]۔

(۲) بیان القرآن سورة الفاتحة ۱/۲۰ (مکتبہ رحمانیہ، لاہور) (نوٹ: الدین بمعنی بدلہ حضرت عبداللہ بن

عباسؓ، عبداللہ بن مسعود، مجاہد، مقاتل، سدی اور ابن جریر وغیرہ سے منقول ہے۔ امام طبری اور امام بغوی ==



جیسے آپ سورہ فاتحہ میں سن چکے ہیں: مُلْكِ يَوْمِ الدِّينِ (روز جزا کا مالک، بدلہ کے دن کا مالک) یعنی تم جو اعمال کرتے ہو، تمہیں اس کا بدلہ بھگتنا ہے۔ اور میں جو اعمال کرتا ہوں مجھے اس کا بدلہ ملنے والا ہے۔ ہر ایک کو اپنے اعمال کا بدلہ ملے گا۔

(۲) بعض حضرات نے دین کا ترجمہ دین ہی سے کیا ہے۔<sup>(۱)</sup> لیکن مراد دین کے اعمال ہیں۔ یعنی تمہارے ساتھ تمہارے اعمال، تمہیں ان اعمال کا بدلہ بھگتنا ہے۔ اور میرے ساتھ میرے اعمال، مجھے اپنے اعمال کا بدلہ ملنے والا ہے۔

### مجھ سے یہ امید نہ رکھنا:

یہاں یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ ان کو اپنے کفر والے دین پر باقی رہنے کی اجازت دی جا رہی ہے۔ نہیں! بلکہ ان کو بتلایا جا رہا ہے کہ میں موحد رہتے ہوئے تمہاری شرک والی باتوں کو قبول نہیں کر سکتا، اور تم اپنے شرک پر قائم رہتے ہوئے توحید کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو، تو اب ہر ایک کو اپنے اپنے اعمال کا بدلہ آخرت میں دیا جائے گا۔

بہر حال! اس سورت نے نازل ہو کر ان کی پیشکش کو ختم کر دیا اور ٹھکرا دیا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان صلح نہیں ہو سکتی ہے۔ ایک مؤمن ایمان اور توحید پر قائم رہتے ہوئے کبھی کفر و شرک کو اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لیے تم مجھ سے ایسی امید مت رکھو۔

= وغیرہ نے اسے ذکر کیا ہے۔

(۱) امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں کتاب التفسیر، باب سورۃ قل یا ایہا الکفرون کے تحت لکم دینکم میں دین سے کفر اور ولی دین میں دین سے اسلام مراد لیا ہے۔

## فضائل سورہ کافرون:

اس سورت کی فضیلت کے سلسلہ میں بھی چند روایات ہیں:

## فجر کی سنت میں:

(۱) حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: فجر کی سنتوں میں پڑھنے کے لیے دو سورتیں بہتر ہیں۔ سورہ اخلاص اور سورہ کافرون۔ (۱)

## تحفۃ الطواف میں:

(۲) صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے طواف کے بعد کی دو رکعتوں میں سورہ کافرون اور سورہ اخلاص کی تلاوت فرمائی۔ (۲)

## مغرب کی سنت میں:

(۳) تفسیر ابن کثیر میں بہت سارے صحابہؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو فجر اور مغرب کی سنتوں میں بہ کثرت یہ دونوں سورتیں پڑھتے ہوئے سنا۔ (۳)

[اس لیے فجر اور مغرب کی سنتوں میں ان سورتوں کے پڑھنے کا اہتمام ہونا چاہیے]

(۴) ترمذی شریف کی روایت ہے کہ حضرت فروہ بن نوفلؓ نے نبی کریم ﷺ

(۱) أخرجه ابن خزيمة في صحيحه (۲/۱۶۳) [۱۱۱۴] (ط: المكتب الإسلامي، بيروت) وابن

حبان في صحيحه (۵/۲۱۴) [۲۴۶۱] (ط: مؤسسة الرسالة، بيروت).

(۲) أخرجه مسلم برقم: ۱۲۱۸.

(۳) أخرجه الترمذي عن ابن مسعود برقم: ۴۳۱.

سے عرض کیا کہ مجھے کوئی دعا بتا دیجیے جو میں سوتے وقت پڑھا کروں۔ تو نبی کریم ﷺ نے سورہ کافرون پڑھنے کی تاکید فرمائی اور فرمایا کہ یہ شرک سے براءت ہے۔ (۱)

## ختمہ عالی سے خوش حالی تک:

(۵) تفسیر مظہری میں مسند ابو یعلیٰ کے حوالہ سے ایک روایت ہے کہ حضرت جبر بن مطعمؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جب تم سفر میں جاؤ تو تمہارے دوسرے ساتھیوں سے زیادہ خوش حال اور بامراد رہو؟ یعنی تمہاری مرادیں پوری ہوں اور تمہارا مال زیادہ ہو، اور تمہاری تجارت میں نفع زیادہ سے زیادہ ہو؟ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! بے شک میں ایسا چاہتا ہوں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: جب سفر شروع کرو، تو آخر قرآن کی یہ پانچ سورتیں: سورہ کافرون، سورہ نصر، سورہ اخلاص، سورہ فلق اور سورہ ناس پڑھا کرو۔ اور ہر سورت کو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے شروع کرو، اور اسی پر ختم کرو، تو حضرت جبرؓ فرماتے ہیں کہ پہلے میرا حال یہ تھا کہ سفر میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلہ میں بہت کم توشہ والا اور خستہ حال رہتا تھا۔ جب سے نبی کریم ﷺ کی اس تعلیم پر عمل کیا میں سب سے بہتر حال میں رہنے لگا۔ (۲) [چنانچہ بہت سے لوگوں نے اس کا تجربہ کیا تو واقعہ بڑا فائدہ دیکھا۔ جو تجارت پیشہ ہیں ان کے لیے بھی اور دوسرے لوگوں کے لیے بھی ایک اچھا وظیفہ ہے]

(۱) أخرجه الترمذي برقم: ۳۴۰۳ وأبو داود برقم: ۵۰۵۵.

(۲) مسند أبي يعلى الموصلي: ۱۳ / ۴۱۲ [۴۱۹] (ط: دار المأمون للتراث، دمشق) و تفسیر مظہری (اردو) سورہ کافرون.

## چوتھائی قرآن:

(۶) حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ سورہ کافرون چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔  
[جیسے قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ کو تہائی قرآن بتایا، اس کو چوتھائی قرآن بتایا] (۱)

## بچھو کے زہر کا تریاق:

(۷) حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کو حالت نماز میں بچھو نے کاٹ لیا، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے، تو آپ نے فرمایا: ”لَعَنَ اللَّهُ الْعُقْرَبَ لَا تَدْعُ مَصْلِيًّا وَلَا غَيْرَهُ۔“ (بچھو پر اللہ کی لعنت ہو، کہ وہ نمازی اور غیر نمازی کسی کو نہیں چھوڑتا) پھر آپ ﷺ نے پانی اور نمک منگوا لیا۔ اور نمک و پانی کو، کاٹنے کی جگہ لگاتے جاتے تھے اور قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ، قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھتے جاتے تھے۔ (۲)  
یہ اس سورت کے اہم فضائل ہیں، جو آپ کے سامنے پیش کیے گئے۔

## ایسی صلح نامہ ممکن:

اب نبی کریم ﷺ کے سامنے ان لوگوں کی طرف سے صلح کی جو شکل پیش کی گئی تھی اس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرما کر رجیکٹ (Reject) کر دیا۔ چنانچہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ باقاعدہ حرم میں تشریف لائے، کعبہ کے پاس قریش کے سردار موجود تھے، کعبہ کے پاس کھڑے رہ کر آپ ﷺ نے ان کے سامنے زور

(۱) أخرجه الترمذي برقم: ۲۸۹۳.

(۲) رواه الطبراني في المعجم الصغير [۸۳۰] (ط: المكتبة الاسلامي، بيروت).

سے یہ سورت تلاوت فرمائی۔<sup>(۱)</sup> گویا ان کی طرف سے صلح کی جو پیشکش کی گئی تھی، اس کا اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب دیا گیا۔ آئندہ بھی قیامت تک ایسی کوئی صلح ممکن نہیں ہے۔

## ایک اصول:

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سورت میں کفار کے ساتھ صلح نہ ہو سکنے کا بیان ہے، حالاں کہ قرآن میں دوسری جگہ ایک آیت: **وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا**۔ (الانفال: ۶۱) (یہ لوگ اگر صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی مائل ہو جائیے) بھی ہے گویا اس میں تو صلح کی اجازت دی گئی ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ دونوں آیتوں کا تعلق الگ الگ چیزوں سے ہے۔ ان لوگوں نے اُس موقع پر جس صلح کا مطالبہ کیا تھا اس میں ایک موحد کو اپنے توحید کے عقیدہ سے ہٹنا پڑتا ہے۔ اور شریعت نے جس چیز کی اجازت نہ دی ہو اور حرام قرار دیا ہو، ایسی چیز کو آپسی صلح میں تجویز کرنا درست نہیں ہے۔ یہ ایک اصول ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی اپنے ارشاد سے اس کو واضح فرمایا ہے: **الصلح جائز بین المسلمین إلا صلحاً حرم حلالاً أو أحل حراماً**۔ (مسلمانوں کے درمیان ہر صلح جائز ہے، مگر وہ صلح جو شریعت کی حلال کردہ کسی چیز کو حرام قرار دیتی ہو، یا شریعت کی حرام کردہ کسی چیز کو حلال قرار دیتی ہو؛ وہ جائز نہیں ہے)<sup>(۲)</sup> جیسے: غیر لوگ صلح کریں کہ گنپتی کے جلوس کا تم استقبال کرو، اور ہم تمہارے محرم کے جلوس کا استقبال کریں گے، یا میلاد کے جلوس کا استقبال کریں گے، تو یہ درست نہیں ہے۔ ویسے میلاد اور محرم کا جلوس ہی ہمارے یہاں درست نہیں ہے۔ یہ تو ان کے

(۱) تفسیر البغوي، سورة الكفرون.

(۲) أخرجه أبو داود و بقرم: ۳۵۹۴ والترمذي: ۱۳۹۲ وابن ماجه: ۲۳۵۳.

معبودوں کی تعظیم کرنا ہوا، شریعت کسی حال میں اس کی اجازت نہیں دیتی۔ یہ صلح شریعت کے نزدیک معتبر نہیں ہے۔

ہاں! اس کے علاوہ دیگر امور، جن کو شریعت نے مباح اور جائز رکھا ہے اگر ان کو آپس کی صلح سے ایک دوسرے منظور کریں، تو اس کی گنجائش ہے۔ جیسے نبی کریم ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، تو آپ ﷺ نے وہاں موجود قبائل یہود سے آپس میں صلح کی تھی کہ ہم آپس میں ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے اور اگر کوئی دشمن ہمارے خلاف چڑھ آئے گا، تو ہم مل کر اس کا مقابلہ کریں گے، تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

بہر حال! یہاں جس صلح کی اجازت نہیں دی گئی اور جس کو رجبیت کر دیا گیا وہ، وہ ہے جس کی وجہ سے شریعت کے کسی منع کیے ہوئے کام کا ارتکاب لازم آتا ہو، اس کو شریعت منظور نہیں رکھتی ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورہ کافرون

(قسط-۲)

(مؤرخہ: ۲۲/ ذی قعدۃ الحرام ۱۴۳۹ھ - مطابق: ۳۱/ اگست ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنُسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ  
بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرٍ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاَتٍ اَعْمَالِنَا وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرٍ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاَتٍ  
اَعْمَالِنَا مَنْ یَّہْدِہٖ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُضِلِلْہٗ فَلَا هَادِیَ لَہٗ وَنَشْہَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ  
وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْہَدُ اَنْ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہٗ اِلَی  
کَافَّةِ النَّاسِ بِشَیْرٍ اَوْ نَذِیْرٍ اَوْ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرِّ اَجَامُنِیْرًا اَصْلٰی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ  
عَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا اَمَّا بَعْدُ .  
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ . بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ .

قُلْ یٰۤاَیُّہَا الْکٰفِرُوْنَ ﴿۱﴾ لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲﴾ وَلَا اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ ﴿۳﴾ وَلَا  
اَنَا عٰبِدُ مَا عٰبَدْتُمْ ﴿۴﴾ وَلَا اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ ﴿۵﴾ لَكُمْ دِیْنُکُمْ وَلِی دِیْنِ ﴿۶﴾

## گزشتہ سے پیوستہ:

یہ سورہ کافرون ہے، گزشتہ مجلس میں بتلادیا گیا تھا کہ یہ کس پس منظر میں نازل ہوئی  
ہے؟ مکہ کے مشرکین کے کچھ سردار نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، اور انہوں نے حضور ﷺ  
کے سامنے صلح کا ایک فارمولہ پیش کیا۔ اور حضور ﷺ سے کہا کہ آپ کو اور آپ کے ماننے

والے لوگوں کو جو تکالیف واذیتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، اور یہاں ہمارے اور آپ کے درمیان ایک کشمکش رہتی ہے، اگر آپ ہماری اس پیشکش کو قبول کر لیں تو یہ سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا، اور ہم مل جل کر رہیں گے۔ اور انہوں نے صلح کی پیشکش اس طرح کی کہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی پوجا اور عبادت کریں، اور ایک سال آپ ہمارے معبود کی پوجا اور عبادت کریں۔ اس پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا۔<sup>(۱)</sup> اور ان لوگوں کو بتلادیا کہ بھائی! مؤمنین اور مشرکین کے درمیان صلح کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک موحداپنی توحید پر قائم رہتے ہوئے کسی بھی شرکیہ عمل کو انجام نہیں دے سکتا، اور ایک مشرک اپنے شرک پر باقی رہتے ہوئے توحید کو ماننے والا نہیں بن سکتا۔

### ترجمہ و مطلب:

قُلْ يَا كُفْرًاؤْنَ (اے نبی! آپ کہہ دیجیے کہ اے کافرو! اے حق کا انکار کرنے والو)

لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (میں ان چیزوں کی عبادت نہیں کرتا، جن کی تم عبادت کرتے ہو)

وَلَا اَنْتُمْ عِبِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ (اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں) یعنی تم بتوں کی عبادت کرتے ہو، میں ان کی عبادت نہیں کرتا۔ اور میں اللہ کی عبادت کرتا ہوں، تم اس کی عبادت نہیں کرتے۔

وَلَا اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ وَلَا اَنْتُمْ عِبِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ (اور نہ (آئندہ) میں اس

(۱) تفسیر الطبری و تفسیر ابن ابی حاتم، سورۃ الکفرؤن۔



چیز کی عبادت کرنے والا ہوں، جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم (آئندہ) اس کی عبادت کرنے والے ہو، جس کی میں عبادت کرتا ہوں) چوں کہ یہ دو کلمے مکرر آئے ہیں، تو پہلی صورت میں اس سے زمانہ حال مراد لیا گیا اور دوسرے دو کلموں میں زمانہ مستقبل مراد لیا گیا ہے۔

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (تمہارے لیے تمہارا دین ہے، اور میرے لیے میرا دین ہے)

گزر چکا کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ سورت نازل فرمائی، تو نبی کریم ﷺ نے کعبہ کے پاس جا کر مشرکین کے سامنے کھڑے ہو کر بلند آواز سے سنائی؛ تاکہ ان کو پتا چل جائے۔<sup>(۱)</sup>

## پہلا سبق؛ یہ اللہ تعالیٰ کو ماننا نہیں ہے:

اس سورت سے ہمیں دو سبق معلوم ہوتے ہیں:

(۱) ایک سبق تو یہ ہے کہ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ۔ (تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں، یعنی اللہ کی۔ اور آئندہ بھی نہیں کرو گے) مشرکین مکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے وجود کا انکار نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کو تسلیم کرتے تھے، اور وہ یہ بھی مانتے تھے کہ ساری کائنات یعنی آسمانوں، زمین، سورج، چاند، اسی طرح انسان، جنات، جانور کو اللہ ہی نے پیدا کیا۔ قرآن پاک میں بھی اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کا تذکرہ کیا ہے: وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ۔ (العنکبوت: ۶۱) (اے نبی! اگر آپ ان سے یہ سوال کریں کہ کون سی ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا؟ اور سورج اور چاند کو گردش میں لگا دیا؟ تمہاری ڈیوٹی اور خدمت میں لگا دیا، تمہارے لیے مسخر کر دیا؟) تو باری تعالیٰ

فرماتے ہیں: **يَقُولُ اللَّهُ** (وہ لوگ ضرور بالضرور یہ جواب دیں گے: یہ سب کرنے والا اللہ ہے۔ وہ لوگ اللہ کو مانتے تھے، اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ بیت اللہ کا طواف بھی کرتے تھے، کوئی کام شروع کرنا ہوتا تو **باسمک اللہم** سے شروع کرتے، کوئی تحریر لکھنی ہوتی، تو اس کے شروع میں **باسمک اللہم** (اے اللہ! تیرے نام سے شروع کرتا ہوں) حج کرتے اور اس میں لبیک پڑھتے تھے، **لبیک اللہم لبیک، لبیک لا شریک لک** پھر لا شریک لک کے بعد **لا شریکا ہولک**۔<sup>(۱)</sup> البتہ ایک شریک ہے، اتنا اضافہ کر دیا۔ عبادت بھی اسی طرح کرتے تھے۔

اس کے باوجود کہا جا رہا ہے کہ **وَلَا أَنْتُمْ عِبِدُونَ مَا أَعْبُدُ** (میں جس ذات کی عبادت کرتا ہوں، تم اس کی عبادت نہیں کرتے) اور آئندہ بھی تم شرک پر باقی رہتے ہوئے اس کی عبادت نہیں کرو گے۔ تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں اللہ کی عبادت کا انکار کیوں کیا گیا؟ حالاں کہ وہ اللہ کے وجود کو بھی مانتے تھے، اور مذکورہ بالا امور بھی انجام دیتے تھے، بات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ساری کائنات کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بعض یا سارے اختیارات ان دیوی دیوتاؤں کو دے دیے ہیں۔ زمین، آسمان، چاند، سورج، انسان اور جنات ان سب کو پیدا کرنے کے بعد اب اللہ تبارک و تعالیٰ ویسے ہی بیٹھ گئے ہیں۔ اب بقیہ تمام امور یعنی روزی دینا، کسی بیمار کو شفا دینا اور دیگر حاجات پوری کرنا یہ ان دیوی دیوتاؤں کا کام ہے، گویا ان کو وہ لوگ اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے تھے اور حاجت روا اور مشکل کشا مانتے

تھے۔ جیسے ہمارے ہاں غیر مسلم، ہنود سے پوچھا جائے کہ علم کون دیتا ہے؟ تو وہ جواب دیں گے: سرسوتی دیوی (सरसुती देवी) علمی اداروں میں اس کی تصویر یا مورتی مستقل ٹیبل پر رکھی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک اسی سے علم ملتا ہے۔ اگر پوچھا جائے کہ دولت کون دیتا ہے؟ تو جواب دیں گے کہ لکشمی دیوی (लक्ष्मी देवी) مطلب یہ ہے کہ مختلف دیوی اور دیوتاؤں کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہے۔ اسی طرح مکہ کے مشرکین کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ گویا اللہ تعالیٰ کو پیدا کرنے والا ماننے کے بعد دیگر اختیارات ان شرکاء کے حوالے کر دیے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ ان معبودانِ باطلہ کو شریک ٹھہرانے کے ساتھ اللہ کو مان رہے ہیں، اس سلسلہ میں قرآن کہتا ہے کہ یہ اللہ کو ماننا نہیں ہے۔ سیدھی بات !!! وَلَا أَنتُمْ عِبُدُونَ مَا عَابَدُوا (میں جس کی عبادت کرتا ہوں، تم اس کی عبادت نہیں کرتے)

اللہ کو ماننا تو اُسی وقت کہا جائے گا جب اللہ کو اس کی تمام صفات کے ساتھ مانا جائے۔ اللہ کی صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ زندگی دینے والا اس کے سوا کوئی نہیں۔ موت دینے والا وہی ہے، اور کوئی نہیں۔ روزی دینے والا وہی ہے، اور کوئی نہیں۔ بیماری اور تندرستی دینے والا وہی ہے، اور کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی تمام صفات میں یکتا ہیں، کوئی ان صفات میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ اگر تم اللہ کی ان صفات میں کسی کو شریک مانتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اللہ کو نہیں مانتے ہو۔ تمہارا اللہ کو ماننا معتبر نہیں ہے۔ معتبر نہ ہونے کی وجہ سے ہی یہ جملہ وَلَا أَنتُمْ عِبُدُونَ مَا عَابَدُوا استعمال کیا گیا۔ میں جس کی عبادت کرتا ہوں، تم اس کی عبادت نہیں کرتے۔

توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ ہر چیز میں اللہ تنہا ہے۔ کسی بھی چیز میں کوئی دیوی دیوتا اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ جیسے آسمانوں کا پیدا کرنے والا، زمین کا پیدا

کرنے والا، سورج اور چاند کا پیدا کرنے والا، انسان اور جنات کو پیدا کرنے والا، جانوروں کو پیدا کرنے والا وہی اکیلا ہے۔ اور سب کی حاجتوں کو پورا کرنے والا بھی وہی اکیلا ہے، سب کو روزی دینے والا بھی وہی اکیلا ہے، سب کو تندرستی اور شفا دینے والا بھی وہی اکیلا ہے، سب کا مشکل کشا بھی وہی اکیلا ہے۔ اگر آپ اللہ کے علاوہ کسی اور کو مشکل کشایا حاجت روا، مقار کل سمجھتے ہیں تو اس کا مطلب ہوا کہ آپ نے اللہ کا انکار کیا۔ یہ ایک خاص نکتہ ہے، جو اس سورت میں بتلایا گیا ہے۔

## یہ بھی شرک ہے:

اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ ہمارے مسلمانوں میں بھی بعض لوگ اپنی جہالت اور نادانی اور اسلامی تعلیمات سے دوری کی وجہ سے اللہ کے بعض نیک بندوں، اولیاء و انبیاء پیغمبروں کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ ہماری حاجات کو پورا کرنے والے ہیں۔ اور بہت سے لوگ اگر بچہ بیمار ہو، تو کسی بزرگ کے مزار پر جا کر ان سے سوال کرتے ہیں کہ ہمارا بیٹا بیمار ہے، آپ ان کو تندرست کر دیجیے۔ بہت سے بے اولاد، بزرگوں کے مزار پر جا کر سوال کرتے ہیں کہ داتا! ہمیں بیٹا دے دو، بیٹی دے دو۔ اس طرح اپنی حاجات ان سے مانگنا گویا اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنا ہے۔ یہ اللہ کا انکار ہے۔ جس طرح مشرکین مکہ شرک میں مبتلا تھے، اسی طرح یہ لوگ بھی شرک میں مبتلا ہیں۔ کوئی بڑے سے بڑا رسول اور پیغمبر ہو، اس کا اپنا ایک مقام ہے، اس کا ادب و احترام سر آنکھوں پر!!! لیکن وہ صفات اور وہ کمالات جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں، ان کو اس کے لیے ثابت کرنا کفر و شرک ہے، اور توحید کے خلاف ہے۔

## حضور ﷺ کی تنبیہ:

بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ مرض الوفا میں چادر اوڑھے ہوئے تھے، گھٹن ہوتی تو سر سے چادر ہٹا دیتے تھے، اور آپ ﷺ کی زبان مبارک پر یہ کلمہ تھا: **لعن الله اليهود والنصارى اتخذوا قبور انبيائهم مساجد؛ يحذر ماصنعوا**۔ (اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنادیا۔ آپ ﷺ اپنی امت کو اس فعل سے بچانا چاہتے تھے) <sup>(۱)</sup> اس لیے تنبیہ کے طور پر فرمایا۔ جب آپ ﷺ اپنے متعلق یہ فرماتے ہیں تو چہ جائیکہ کسی ولی کی قبر پر سجدہ کیا جائے اور اس سے حاجتیں مانگی جائیں اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔

## اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف:

کئی سال پہلے کا قصہ ہے: ایک مرتبہ ہم دو چار ساتھی خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر دہلی، مہرولی گئے۔ جو ہمارے سلسلہ کے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بڑے خلیفہ ہیں۔ وہاں دیکھا کہ ایک آدمی سجدہ میں گرا ہوا ہے۔ اس کو روکا کہ بھائی! یہ پیشانی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے سامنے جھکنے کے لیے بنائی ہے، لیکن وہ حجت کرنے لگا۔ بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ہم کو تو جو کچھ بھی ملا ہے اسی دروازے سے ملا ہے، یہ اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ ہر مؤمن کو چاہیے کہ ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو باز رکھے۔

(۱) آخر جہ البخاری برقم: ۱۳۳۰۔

## مگر مؤمنوں پر کشادہ ہیں راہیں:

اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت بھی اسی انداز سے کرنی چاہیے، ایک کافر اپنے دیوی دیوتا کے سامنے سجدہ کرتا ہے، اس کو تو ہم کہتے ہیں کہ وہ کافر ہو گیا۔ اور ہمارا کوئی آدمی بزرگوں کی قبروں کے سامنے سجدہ کرے تو اس کا ایمان سلامت رہتا ہے!!! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ خواجہ الطاف حسین حالیؒ نے مسدس میں اسی مضمون کو بہت اچھے انداز سے پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

کرے غیر گربت کی پوجا تو کافر	جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر <sup>(۱)</sup>	کو اکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مؤمنوں پر کشادہ ہیں راہیں	پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں	اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں	شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے	نہ اسلام بگڑے نہ ایمان حباۓ

حقیقت تو یہ ہے کہ جو معاملہ مشرکین اپنے دیوتاؤں اور بتوں کے ساتھ کرتے تھے

آج کا مسلمان اپنی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے بزرگوں کے مزارات پر وہی معاملہ کرتا ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

## چوکنار ہے!!!

دوسری بات یہ ہے کہ آج ہم اس ملک میں، جس ماحول میں رہتے ہیں، اور اس

(۱) بعض نسخوں میں یہ کلمات ہیں۔ کہے آگ کو قبلہ اپنا تو کافر

وقت اس ملک پر جو لوگ برسر اقتدار ہیں، وہ سب کفر اور شرک میں مبتلا ہیں۔ اور اب رفتہ رفتہ وہ یہاں کے تعلیمی نظام کو مشرکانہ بنانا چاہتے ہیں، اور اسی لیے اسکولوں میں باقاعدہ سرسوتی دیوی (सरसुती देवी) کی مورتی رکھی جاتی ہے، اور آنے والے ہر بچہ کو اس بات کا پابند کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے، جس کو سرسوتی وندنا (सरसुती वंदना) کہتے ہیں۔ یوگا بھی ان کے ہاں عبادت ہی کی ایک قسم ہے۔ چنانچہ یہ لوگ ان مختلف شکلوں کو اس وقت بتدریج غیر مسلم اسکولوں میں، عصری تعلیم گاہوں میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ ہمارا ملک سیکولر ہے، مذہبی نہیں ہے۔ تو یہ تعلیم گاہیں مذہبی خیالات سے دور اور پاک ہونی چاہیے، ان میں ان چیزوں کی طرف میلان نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن یہ سب کیا جارہا ہے۔ ایسے موقع پر ہم سب مسلمانوں کو بہت زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، کہیں نصاب میں ایسی چیزیں جن سے ہمارے بچوں کے عقیدے خراب ہوتے ہوں، یا اسکول میں بچوں سے ایسے اعمال کروائے جائیں، جن سے۔ نعوذ باللہ۔ ایمان سے محرومی کا اندیشہ ہو، تو ان سے چوکنا رہ کر ہمیں اس کو ختم کرنے، دور کرنے کی اجتماعی طور پر سعی کرنی چاہیے۔

## شرکیہ عمل کے لیے ہم تیار نہیں، مفکر اسلام:

آج سے کئی سال پہلے یوپی کی حکومت نے راجیو گاندھی کے دور حکومت میں باقاعدہ سرکلر جاری کیا تھا کہ تمام اسکولوں میں آنے والے بچے اسکول میں آتے ہوئے پہلے سرسوتی وندنا (सरसुती वंदना) کریں گے، یعنی سرسوتی دیوی کو ہاتھ جوڑیں گے۔ تو اس زمانہ میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہ نے راجیو گاندھی کے پاس جا کر پوری قوت سے بات کی کہ ہم اپنی اولاد کو اسکولوں میں بھیجنا بند کر دیں گے۔ یہ تو

کھلا شرک ہے، ہم اپنی اولاد کے لیے اس کو برداشت نہیں کریں گے۔ ہم اس ملک میں اپنی پوری توحید اور اپنے تمام ایمانی اعمال کے ساتھ رہیں گے، ہم کسی بھی شرکیہ عمل کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ اُسی زمانہ میں حضرت نے اپنے بیانات میں یہ مضمون جگہ جگہ بیان فرمایا:

أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ النَّبِيُّ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي. (البقرة: ۱۳۳) حضرت یعقوب علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹوں کو جمع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے دنیا سے جانے کے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ قَالُوا نَعْبُدُ إِلَهَكَ وَالِاهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَهًا وَاحِدًا. (البقرة: ۱۳۳) (جواب میں ان بچوں نے عرض کیا کہ ہم آپ کے معبود کی اور آپ کے باپ دادوں حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق کے معبود اسی ایک اللہ کی عبادت کریں گے۔ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (البقرة: ۱۳۳) (ہم اسی کے سامنے سر جھکائیں گے) تو ہمیں اس ملک میں ایسی چیزوں سے بہت زیادہ چوکنار رہنے کی ضرورت ہے۔ اور اب تو باقاعدہ انہوں نے ان کی ایک نئی تعلیمی پالیسی (Policy) وضع کی ہے اور وہ بالکل کفریہ اور شرکیہ ہے۔ ایسے موقع پر تمام مسلمانوں کو متحد ہو کر اپنے ایمان کی حفاظت کی کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

## دوسرا سبق، شریعت کے حکم بدلے نہیں جاسکتے:

دوسرا سبق اس میں یہ ہے کہ ان لوگوں کے صلح کی پیشکش کرنے پر جواب میں کہا گیا تھا کہ تم اپنے کفر پر رہتے ہوئے اور ہم اپنے ایمان پر رہتے ہوئے مذہب کے معاملہ میں، آپس میں متحد نہیں ہو سکتے۔ ایسی ایکتا اور ایسے اتحاد کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ ایسی صلح جس کے نتیجے میں ہمیں اپنے مذہبی اصول کو قربان کرنا پڑے، اپنے ایمان سے ہاتھ دھونا



پڑے شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ اور ویسے بھی حضور ﷺ نے صلح کے سلسلہ میں ایک اصول بتا دیا ہے کہ **الصلح جائز بین المسلمین إلا صلحاً حرم حلالاً أو أحل حراماً**۔ (مسلمانوں کے درمیان ہر صلح جائز ہے، مگر وہ صلح جو شریعت کی حلال کردہ کسی چیز کو حرام قرار دیتی ہو، یا شریعت کی حرام کردہ کسی چیز کو حلال قرار دیتی ہو؛ وہ جائز نہیں ہے) <sup>(۱)</sup> گویا شریعت کے حکم بدلے نہیں جاسکتے۔

### لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق:

سورہ فاتحہ کی تفسیر میں وضاحت سے گزر چکا کہ **لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق**۔ <sup>(۲)</sup> اللہ تعالیٰ نے بہت سے لوگوں کی اطاعت کا حکم دیا ہے، اولاد کو ماں باپ کی اطاعت کا، بیوی کو شوہر کی اطاعت کا؛ لیکن ان کے سلسلہ میں بھی تاکید ہے کہ ماں باپ اگر کوئی ایسا حکم دیتے ہیں جس کی وجہ سے شرک لازم آتا ہو تو قرآن نے کہا: **وَإِنْ جَاهَدَكَ عَلَى أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبُهَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا**۔ (لقمان: ۱۵) ان کی بات مت ماننا؛ البتہ ماں باپ ہیں، دنیوی زندگی میں ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنا؛ لیکن ان کی بات پر عمل کرتے ہوئے شرک اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔ کسی حال میں بھی ایسی کوئی شکل جس سے۔ نعوذ باللہ۔ شرک لازم آتا ہو، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی، یا شریعت نے جس کو حرام قرار دیا ہو ایسا کام انجام نہیں دیا جاسکتا۔ کوئی بھی صلح ایسی ہو

(۱) أخرجه أبو داود ودبرقم: ۳۵۹۴ والترمذي: ۱۳۹۲ وابن ماجه: ۲۳۵۳.

(۲) أخرجه الطبراني بهذا اللفظ في الأوسط برقم: ۳۹۱۷ (ط: دار الحرمين، القاهرة) وأخرجه

أحمد في مسنده برقم: ۲۰۶۵۳ و ۲۰۶۵۶ و لفظه: ”لا طاعة في معصية الله“.

جو شریعت کے کسی صریح حکم کو بدلنے والی ہو اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی ہے۔ ہمارے بڑوں نے اس معاملہ میں۔ ماشاء اللہ۔ بہت ہمت سے کام لیا ہے۔

## کاش میری سوحانیں ہوتیں

### ایک دل سوز واقعہ:

حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ کی ماتحتی میں ایک لشکر بھیجا گیا تھا، رومیوں نے اس لشکری دستہ کو قید کر لیا، اور قید میں رومی بادشاہ نے حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ کو پہلے تو لالچ دلایا کہ اگر تم مذہب اسلام چھوڑ دو، تو میں اپنی بیٹی کا نکاح تم سے کرادوں، اور اپنی آدھی سلطنت تم کو دے دوں۔ لیکن یہ تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے کہا: آدھی کیا؟ تیری پوری سلطنت کیا؟ پوری دنیا کی سلطنت بھی دے، تب بھی میں اسلام اور ایمان چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس نے دیکھا کہ لالچ کام نہیں کرتا، تو دھمکی دی کہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ اور باقاعدہ عملی طور پر ایک دیگ آگ پر چڑھائی، اس میں تیل ڈالا، جب تیل خوب کھولنے لگا، تو قیدیوں میں سے ایک قیدی کو ان کے دیکھتے ہوئے اس میں ڈالا، اندر پڑتے ہی اس کے سب اعضاء الگ ہو گئے، اور وہ جل گیا۔ کہا کہ دیکھو! تمہارے ساتھ بھی یہ معاملہ ہوگا۔ انہوں نے کہا: تم جو چاہو، کرو۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کو پکڑو، اور اندر ڈالو۔ جب ان کو ڈالنے کے لیے پکڑا تو ان کی آنکھوں سے آنسو نکلے، بادشاہ سمجھا کہ شاید نرم پڑ گئے ہیں، تو اس نے بلا کر پوچھا: کیا بات ہے؟ آنکھوں میں آنسو آگئے!!! کچھ ارادہ بدلا ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں! آنکھوں میں آنسو تو اس لیے آئے ہیں کہ مجھے افسوس ہے کہ آج اللہ کے راستے میں قربان کرنے کے لیے میرے پاس ایک ہی

جان ہے۔ اگر میرے ہر بال کے برابر میرے پاس جانیں ہوتیں، تو میں ان ساری جانوں کو اللہ کے راستے میں قربان کر دیتا۔ بادشاہ سمجھ گیا کہ یہ اپنی بات سے نہیں ہٹیں گے۔ تو کہا: اچھا! ایک کام کرو، میری پیشانی کو بوسہ دو تو چھوڑ دوں۔ انہوں نے کہا: مجھ اکیلے کو چھوڑو گے یا میرے ساتھیوں کو بھی؟ اس نے کہا کہ ساتھیوں کو بھی۔ تو حضرت عبداللہ بن حذافہ نے کہا: ٹھیک ہے۔ کافر بادشاہ کی پیشانی کو بوسہ دینا اس قدر ناجائز نہیں، بلکہ اس کا ایک درجہ ہے۔ تمام احکام کی شریعت میں کیٹگیڑی رکھی گئی ہے، تو انہوں نے سوچا کہ اس سے سب ساتھیوں کی جان بچ جاتی ہے، اس لیے مان لیا۔ دیکھو! جان کی دھمکی دی گئی تھی، تب بھی وہ نہیں مانے، لیکن ساتھیوں کی جان بچانے کے لیے تسلیم کیا۔ بوسہ دیا، اور خود کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی جان بچا کر لے آئے۔ مدینہ منورہ واقعہ کی خبر پہنچ چکی تھی۔ حضرت عمرؓ کا دور خلافت تھا، حضرت عمرؓ نے اعلان کیا، سب کو حکم دیا کہ مدینہ سے باہر جا کر ان کا استقبال کریں، اور ان کی پیشانی کو سب بوسہ دیں، اور سب سے پہلے میں بوسہ دوں گا۔<sup>(۱)</sup>

## اس کی اجازت ہے:

بہر حال! یہ دوسرا سبق ہے کہ ایمان کے معاملہ میں کسی کے ساتھ صلح نہیں کی جاسکتی، ایسی صلح کی شریعت اجازت نہیں دیتی، جس میں ہمیں اپنے مذہب کے اصولوں کو چھوڑنا پڑے، اس کے باب میں ہمیں رعایت کرنی پڑے۔ ہاں! اس کو چھوڑے بغیر اگر کوئی صلح

(۱) معرفة الصحابة لأبي نعيم الأصبهاني: ۳/ ۱۲۱۵ [۲۰۶۷] (ط: دار الوطن، الرياض) وشعب الإيمان للبيهقي: ۳/ ۱۷۹ [۱۵۲۲] (ط: مكتبة الرشد، الرياض) والاستيعاب في معرفة الأصحاب لابن عبد البر: ۳/ ۸۹۰ [۱۵۰۸] (ط: دار الجليل، بيروت) وتاريخ دمشق لابن عساكر: ۲۷/ ۳۵۷-۳۶۰ [۳۲۳۷] (ط: دار الفكر للطباعة والنشر)

کی جاسکتی ہے تو اس کی گنجائش ہے۔ وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا. (الأنفال: ۶۱) (اگر غیر مسلم صلح کے لیے مائل ہوتے ہیں تو اے نبی! آپ بھی مائل ہو جائیں) تو ایسی صلح جس میں دین کے اصولوں کو قربان نہ کرنا پڑتا ہو تو اس کی اجازت ہے۔ جیسے ہم مل جل کر ایک مشترکہ دشمن کا مقابلہ کریں گے، مل جل کر اپنے ملک کو ترقی دینے کے لیے تجارت وغیرہ میں ساتھ رہ کر کام کریں گے، تو اس کی اجازت ہے۔ شریعت اس سے منع نہیں کرتی۔

یہ دو سبق اس سورت سے ہمیں دیے گئے ہیں، ان کا ہمیں خاص اہتمام ہونا چاہیے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورہ نصر

(مورخہ ۱ ذی قعدہ ۱۳۳۹ مطابق ۱۵ جولائی ۲۰۱۸ء، شب یکشنبہ)

(قسط-۱)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِيْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ  
بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاَتِ اَعْمَالِنَا وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاَتِ  
اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُّضِلِّهٖ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ  
وَخَدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ اَرْسَلَهُ اِلَى  
كَافَّةِ النَّاسِ بِشِيْرٍ اَوْ نَذِيْرٍ اَوْ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهِ وَسِرًّا جَامِيْعًا صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَ  
عَلٰى اٰلِهِ وَاصْحَابِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا اَكْثِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ.  
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ﴿۱﴾ وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ﴿۲﴾  
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾

### ترجمہ سورت:

یہ سورہ نصر ہے، تین آیتیں ہیں:

اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ (جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے)

وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ فوج

در فوج، گروہ در گروہ اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں)

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (تو اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کیجیے اور اللہ سے مغفرت چاہیے)

إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا (بے شک وہ بہت معاف کرنے والا ہے)  
اس سورت کے متعلق سب کا اتفاق ہے کہ قرآن پاک میں سب سے آخر میں مکمل طور پر نازل ہونے والی یہی سورہ نصر ہے۔<sup>(۱)</sup> اس کے بعد کچھ آیتیں اور کچھ سورتوں کے حصے تو نازل ہوئے؛ لیکن مکمل سورت نازل نہیں ہوئی۔

## فتح مکہ سے قبل یا اس کے بعد؟

البتہ اس سلسلے میں حضرات مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ یہ سورت مکہ مکرمہ فتح ہونے سے پہلے نازل ہوئی یا فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی؟

(۱) صاحب روح المعانی نے البحر المحیط سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں بتلایا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب فتح خیبر کے بعد مدینہ منورہ لوٹ رہے تھے، تو راستہ میں یہ نازل ہوئی۔ فتح خیبر ماہ محرم ۷ھ میں ہوئی، اس کے بعد دو سال نبی کریم ﷺ دنیا میں قیام پذیر رہے؛ لیکن اس کے علاوہ اور کوئی دوسری سورت مکمل نازل نہیں ہوئی۔<sup>(۲)</sup>

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت یہ ہے کہ یہ سورت حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے دوران منیٰ میں نبی کریم ﷺ کے قیام کے وقت نازل ہوئی۔<sup>(۳)</sup>

(۱) صحیح مسلم: ۳۰۲۴ والسنن الکبریٰ للنسائی: ۳۴۹/۱۰ (ط: مؤسسة الرسالة، لبنان)

(۲) البحر المحیط لأبی حیان الأندلسی وروح المعانی للآلوسی، سورۃ نصر.

(۳) البحر المحیط، سورۃ نصر.

اور اس کے بعد سورہ بقرہ کی آیت: اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّسَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا۔ (البائدہ: ۳) نازل ہوئی۔ اور ان دنوں یعنی سورہ نصر اور اس آیت کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ ۸۰ دن دنیا میں رہے۔

اس کے بعد آیت کلامہ نازل ہوئی، اس وقت نبی کریم ﷺ کی عمر شریف کے ۳۵ دن باقی رہ گئے تھے، اور سب سے اخیر میں سورہ بقرہ کی آیت وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ۔ (البقرہ: ۲۸۱) نازل ہوئی۔ (۱) اس وقت نبی کریم ﷺ کی عمر شریف کے ۲۱ دن اور مقاتل کی روایت کے مطابق صرف ۷ دن باقی رہ گئے تھے۔ بہر حال! فتح مکہ سے پہلے اور فتح مکہ کے بعد، دونوں طرح نازل ہونے کی باتیں ہیں۔

## آپ ﷺ کے معمول میں تبدیلی:

یہاں لفظ فتح سے مکہ مکرمہ کی فتح مراد ہے۔ اس پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔

(۱) بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ اس سورت کے نازل

ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جب بھی کوئی نماز پڑھتے، تو آپ یہ دعا کرتے: سبحانک ربنا وبحمدک اللہم اغفر لی۔ (۲)

(۲) حضرت عائشہؓ کی روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نازل ہونے

کے بعد نبی کریم ﷺ اٹھتے بیٹھتے، جاتے آتے سبحان اللہ وبحمدہ أستغفر اللہ وأتوب إليه۔ پڑھتے اور یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے، اور دلیل کے طور

(۱) أخرجه البخاري برقم: ۴۵۴۴۔

(۲) أخرجه البخاري برقم: ۴۹۶۷۔

آپ ﷺ سورہ نصر کی تلاوت فرماتے تھے۔ (۱)

(۳) تفسیر قرطبی میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ عبادات میں بہت زیادہ مجاہدہ فرمانے لگے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے پاؤں پرورم آگیا۔ (۲)

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ (جب اللہ تعالیٰ کی مدد اور فتح آجائے)

## دعوت پر مخالفت و اذیت:

یہاں فتح سے فتح مکہ مراد ہے۔ نبی کریم ﷺ کی ولادت شریفہ مکہ مکرمہ میں ہوئی، اور جب آپ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ کے ۴۰ سال پورے کیے، اس وقت نبی کریم ﷺ پر وحی نازل ہوئی، اور اس کے بعد ایک وقت آیا جب یہ آیت نازل ہوئی: **انذر عشیرتک الاقربین۔ (الشعراء: ۲۱۴) ورهطک منهم المخلصین۔** اس وقت نبی کریم ﷺ نے قبیلہ قریش کی شاخوں اور اپنے خاندان کے بعض افراد کو نام لے لے کر کوہ صفا کے پاس جمع کیا، اور اللہ کے حکم کے مطابق اس کے عذاب سے ڈرایا۔ جیسا کہ سورہ لہب کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ (قدم تخریجہ ص: ۱۰۶) اس طرح آپ ﷺ لوگوں کو ایمان و اسلام کی دعوت دیتے رہے؛ لیکن مکہ والوں نے اس دعوت پر ایمان لانے کے بجائے آپ ﷺ کی مخالفت کی، اور صرف مخالفت ہی نہیں؛ بلکہ آپ ﷺ کو اور آپ پر ایمان لانے والے لوگوں کو بہت تکلیفیں پہنچائیں، اور ظلم و ستم کی کوئی شکل ایسی نہیں تھی، جو انھوں نے حضور ﷺ

(۱) أخرجه مسلم برقم: ۴۸۴.

(۲) الجامع لأحكام القرآن للقرطبي، سورة نصر.



اور ایمان والوں کے ساتھ اختیار نہ کی ہو۔ سخت گرمی کے زمانے میں، پتی ہوئی ریت پر ان کو لٹا دیا جاتا تھا، اور اوپر پتھر کی سِل رکھ دی جاتی تھی، اسی طرح انگاروں پر لٹایا جاتا تھا۔ حضرت خبابؓ کا واقعہ آپ نے حکایات صحابہ میں سنا ہوگا کہ ان کی چربی کے پکھلنے سے انگارے بجھتے تھے۔ ایسی ایسی تکلیفیں پہنچائی گئی تھیں۔ کوئی تکلیف ایسی نہیں تھی جو نہ پہنچائی ہو۔

## میری مدد کرو.....:

وحی کے نزول کے بعد ۱۳ سال نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں گزارے؛ لیکن مکہ والوں کی بڑی تعداد وہ تھی جو ایمان نہیں لائی تھی۔ اور حضور ﷺ کو جب ان کی طرف سے مایوسی ہوئی، تو آپ ﷺ حج کے موقع پر آنے والے عرب کے دیگر قبائل کے پاس جا کر ان کو ایمان و اسلام کی دعوت دیتے تھے، اور آپ ﷺ ان سے یہ درخواست بھی کرتے تھے کہ آپ مجھے اپنے علاقہ میں لے جاؤ، اور مجھے اللہ کے حکم کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا موقع دو، میری مدد کرو؛ لیکن قریش ایک ایسا قبیلہ تھا کہ عرب کے تمام قبائل پر اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی بھی قبیلہ قریش کو اپنا دشمن بنانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ان کو اپنے وہاں لے جائیں گے، تو اس کا مطلب قریش کو اپنا دشمن بنانا ہے، اور ان کی دشمنی مول لینا وہ اپنی طاقت سے باہر سمجھتے تھے۔

## .....تب ہم تم پر غالب آئیں گے:

لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ وہ یہ خدمت مدینہ منورہ کے دو قبیلوں اوس و خزرج۔ جن کو بعد میں انصار کا لقب ملا۔ سے لے۔ چناں چہ نبوت کے گیارہویں سال قبیلہ خزرج کے ۶ آدمی آئے، اور حج کے موقع پر منیٰ میں جمرہ عقبہ کے پاس حضور ﷺ سے ان کی

ملاقات ہوئی، آپ ﷺ نے دعوت اسلام پیش کی، انہوں نے قبول کر لی۔ (۱) مدینہ منورہ میں یہودیوں کے دو قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر آباد تھے، وہ اہل کتاب تھے اور اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ان کی آسمانی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی آخر الزمان کی آمد اور ان کی جو علامات بتلائی گئی تھیں وہ سب انہیں معلوم تھیں، اور اس و خزر ج کا رہنا سہنا بھی چوں کہ یہودیوں میں تھا اور ان کی یہودیوں کے ساتھ آپس میں چپقلش اور کشاکش بھی چلتی رہتی تھی، مقابلے بھی ہوتے رہتے تھے، تو یہودی ان سے کہا کرتے تھے کہ دیکھو! نبی آخر الزمان آنے والے ہیں جب وہ آئیں گے، تو ہم ان پر ایمان لائیں گے۔ اور ان کے ساتھ مل کر ہم تم کو اس طرح قتل کریں گے جیسے قوم عاد اور قوم ارم کو قتل کیا گیا۔ اور ان پر ایمان لانے سے اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے گا، اور اس وقت ہم تم پر غالب آئیں گے۔

### بیعت عقبہ اولیٰ:

البتہ یہودی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ نبی آخر الزمان ہمارے اندر یعنی بنی اسرائیل میں آئیں گے۔ بہر حال! اس و خزر ج یہودیوں سے یہ باتیں سنتے رہتے تھے۔ وہ تو اصل میں بت پرست تھے، ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں تھی، ان کو اس سلسلہ میں کوئی معلومات نہیں تھی۔ تو یہ ۶ آدمی جب حج کے لیے آئے اور حضور ﷺ سے ملاقات ہوئی، اور آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور میں تم کو ایمان کی دعوت دیتا ہوں، تو انہیں یہودیوں کی باتیں یاد آ گئیں۔ اور انہوں نے آپس میں کہا کہ یہودی ہم سے کہا کرتے ہیں کہ نبی آخر الزمان جب آئیں گے، تو ہم ان پر ایمان لائیں گے اور ان پر ایمان لانے کی

وجہ سے اللہ تعالیٰ ہماری مدد کریں گے اور اس کے نتیجہ میں ہم تم پر غالب آئیں گے۔ تو وہ ایمان لائیں اس سے پہلے ہم کو موقع ملا ہے، ہم کیوں نہ ایمان لے آئیں؟!!! چناں چہ یہ چھ آدمی ایمان لے آئے۔ اس وقت اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہوئی؛ البتہ انہوں نے کہا کہ آئندہ سال ہم دوبارہ آپ سے ملاقات کریں گے۔ چناں چہ دوسرے سال حج کے موقع پر ۶ کے بجائے ۱۲ آدمی آئے۔ ان ۱۲ میں ۵ تو وہی تھے، جو اگلے سال آئے تھے، باقی ۷ نئے تھے۔ وہ ایمان لا کر حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ اس کو بیعت عقبہ اولیٰ کہا جاتا ہے۔<sup>(۱)</sup>

### بیعت عقبہ ثانیہ:

پھر انہوں نے یہ درخواست کی کہ آپ اپنے تربیت کردہ بعض صحابہؓ کو ہمارے پاس بھیجیے، تاکہ ہم کو وہاں اسلام کے احکام اور قرآن کی تعلیم سے واقف کریں۔ چناں چہ حضور ﷺ نے پہلے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو اور پھر حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کو بھیجا۔ یہ دونوں حضرت اسعد بن زرارہؓ کے گھر پر ٹھہرے، اور وہاں رہ کر انہوں نے ایمان و اسلام کی دعوت دینا شروع کیا۔ اور پھر تو مدینہ کے عرب قبائل میں گھر گھر میں نبی کریم ﷺ کا چرچا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے بعد والے (یعنی نبوت کے ۱۳ روئے) سال ۵۷۵ء افراد۔ جن میں ۳۷ مرد اور ۲ عورتیں تھیں۔ حج کے موقع پر پہنچے۔ نبی کریم ﷺ کے دست مبارک پر بیعت ہوئی۔ یہ بیعت عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے۔<sup>(۲)</sup>

(۱) سیرۃ ابن ہشام: ۱/۲۳۱-۲۳۳.

(۲) سیرۃ ابن ہشام: ۱/۲۳۸-۲۴۱.

## ہجرت:

اسی موقع پر انہوں نے نبی کریم ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ہمارے ہاں تشریف لے آئیے، ہم جس طرح اپنی جان کی، اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتے ہیں، آپ کی بھی حفاظت کریں گے، اور اس دعوتِ ایمان میں ہم آپ کا پورا پورا ساتھ دیں گے، اور تعاون کریں گے۔ چنانچہ ۳؎ نبوی مکمل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضور ﷺ نے صحابہؓ کو مدینہ منورہ ہجرت کی اجازت دی۔ پہلے کچھ صحابہ وہاں پہنچے، جیسے حضرت عمرؓ وغیرہ۔ یہاں تک کہ ماہ ربیع الاول میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو بھی اجازت دی، اور آپ بھی ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔<sup>(۱)</sup>

## آپسی لڑائی کی ہو گئی صفائی:

مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد مکہ والوں کو اور زیادہ غصہ آیا کہ یہ لوگ تو وہاں چلے گئے!!! وہ تو دین کے دشمن تھے، انہوں نے ان کو مدینہ منورہ میں بھی چین سے رہنے نہیں دیا۔ چنانچہ یہاں رہ کر بھی مدینہ منورہ والوں کو کہلواتے تھے، دھمکیاں دیتے تھے کہ تم نے ان کو پناہ دی ہے، ہم تم پر حملہ کریں گے اور تم سے مقابلہ کریں گے، تم ان کو مدینہ سے نکالو۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے ان کو آپس میں اندرونی طور پر بھی ابھارنے کی کوشش کی۔ ایمان نہ لانے والوں اور عبد اللہ بن ابی - جو ظاہری ایمان بھی نہیں لایا تھا - کو لڑائی کے لیے آمادہ کیا، یہاں تک کہ ایک موقع پر آپس میں باقاعدہ ٹکراؤ کی صورت بھی پیدا ہو گئی؛ مگر

(۱) سیرۃ ابن ہشام: ۱/۲۶۸-۲۹۲۔

نبی کریم ﷺ عین وقت پر پہنچ گئے، اور لوگوں کو سمجھایا کہ یہ تو تم کو آپس میں لڑا کر نقصان کرنا چاہتے ہیں۔ اور معاملہ صاف کر دیا۔ جب ان کی طرف سے مایوس ہو گئے، تو انہوں نے (مکہ والوں نے) یہودیوں کو خط لکھا کہ تم قلعوں والے اور ہتھیار والے ہو، ان لوگوں کو تم اپنے وہاں سے نکالو۔ لیکن حضور ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ پہلے ہی امن کا معاہدہ کر لیا تھا۔

### حضور ﷺ کا خواب:

بہر حال! مکہ والوں کو چین نہیں پڑا، تو لشکر لے کر بار بار مدینہ پر حملے کیے۔ جنگ بدر ہوئی، جنگ احد ہوئی، جنگ خندق ہوئی، مختلف جنگیں ہوئیں، اور جنگ خندق کے بعد والے سال نبی کریم ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے صحابہ کے سامنے اپنے اس خواب کا تذکرہ کیا۔<sup>(۱)</sup> تو جو صحابہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ گئے تھے، ان کو مدینہ میں چھٹا سال چل رہا تھا، ظاہر ہے کہ وہ مکہ میں پیدا ہوئے، زندگی کا بڑا حصہ وہاں گزارا تھا، مکہ کی یاد تو ان کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی، جب یہ خواب سنا تو بے چین ہو گئے۔ اور نبی کا خواب وحی کے حکم میں ہوتا ہے، اس لیے انہوں نے کہا کہ ہم چلیں گے، اور حضور ﷺ بھی تیار ہو گئے۔

### صلح حدیبیہ:

بہر حال! تقریباً ڈیڑھ ہزار کا قافلہ عمرہ کے لیے چلا۔<sup>(۲)</sup> اور مکہ والوں کو پتہ چلا، تو

(۱) تفسیر الطبری (سورة الفتح) ونقله الحافظ في الفتح في التعبير عن الفريابي وعبد بن حميدو الطبري عن طريق ابن أبي نجیح عن مجاهد.

(۲) قال ابن اسحاق: وكان جابر بن عبد الله فيما بلغني يقول: كنا أصحاب الحديبية أربع =

انہوں نے پہلے ہی سے تیاریاں کر لیں، قریش کے علاوہ مکہ کے آس پاس رہنے والے دوسرے قبائل کو بھی مقابلہ کے لیے اپنا ہم خیال بنالیا، اور طے کر لیا کہ کسی بھی حال میں ان کو مسجد حرام میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اگر یہ داخل ہو گئے تو ہماری ناک کٹ جائے گی۔ چنانچہ حضور ﷺ کو جب ان حالات کا علم ہوا، تو آپ ﷺ سیدھے جانے کے بجائے راستہ بدل کر آگے بڑھے۔ چنانچہ مقام حدیبیہ میں آپ ﷺ کی اونٹنی اللہ کے حکم سے بیٹھ گئی، اٹھانا چاہا تو اٹھی، دوبارہ بیٹھ گئی اور پھر نہ اٹھی۔<sup>(۱)</sup> حضور ﷺ کو وحی کے ذریعہ مکمل بات بتلا دی گئی کہ اس وقت آپ کو مکہ جانے کا موقع نہیں ملے گا، اور اس بات سے بھی آگاہ کیا گیا کہ اگر آپسی صلح کی کوئی صورت نکل آئے، تو آپ اس کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ چنانچہ آخر میں دس سال کے لیے صلح ہوئی، اور آپ ﷺ مکہ مکرمہ سے بغیر عمرہ کیے لوٹے۔ اس صلح کی شرائط میں پہلی شرط یہ تھی کہ اس سال تو یہ لوگ بغیر عمرہ کے واپس جائیں گے؛ البتہ آئندہ سال ان ہی دنوں میں دوبارہ آئیں گے اور عمرہ کریں گے۔ دیگر شرائط بھی تھیں، جیسے: دس سال تک ہم باہم جنگ نہیں کریں گے، اور ہماری صلح میں جو دوسرے قبائل شریک ہونا چاہیں، تو وہ شریک ہو سکتے ہیں۔<sup>(۲)</sup>

## خدا کی قسم! یہ فتح ہے:

چنانچہ جب صلح مکمل ہو گئی، تو صلح کے مطابق نبی کریم ﷺ عمرہ کیے بغیر حدیبیہ

= عشرۃ مائۃ، السیرۃ النبویۃ لابن اسحاق ص: ۴۵۴ (ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت) و صحیح البخاری: ۴۸۴۔

(۱) السیرۃ النبویۃ لابن اسحاق ص: ۴۵۵ و صحیح البخاری: ۲۴۳۱ و ۲۴۳۲۔

(۲) السیرۃ النبویۃ لابن اسحاق ص: ۴۶۱-۴۶۲۔

سے واپس لوٹے۔ جب واپس لوٹ رہے تھے، تو سورہ فتح کی شروع کی آیتیں: **إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا ۚ لِيُغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَأَخَّرَ ۚ وَيَتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ ۚ وَيَهْدِيكَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمًا**۔ (سورۃ الفتح: ۱-۲) نازل ہوئیں۔ جب یہ آیتیں نازل ہوئیں تو حضور اکرم ﷺ نے حضرات صحابہ سے فرمایا کہ آج ایسی عجیب و غریب سورت نازل ہوئی جو میرے نزدیک دونوں جہاں سے زیادہ قیمتی اور محبوب ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ <sup>(۱)</sup> اس سورت میں صلح کا جو واقعہ پیش آیا تھا، اس کو اللہ تعالیٰ نے فتح سے تعبیر کیا ہے، تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ فتح ہے؟ یہ تو ہم نے بہت دبا کر صلح کی ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! یہ فتح ہے۔ <sup>(۲)</sup> چنانچہ بعد کے حالات نے بتلایا کہ واقعہ یہ فتح مبین ہے۔ خیر! صلح کے بعد امن و سکون ہو گیا، ان کے حملے نہیں ہوئے۔ اس کے بعد دوسرے سال شرط کے مطابق مکہ میں حضور ﷺ صحابہؓ کے ساتھ عمرہ کے لیے تشریف لے گئے، اور عمرہ سے فارغ ہوئے۔

## عہد شکنی:

مکہ والوں کا تو شرائط پر باقی رہنا مشکل تھا۔ مکہ مکرمہ کے قرب و جوار میں دو قبیلے رہتے تھے: بنو خزاعہ اور بنو بکر۔ ان دونوں میں آپس میں لڑائیاں ہوتی تھیں، تو بنو بکر مکہ والوں کا حلیف (ally) تھا، اور بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے۔ اب جب مسلمان اور قریش کی صلح ہوئی، اور لڑائیاں ختم ہوئیں، تو ان کو اپنی پرانی لڑائیاں یاد آئیں، اور پھر لڑائی

(۱) صحیح مسلم: ۴۸۶۱ و تفسیر الطبری و أسباب النزول للواحدي (سورۃ الفتح)۔

(۲) صحیح البخاری: ۲۸۳۳ و ۲۸۳۴ و صحیح مسلم: ۱۷۸۵۔

شروع ہوئی۔ اس موقع پر قریش نے ان کا ساتھ دیا، یہ شرط کے خلاف تھا۔ یہ مکہ والے یوں سمجھتے تھے کہ ہماری اس حرکت کا کسی کو پتہ نہیں چلے گا؛ لیکن جب قریش نے بنو بکر کا ساتھ دیا اور جس قبیلہ کے خلاف یہ حرکت کی تھی یعنی بنو خزاعہ، اس کا ایک پورا وفد مدینہ منورہ پہنچا، اور سارے حالات نبی کریم ﷺ سے بیان کیے۔ اسی کی بنیاد پر حضور ﷺ نے مکہ والوں کو اطلاع دی کہ تمہارے جس قبیلہ نے یہ حرکت کی ہے تم ان کے ساتھ اپنا معاملہ ختم کر دو، یا جتنے آدمی مارے گئے ہیں ان کی دیت ادا کر دو۔ یا ہماری صلح ختم کر دو۔ تو انہوں نے اس سے انکار کر دیا اور کہلوادیا کہ ہاں! صلح ختم کر دو۔ ان لوگوں نے کہلوادیا؛ لیکن بعد میں افسوس ہوا کہ صلح ختم ہوگئی، یہ تو بڑی خطرناک بات ہوگئی۔ چنانچہ انہوں نے دوبارہ ابوسفیان کو مدینہ منورہ صلح کی تجدید (Renew) کرنے کے لیے بھیجا۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے صلح کی تجدید نہیں فرمائی۔ یہ ۸ھ کا واقعہ ہے۔<sup>(۱)</sup>

## فتح مکہ کے لیے روانگی:

ابوسفیان کے لوٹنے کے بعد آپ ﷺ نے صحابہ کو تیاری کا حکم دیا۔ چنانچہ ۱۰۰۰۰ (دس ہزار) کا ایک بڑا لشکر حضور ﷺ کی سرکردگی میں مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوا۔<sup>(۲)</sup> چوں کہ مکہ مکرمہ حرم ہے، اس لیے نبی کریم ﷺ کی دلی خواہش یہ تھی کہ ہم لشکر لے کر مکہ مکرمہ پر چڑھائی کے لیے تو جا رہے ہیں؛ لیکن ایسی صورت پیدا کی جائے کہ لڑائی کی نوبت نہ آئے، اور خون بہے بغیر اللہ تعالیٰ ہمیں فتح عطا فرمادے۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے

(۱) سیرۃ ابن ہشام ۲/۳۹۶-۳۹۷۔

(۲) السیرۃ النبویۃ لابن إسحاق ص: ۵۳۷ وسیرۃ ابن ہشام: ۲/۳۲۲۔



احتیاط برتی کہ دو سال پہلے تو عمرہ کے لیے گئے تھے، تو ان کو پتہ چل گیا تھا، اور انہوں نے مقابلہ کی تیاریاں کر لی تھیں، اور اس مرتبہ ایسی رازداری سے کام لیا کہ اتنا بڑا لشکر گیا تب بھی ان کو پتہ تک نہ ہوا۔ بلکہ جتنے ناکے تھے، ان سب کو بند کر دیا تھا تا کہ اطلاع پہنچنے ہی نہ پائے۔ مکہ مکرمہ والوں کو ڈرتو تھا ہی، کہ ہم نے صلح توڑی ہے اب کہیں حملہ نہ ہو۔ تو ان کے سردار ابوسفیان اسی فکر میں چکر لگایا کرتے تھے۔

## ابوسفیان کی گرفتاری اور قبول اسلام:

حضور ﷺ اتنا بڑا لشکر لے کر روانہ ہوئے اور لشکر مکہ مکرمہ کے بالکل قریب مقام مرانظر ان پہنچ گیا۔ ایک مرتبہ ان کے سردار ابوسفیان رات کو نکلے ہوئے تھے، انہوں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا لشکر ہے، چولہے جل رہے ہیں اور بہت بڑا مجمع ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ یہ تو حضور ﷺ کا لشکر ہے!!! حضور ﷺ کے لشکر کے جو چوکیدار گشت کر رہے تھے۔ جن کو گشتی دستہ (patrolling army) کہا جاتا ہے۔ انہوں نے ابوسفیان کو گرفتار کر لیا۔ اسی رات ابوسفیان حضرت عباسؓ کے سمجھانے سے ایمان لے آئے۔<sup>(۱)</sup> بہر حال! حضور ﷺ کی جو خواہش تھی کہ مکہ مکرمہ والوں کو آخر تک پتہ نہ چلے؛ وہ پوری ہوئی، اور ان کو بالکل پتہ ہی نہ چلا۔ ابوسفیان باہر آئے تھے ان کو پتہ بھی تھا؛ لیکن وہ تو پکڑ لیے گئے، لہذا ان کو واپس جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔

## اليوم يوم المرحمة:

دوسرے دن حضور ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے لیے روانہ ہوئے، اور جب

پورا لشکر مکہ کی جانب آگے بڑھا، تو حضور ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ ابوسفیان کو ایسی جگہ لے کر کھڑے رہو، جہاں سے وہ پورے لشکر کا نظارہ کریں۔ چنانچہ حضرت عباسؓ ان کو ایک تنگ جگہ پر لے کر کھڑے ہوئے۔ لشکر کے دستے گزرتے تھے، ابوسفیان پوچھتے تھے: یہ کون؟ یہ کون؟ حضرت عباسؓ انہیں بتلاتے تھے۔<sup>(۱)</sup> یہاں تک کہ ایک بہت بڑا دستہ۔ جس میں حضور ﷺ کے خاص صحابہؓ تھے، ان کا جھنڈا حضرت سعد بن عبادہؓ کے ہاتھ میں تھا۔ گزرا، انہوں نے جب حضرت ابوسفیان کو دیکھا تو ان کو جوش آیا اور بولے کہ:

اليوم يوم الملحمة      اليوم تستحل الكعبة (أو الحرمه)

ترجمہ: آج تو جنگ کا دن ہے، آج تو کعبہ کو اللہ کی طرف سے خون خرابہ کے لیے حلال کیا جائے گا۔

ابوسفیان نے جب یہ بات سنی تو ڈر گئے، ان کے بعد پھر مخصوص صحابہ کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی آئی، اس میں حضور ﷺ بھی تھے۔ جب حضور ﷺ سامنے سے گزرے تو ابوسفیان نے حضور ﷺ سے کہا کہ سعد بن عبادہؓ نے کیا کہا آپ نے سنا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: کیا کہا؟ تو انہوں نے ان کی وہ بات نقل کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں! آج رحمت کا دن ہے آج تو کعبہ کی عظمت دوبالا ہو جائے گی، اور کعبہ کو غلاف پہنایا جائے گا۔<sup>(۲)</sup> پھر حضور ﷺ نے اولاً حضرت علیؓ کو اور پھر حضرت سعد بن عبادہ کے بیٹے قیس بن سعد کو جھنڈا

(۱) السيرة النبوية لابن هشام: ۲/۴۰۳-۴۰۴.

(۲) صحيح البخاري: ۲۸۰۰ وقال الحافظ ضمن هذا الحديث: ذكره الأموي في المغازي اه، قلت: هو سعيد بن يحيى الأموي.

دینے کا حکم دیا۔

## تواضع و انکساری کی لاجواب مثال:

اس طرح یہ قافلہ آگے بڑھا۔ نبی کریم ﷺ اپنی اوٹنی پر سوار تھے، آپ ﷺ نے اپنے پیچھے اپنے لاڈلے اسامہ بن زید کو بٹھا رکھا تھا، اور ایسی حالت میں آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے کہ تواضع اور انکساری سے آپ ﷺ کا چہرہ انور اتنا جھکا ہوا تھا کہ آپ کی داڑھی مبارک اونٹ کے کجاوے کی لکڑی سے لگ رہی تھی۔ <sup>(۱)</sup> اور حضور ﷺ سورہ فتح کی شروع کی آیتیں: **إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا** تلاوت کر رہے تھے۔ بخاری شریف کی روایت میں حضرت عبد اللہ بن مغفلؓ سے یہ کیفیت منقول ہے۔ <sup>(۲)</sup> حالاں کہ یہاں سے تو آپ ﷺ نکالے گئے تھے، ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے، اور اتنے زمانے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی تو ذرہ برابر بھی اکڑ اور اترا ہٹ نہیں ہے؛ بلکہ پوری تواضع اور انکساری کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں۔

دنیا کے بادشاہ ہوتے تو نہ جانے کتنا خون بہاتے اور کیسی اکڑ کا مظاہرہ کرتے، قرآن کریم میں ایک جگہ دنیا کے بادشاہوں کا طریقہ نقل کیا گیا ہے کہ **إِنَّ الْبُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعْرَافَهُمْ أَهْلَهَا أَذِلَّةً**۔ (النمل: ۳۴) (جب وہ کسی آبادی میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو اس کو خراب و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں اور اس کے عزت والے لوگوں کو ذلیل

(۱) السيرة النبوية لابن هشام: ۴/ ۴۰۵ ودلائل النبوة للبيهقي: ۵/ ۶۹ (ط: دار الكتب العلمية،

بيروت)۔

(۲) صحيح البخاری: ۴۲۸۱۔

بنادیتے ہیں) لیکن نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے موقع پر جب مکہ میں داخل ہو رہے ہیں، تو اس طرح تواضع اور انکساری کے ساتھ، روتے ہوئے، سورہ فتح کی آیتیں پڑھتے ہوئے داخل ہو رہے ہیں۔ ذرہ برابر بھی کوئی غرور و تکبر کا اظہار نہیں ہے۔

## منہ کے بل گر کے.....:

آپ ﷺ اس طرح داخل ہوئے کہ اپنی چچا زاد بہن، حضرت علیؓ کی حقیقی بہن حضرت ام ہانیؓ کے گھر پر تشریف لے گئے، غسل فرمایا، آٹھ رکعتیں ادا فرمائیں، اس کے بعد حرم میں تشریف لائے۔ (۱) آپ ﷺ اپنی اونٹنی پر تھے، مکہ والوں نے کعبہ کی چاروں طرف ۳۶۰ ربت سیسے کے ذریعہ دیوار کے ساتھ چپکائے ہوئے تھے، آپ ﷺ اپنی اونٹنی پر طواف کر رہے ہیں اور جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔ (الاسراء: ۸۱) پڑھتے ہوئے اپنی لکڑی سے اشارہ کر رہے ہیں، اور بت گرتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح سارے بت سرنگوں ہو گئے۔ (۲) پھر آپ ﷺ نے عثمان بن طلحہ کے پاس سے کعبۃ اللہ کی چابی منگوائی، دروازہ کھولا اندر بھی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ وغیرہ کی تصاویر تھیں، پہلے تو آپ ﷺ نے وہ تصاویر مٹوائیں، پھر اندر داخل ہوئے۔ حضرت عثمان بن طلحہ، حضرت بلالؓ، حضرت اسامہؓ آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ہر کونہ پر اللہ تعالیٰ

(۱) صحیح البخاری: ۱۱۰۳۔

(۲) صحیح البخاری: ۲۴۷۸ و صحیح مسلم: ۱۷۸۱ و دلائل النبوة للبيهقي ۵/ ۷۱-۷۳ و سبل

الهدى والرشاد للصالحى الشامى: ۵/ ۲۳۲ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

کی تسبیح، تحمید، تکبیر کی۔ کافی دیر کے بعد حضور ﷺ نے دروازہ کھولا۔ (۱) اور کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر آپ ﷺ نے خطبہ دیا۔ اس خطبے میں بنیادی بات آپ ﷺ نے قریش کو خطاب کر کے یہ فرمائی تھی: اے قریش! زمانہ جاہلیت کا جو غرور ہے اور تم اپنے آباء و اجداد پر جو اترا تے ہو اللہ تعالیٰ نے وہ سب ختم کر دیا ہے۔ الناس من آدم و آدم من تراب۔ (سب حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا ہے) اور پھر آیت کریمہ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ۔ (المحجرات: ۱۳) تلاوت فرمائی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے یہ اعلان کر دیا کہ فخر و غرور اور قریش اپنے آپ کو سب سے اونچا سمجھتے ہیں وہ کچھ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اگر کسی کی عزت ہے، تو وہ تقویٰ اور نیک عمل کی وجہ سے ہے۔ (۲)

### لا تشریب علیکم الیوم:

جب آپ ﷺ کعبہ کے اندر رشریف لے گئے، تو اتنی دیر میں پورے مکہ والے جمع ہو گئے، آپ ﷺ نے پہلے سے اعلان کر دیا تھا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو اس کو امن ہے، جو مسجد حرام میں آجائے اس کو امن ہے، جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے اس کو امن ہے، جو اپنے ہتھیار پھینک دے، اس کو امن ہے۔ (۳) چنانچہ مکہ کے تمام کافر و غیر مسلم مسجد حرام میں موجود تھے، مسجد حرام کھپا کچھ بھری ہوئی ہے اور آپ ﷺ نے خطبہ دیا۔

(۱) السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: ۲/ ۴۱۱ و صحیح البخاری: ۲۸/ ۴ و دلائل النبوة للبيهقي: ۵/ ۴۲۔

(۲) سیرۃ ابن اسحاق ص: ۵۳۴۔

(۳) صحیح مسلم: ۴۸۰ و سنن أبی داود: ۳۰۲۱ و ۳۰۲۲۔

خطبہ کے آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا: اے قریش! تمہارا کیا خیال ہے؟ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ اس کے جواب میں قریش کی طرف سے ان کے سرداروں میں سے ایک سہیل بن عمرو نے کہا: **أخ کریم وابن أخ کریم** (آپ تو شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں) ہم آپ سے بھلائی ہی کی امید رکھتے ہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں تم کو آج وہی بات کہتا ہوں، جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: **لا تشریب علیکم الیوم** (آج تم کو کوئی طعن و تشنیع بھی نہیں کی جائے گی) **اذہبوا أنتم الطلقاء** (جاؤ! تم سب آزاد ہو) <sup>(۱)</sup> دنیا میں تو دستور یہ ہے کہ کوئی معاف بھی کر دے، تو ٹوٹنگ تو کرتا ہی ہے کہ جا! تیرے جیسے نالائق کو کیا کرنا، یوں کر کے ایک دو بات سنا دیتے ہیں۔ مگر حضور ﷺ نے ایک جملہ بھی نہیں کہا۔ یہ آپ ﷺ کے اخلاق تھے۔ جنہوں نے ۱۳ سال تک ایسا ستایا کہ ظلم و ستم کی کوئی شکل نہیں چھوڑی تھی؛ لیکن آج جب اللہ تعالیٰ نے قابو دیا تو آپ ﷺ نے اس طرح اپنے اخلاق کریمانہ کا مظاہرہ فرمایا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ سب کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق دی، اور سب ایمان لائے۔ یہ آپ ﷺ کے اخلاق ہی کے نتیجے میں ہوا۔ اس طرح مکہ مکرمہ فتح ہوا۔ اسی کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس سورت میں بتلایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی مدد آجائے، اور مکہ فتح ہو جائے، تو اس کے بعد آپ ﷺ دیکھیں گے کہ لوگ گروہ در گروہ، جماعت در جماعت ایمان میں داخل ہوں گے۔

(۱) سیرۃ ابن إسحاق ص: ۵۳۱ و دلائل النبوة للبيهقي: ۵/ ۵۷ - ۵۸.

## وفود کی آمد:

دیکھیے! قریش کے علاوہ عرب کے بعض قبائل کے سامنے نبی کریم ﷺ کی حقانیت اور آپ ﷺ کا اللہ کا سچا رسول ہونا واضح ہو چکا تھا؛ لیکن قریش کے ڈر کی وجہ سے وہ ایمان نہیں لاتے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ اگر آپ ﷺ کو اپنی قوم پر غلبہ حاصل ہو جائے تو ہم بھی ایمان لے آئیں گے۔ چنانچہ جب مکہ فتح ہوا اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو قریش پر غلبہ دیا، تو حال یہ ہوا کہ جب آپ ﷺ مدینہ واپس لوٹے تو ۸ ہجرت ختم ہو رہی تھی اور ۹ ہجرت کا پورا سال ایسی حالت میں گزرا کہ عرب کے تمام علاقوں سے ہر قبیلہ سے وفود آتے تھے اور وہ اپنے قبیلہ کے اسلام لانے کی خبر دیتے تھے۔

## بشارت یا خبر:

اگر یہ مانا جائے کہ یہ سورت فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی تو اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت دی گئی ہے۔ اور اگر بعد میں مانا جائے تو خبر دی جا رہی ہے۔ لیکن جب فتح و نصرت ہو جائے، فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ تو آپ اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کیجیے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگیے۔

## آپ نے سورت پڑھ کر سنائی تو کیا ہوا.....؟؟؟

جب یہ سورت نازل ہوئی اور آپ ﷺ نے پڑھ کر سنائی تو حضرت عباسؓ رونے لگے۔ حضور ﷺ نے پوچھا: آپ کیوں روتے ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! اس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے رخصت ہونے کی خبر دی ہے۔ (۱) اللہ نے آپ کو دنیا میں

(۱) أنوار التنزيل وأسرار التأويل للبيضاوي: ۵/ ۳۴۴ (ط: دار إحياء التراث العربي بيروت).

بھیجا تھا؛ تاکہ ایمان دنیا میں پھیلے۔ پورے جزیرۃ العرب میں جب سب لوگ ایمان لے آئیں گے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب واپسی کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو دنیا میں رہنے نہیں دیں گے، اور اپنے پاس واپس بلا لیں گے۔ حضور ﷺ نے جب سنا تو فرمایا: تم ٹھیک کہتے ہو۔

## میں بھی یہی سمجھتا ہوں.....:

چنانچہ بخاری شریف میں بھی موجود ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے دور خلافت میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو خاص طور پر اپنے قریب رکھتے تھے، بڑے بڑے حضرات صحابہؓ جو بدر میں سے تھے ان کی حاضری کے موقع پر بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو اپنے پاس بلانے کا اہتمام کرتے تھے۔ ان لوگوں نے ایک مرتبہ پوچھا: ہماری اولاد، ہمارے لڑکے ان کی عمر کے ہیں، ہماری حاضری کے موقع پر آپ ان کو اپنے پاس بلاتے ہیں؟ تو اس وقت حضرت عمرؓ نے جواب میں فرمایا کہ ان کا تعلق کس گھرانے سے ہے تم جانتے ہو؟ یعنی نبوت کے گھرانے سے ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر حضرت عمرؓ نے مجھ کو بلایا، یہ حضرات بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت عمرؓ نے ان لوگوں سے پوچھا: بتاؤ! اس سورت (سورہ نصر) کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟ پھر انہوں نے سورہ نصر پڑھی۔ انہوں نے کہا: اس میں یہ ہے کہ جب ملک فتح ہوں گے، اس وقت تم اللہ کی تسبیح بیان کرو۔ بعض تو خاموش رہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا: تم کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا: میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی وفات کے قریب



ہونے کی خبر دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا: ہاں! جو تم سمجھتے ہو میں بھی وہی سمجھتا ہوں۔ (۱)

بہر حال! اس میں ایک طرف جہاں خوش خبری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا فرمایا، وہیں یہ بھی ہے کہ جس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو دنیا میں بھیجا تھا وہ کام ہو گیا۔ تو جب مقصد پورا ہو جاتا ہے تو پھر آپ ﷺ کو واپس بلا لیا جائے گا، گویا آپ ﷺ کی موت کی خبر دی گئی ہے۔

اس سورت کے متعلق مزید باتیں آئندہ مجلس میں بیان کریں گے۔ (ان شاء اللہ)

(۱) صحیح البخاری: ۴۹۶۹ و ۴۹۷۰۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورہ نصر

(مؤرخہ ۸ ذی قعدۃ الحرام ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۲ جولائی ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

(قسط-۲)

الْحَمْدُ لِلَّهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ  
بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ  
أَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ  
وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ أَرْسَلَهُ إِلَى  
كَافَّةِ النَّاسِ بِشِيرٍ أَوْ نَذِيرٍ أَوْ دَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَ  
عَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا. آمَنَّا بَعْدُ.

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ. بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ.

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۖ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝

## گذشتہ مجلس میں:

گذشتہ مجلس میں بتلادیا گیا تھا کہ سورہ نصر قرآن پاک میں سب سے آخر میں مکمل  
نازل ہونے والی سورت ہے۔ اس میں باری تعالیٰ نے فرمایا ہے:

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ (جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے)

وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا (اور جب آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ

فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں)

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْ لَهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا۔

(تو آپ اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کیجیے اور اس سے مغفرت طلب کیجیے۔ بے شک وہ بہت زیادہ معاف کرنے والا ہے)

اس سورت سے متعلقہ بنیادی باتیں گذشتہ مجلس میں آپ کو بتلا دی گئیں۔ البتہ اس سورت میں ہمارے لیے کچھ سبق بھی ہیں، ان کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

دیکھیے! اس سورت کو اللہ تعالیٰ نے اذا جاء نصر اللہ و الفتح سے شروع فرمایا ہے۔ یعنی اللہ کی مدد آئے اور مکہ فتح ہو جائے، بتلایا گیا تھا کہ یہاں فتح سے فتح مکہ مراد ہے۔

## جو کچھ ہوا، ہوا اکرم سے تیرے:

اللہ تبارک و تعالیٰ نے دو لفظ استعمال فرمائے: (۱) نصر اللہ (۲) و الفتح۔ جب اللہ کی مدد آ جائے اور فتح۔ اگر مختصر طریقہ سے پیش کرنا ہو تو اذا جاء الفتح، جب مکہ فتح ہو جائے، تو آپ یہ کام کرو۔ یہ کہا جاتا؛ لیکن پہلے لفظ نصر اللہ لایا گیا۔ دو الگ الگ لفظ استعمال کرنے میں بڑی حکمت ہے۔

(۱) پہلی حکمت اور سبق یہ ہے کہ مکہ کی فتح اللہ کی مدد سے حاصل ہوگی۔ گویا لفظ نصر اللہ کو پہلے لاکر ایک سبق دیا کہ آدمی کو جب بھی کسی چیز میں کامیابی حاصل ہوگی تو اس کامیابی کا سبب اور ذریعہ اللہ کی مدد ہوگی۔ یہ بنیادی چیز ہے۔ ہم اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں مختلف مقاصد حاصل کرنے کے لیے محنت کرتے اور مختلف اسباب اختیار کرتے ہیں، نتیجہ جو کامیابی حاصل ہوتی ہے، وہ اسباب کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ اللہ کی مدد سے حاصل ہوتی ہے۔

جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے جو کچھ ہوگا، تیرے کرم سے ہوگا

سب کچھ اللہ ہی کی مدد سے ہوا کرتا ہے، کوئی اور مؤثر نہیں ہے۔ اگر دشمن کے مقابلہ میں جنگ ہو رہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی (جیسا کہ یہاں فتح کا تذکرہ ہے) تو وہ فتح اسباب کی وجہ سے، زور بازو کی وجہ سے، ساز و سامان کی وجہ سے یا تدابیر کی وجہ سے حاصل نہیں ہوئی؛ بلکہ اللہ ہی کی مدد سے حاصل ہوئی۔

ہم روزگار کے لیے محنت و کوشش کرتے ہیں، اور کامیابی حاصل ہوتی ہے، تو ہمیں اس موقع پر یہ چیز مستحضر رکھنی چاہیے اور اس بات کا یقین رکھنا چاہیے کہ جو کچھ حاصل ہوا وہ اللہ کی مدد اور اس کے کرم سے حاصل ہوا۔ ہمارے زور بازو اور ہماری محنت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اصل مؤثر اللہ تعالیٰ کی مدد ہے۔

آپ قرض کی ادائیگی کے لیے محنت کر رہے ہیں اور قرض ادا ہو گیا تو یہ نہ سمجھیں کہ میں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ نہیں! بلکہ اللہ کی مدد اور اس کے کرم سے قرض ادا ہوا۔ آپ اولاد کے حصول کے لیے محنت کر رہے ہیں اور اولاد حاصل ہو جائے، تو اس میں آپ کے زور بازو کا اور آپ کی کسی تدبیر کا دخل نہیں؛ بلکہ اللہ کے فضل و کرم اور اس کی مدد سے یہ کام ہوا۔

ایک طالب علم نے محنت کی، اور امتحان میں اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوا، تو اس کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ میں اپنی محنت کی وجہ سے کامیاب ہوا ہوں؛ بلکہ اللہ کے فضل و کرم اور اس کی مدد سے یہ کامیابی حاصل ہوئی۔

**انسان کے بس کی بات نہیں:**

الغرض! ہر جگہ اصل اللہ کی مدد ہے، اور اس کا فضل و کرم ہے۔ جب بھی آپ کو کسی

شعبہ میں، کسی میدان میں، کسی بھی موقع پر کامیابی ملے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرو اپنی طرف نہیں۔ ایک مؤمن کے دل و دماغ میں ہمیشہ یہ چیز مستحضر رہنی چاہیے۔ اس لیے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس دنیا کو دارالاسباب بنایا ہے، اور انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اسباب جمع کر لے، اور انہیں اختیار کر لے؛ لیکن ان اسباب میں اثر ڈالنا، اور اس کے بدلہ میں مطلوبہ نتیجہ حاصل ہونا، یہ انسان کے بس کی چیز نہیں ہے، جب تک اللہ کی مدد شامل حال نہ ہو۔

## یہ نہ کہیے:

آپ بیمار ہوئے، ڈاکٹر کے پاس گئے، علاج کیا، پیسے خرچ کر کے دوائی لی، اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے صحت عطا فرمائی، تو یہ نہ کہیے کہ دوائی سے تندرستی حاصل ہوئی، فلاں ڈاکٹر کے علاج سے صحت حاصل ہوئی۔ نہیں! بلکہ اللہ کے حکم سے حاصل ہوئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی بیماری ہے، ایک ہی ڈاکٹر ہے، ایک ہی دوا ہے؛ لیکن ایک آدمی کو فائدہ حاصل ہوتا ہے، شفا اور صحت حاصل ہوتی ہے، اور دوسرے کو حاصل نہیں ہوتی۔ اگر کسی دوا ہی کا اثر ہوتا یا ڈاکٹر کی تدبیر ہی کی کرشمہ سازی ہوتی یا اس کی کسی کوشش کا دخل ہوتا، تو اس صورت میں ہر ایک کو شفا ملنی چاہیے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اسباب کسی کے حق میں کارگر ہوتے ہیں اور کسی کے حق میں نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتے ہیں فیصلہ کرتے ہیں، اللہ کی مدد ہی سے کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

## گا ہک کون بھیجتا ہے؟

تجارت کرتے ہیں، کماتے ہیں، بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ میں نے کمایا، میرے زور بازو سے یہ چیز حاصل کی ہے۔ بھائی! آپ نے کیا کیا؟ صرف ایک

دکان کھولی، ذاتی یا کرایے کی، اس میں کمپنی سے یا کسی اور بڑی دکان سے سامان لا کر رکھ دیا، گویا تجارت کے لیے جو اسباب ہونے چاہیے وہ آپ نے اختیار کر لیے۔ لیکن گاہک کون بھیجتا ہے؟ خریدنے والوں کے دل میں کون ڈالتا ہے کہ وہ آپ کی دکان پر آ کر خریداری کریں؟ بیشک وہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ اس میں آپ کے ان اسباب و وسائل کو کوئی دخل نہیں ہے۔

## کرشمہ قدرت کا:

ہم نے ایسے منظر بہت دیکھے اور آپ بھی دیکھتے ہوں گے کہ دو دکانیں ہیں، جیسے فرسان والوں کی دکانیں، نو ساری میں کسی زمانہ میں ایک دکان کا فرسان (ﷺ) مشہور تھا، اس کے پڑوس میں دوسری دکان بھی فرسان (ﷺ) کی تھی، اس کے پاس بھی ہو بہو اسی طرح کا مال ہوتا تھا؛ لیکن پہلی دکان پر بھیڑ لگی ہوتی تھی، اس کو فرصت نہیں ہے۔ اور دوسری دکان پر ایک بھی گاہک نہیں ہے۔ گاہک کے دل میں ڈالنا کہ اسی کی دکان سے خریدے، یہ کس کا کام ہے؟ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے!!! کوئی یوں نہ سمجھے کہ یہ میرا کمال ہے۔

## تائید بخشندہ خدائے بخشنده:

کوئی طالب علم یوں نہ سمجھے کہ میری محنت سے ہوا۔ کیوں کہ جس طرح وہ رات بھر جاگا ہے، اسی طرح دوسرے بھی رات بھر جاگے ہیں، انہوں نے بھی کتاب کا مطالعہ کیا ہے، انہوں نے بھی امتحان کے لیے ویسی ہی تیاری کی ہے، جیسی اس نے کی؛ بلکہ وہ اس سے زیادہ بیدار رہے ہیں، اور زیادہ محنت کی ہے؛ لیکن ان کو اتنے مارکس اور اتنے نمبر نہیں ملے جتنے اس کو ملے ہیں۔ یہ جو کچھ بھی ہوا، وہ اللہ کی مدد سے، اللہ کے کرم اور فضل سے ہوا۔

## پھر کبر پیدائے ہوگا:

گویا اللہ تعالیٰ نے یہاں لفظ **نصر اللہ** بڑھایا، تو اصل تو فتح آئی ہے؛ لیکن فتح کیسے آئی؟ اللہ کی مدد سے۔ اللہ تعالیٰ نے اس لفظ کا اضافہ کر کے ہم لوگوں کو یہ سبق دیا ہے کہ کسی بھی میدان میں آپ کو جب بھی کامیابی حاصل ہوگی، تو اس کامیابی میں اصل چیز اللہ کی مدد اور اس کا فضل و کرم ہے۔ جب بھی کوئی کامیابی حاصل ہوگی آپ کے کسی زور بازو کو، آپ کی کسی تدبیر کو، آپ کی کسی محنت کو اور آپ کے کسی کمال کو اس میں دخل نہیں ہے۔ یہ بات آپ ہمیشہ اپنے ذہن میں بٹھائے رکھیے۔ جب آدمی یہ بات اپنے دل و دماغ میں بٹھائے رکھے گا، تو اس کی نظر اللہ پر ہوگی کہ میرے کام بنانے والا تو اللہ ہے۔ اور پھر اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ کبر پیدا نہیں ہوگا۔ پھر وہ اللہ کا شکر ادا کرے گا کہ اللہ تیرا شکر ہے تو نے مجھے اس چیز میں کامیابی عطا فرمائی۔ بہر حال! ہمیں پہلا سبق یہ دیا گیا کہ ہر کامیابی کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی مدد ہے۔ اس لیے یہاں لفظ **نصر اللہ** کو پہلے لایا گیا۔

## کامیابی کے بعد دو کام کرے:

(۲) دوسرا سبق اور حکمت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ آدمی کو کامیابی عطا فرمائے، تو کامیابی کے بعد اس کو کیا کرنا چاہیے؟ **فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا** (آپ اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کیجیے۔ اور اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی مانگیے) کامیابی کے بعد یہ دو کام کرنے ہیں: (۱) اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرنی ہے۔ گویا اس نعمت کے ملنے پر اللہ کی تعریف کی جائے گی، اللہ کا شکر ادا کرو کہ اللہ تیرا احسان ہے کہ تو نے مجھے اس میں کامیابی عطا فرمائی۔ اگر تیری طرف سے اس میں کامیابی نہ ڈالی

جاتی، تو میری تدبیر کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ لہذا شکر ادا کرو۔

## شیطان کبر کی راہ سے برباد کرتا ہے:

شکر کی طرف کیوں متوجہ کیا گیا؟ اس لیے کہ آدمی جب شکر ادا کرے گا تو تکبر سے بچے گا، کیوں کہ انسان کو جب کسی میدان یا شعبہ میں کامیابی حاصل ہوتی ہے، تو پہلے اس میں اکڑ اور غرور پیدا ہوتا ہے کہ میری محنت و کوشش سے، میرے زور و بازو سے میں نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ سے نظر ہٹ جائے گی اور آدمی کبر میں مبتلا ہوگا، اور شیطان اسی کبر کی راہ سے اس کو برباد کر دے گا۔ اس کے بجائے اگر شکر ادا کرے گا کہ اللہ تیرا شکر اور احسان ہے کہ تو نے مجھے محض اپنے فضل سے یہ چیز عطا فرمائی، اس میں میری کسی سعی کو دخل نہیں ہے، تو اس صورت میں کبر پیدا نہیں ہوگا۔

دیکھیے! فتح مکہ کے موقع پر کیا ہوا؟ بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوتے وقت اپنی اونٹنی پر سوار تھے، پیچھے آپ ﷺ کے لاڈلے حضرت اسامہ بن زیدؓ بیٹھے ہوئے تھے اور آپ ﷺ سورہ فتح کی ابتدائی آیتیں: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ﴿١﴾ لِيُغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا (الفتح: ۱-۲) بڑے ترنم کے ساتھ پڑھ رہے تھے، اور آپ ﷺ کی گردن جھکی ہوئی تھی، اتنی جھکی ہوئی کہ آپ کی داڑھی مبارک کجاوے کی لکڑی کے ساتھ لگ رہی تھی۔ (قدمر تخریجہ ص: ۱۳۳)

## جس نے زحمت کھا کر پھول برسائے:

حالاں کہ دنیا کا دستور یہ ہے کہ جب کوئی بادشاہ کوئی ملک فتح کرتا ہے تو بڑی اکڑ



کے ساتھ سینہ تان کر اس آبادی میں داخل ہوتا ہے۔ اور اس آبادی میں رہنے والوں کے ساتھ بھی ظلم و زیادتی کا معاملہ کرتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے دنیا کے بادشاہوں کا یہ وطیرہ اور طریقہ بتلایا ہے: إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعْنَاقَ أَهْلِهَا آذِنَةً. (النمل: ۳۳) (دنیا کے بادشاہوں کا حال یہ ہے کہ جب وہ کسی آبادی میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں، تو اس آبادی کو برباد کر ڈالتے ہیں اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر ڈالتے ہیں)

نبی کریم ﷺ کا کیا حال تھا؟ آپ ﷺ بغیر کسی تکبر کے، بغیر کسی اکڑ کے، بغیر سینہ تانے؛ بلکہ اپنے سر کو جھکائے ہوئے پوری تواضع، عجز و انکساری کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں اور یہ آبادی بھی کون سی؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ۱۳ رسال تک خود نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کو ظلم و ستم کی چکی میں پیسا تھا۔ ظلم و زیادتی کی کوئی شکل ایسی نہیں تھی جو انہوں نے چھوڑی ہو، ہر طرح سے ستایا تھا۔ اور پھر مکہ سے جانے کے بعد بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ دوسرا کوئی ہوتا تو پتا نہیں کتنی خون کی ندیاں بہا دیتا؛ لیکن آپ ﷺ نے ایسا کچھ نہیں کیا حالاں کہ حرم تو امن کی جگہ ہے، وَمَنْ دَخَلَ كَانَ آمِنًا. (ال عمران: ۹۷) جو اس میں داخل ہو گیا مامون ہو گیا، اس کو کوئی چھیڑ نہیں سکتا؛ لیکن اس روز اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خون بہانے کی اجازت دی تھی۔

## رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز:

چنانچہ فتح مکہ کے بعد نبی کریم ﷺ نے جو خطبہ دیا تھا، اس میں یہ بات فرمائی تھی کہ جس دن سے اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے اس دن سے مکہ کو حرمت والا

بنایا ہے، اس میں کسی کا خون بہانا کسی کے لیے جائز نہیں؛ البتہ میرے لیے اللہ تعالیٰ نے دن کے ایک حصہ (یعنی جس دن مکہ فتح ہوا، اس دن صبح سے لے کر شام تک) میں اس کو حلال کیا تھا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملی تھی۔ <sup>(۱)</sup> پھر بھی آپ ﷺ نے ایسی تدبیر کی تھی کہ مقابلہ اور خون بہانے کی نوبت نہ آئے، اور مکہ والوں کو پتا چلے بغیر آپ ﷺ وہاں پہنچ جائیں، تاکہ اچانک پہنچے ہوئے اس لشکر کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے مکہ والے اپنے آپ کو سپرد کر دیں اور قتل و قتل کی نوبت نہ آنے پائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔ نیز ان سے کوئی بدلہ بھی نہیں لیا؛ آپ ﷺ کعبہ میں تشریف لے گئے، باہر نکل کر کعبۃ اللہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا، اور اس کے بعد آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ آپ مجھ سے کیا امید رکھتے ہو؟ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ تو اس کے جواب میں ان لوگوں نے کہا: **أَخْ كَرِيمٌ وَابْنُ أَخْ كَرِيمٍ** (شریف بھائی ہیں، اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں) ہم آپ سے اچھی ہی امید رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تم سے وہی کہوں گا جو حضرت یوسفؑ نے کہا تھا: قَالَ لَا تَثْرِيْبُ عَلَیْكُمْ الْیَوْمَ اِذْ هَبُوا انْتُمْ الطُّلُقَاءُ (یوسف: ۹۲) (آج تم پر کوئی سرزنش نہیں) (قدمر تخریجہ: ۱۳۶) جب کہ دنیا کا دستور یہ ہے کہ کوئی کسی کو معاف بھی کر دے، تو اس کا دماغ ٹھیک کرنے کے لیے دو چار سخت جملے تو سنا ہی دیتا ہے۔ اور حضور ﷺ کوئی سرزنش نہیں کر رہے ہیں، کوئی ٹوننگ نہیں، اسی کا نتیجہ تھا کہ تمام مکہ والے اسی وقت ایمان لے آئے۔ ۱۳ سال کی محنت میں اتنی بڑی تعداد میں ایمان نہیں لائے تھے؛ لیکن آپ ﷺ کے ان اخلاق کو دیکھ کر ان سب نے ایمان قبول کر لیا تھا۔

(۱) أخرجه البخاري برقم: ۱۰۴۰.

## ترا مال و نعمت فزايد ز شكر:

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ کہہ کر یہ سبق دیا گیا کہ جب اللہ کی کوئی نعمت حاصل ہو تو اس پر اللہ کی حمد و ثنا اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ **اللهم لك الحمد كله ولك الشكر كله**، تیری ہی تعریف ہے، تیرا ہی شکر ہے۔

اور شکر کی وجہ سے فائدہ ہی فائدہ ہے، دنیا کا بھی فائدہ ہے اور آخرت کا بھی فائدہ ہے۔ دنیا کا فائدہ یہ ہے کہ شکر کی وجہ سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے، قرآن پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ**۔ (ابراہیم: ۷) (اگر تم میری نعمتوں کا شکر ادا کرو گے، تو میں اس میں زیادتی کروں گا، اور اگر ناشکری کی تو میرا عذاب بہت سخت ہے) آپ کو اللہ تعالیٰ نے تندرستی دی، جب یہ تصور کرو تو فوراً اللہ کا شکر ادا کرو کہ اللہ تیرا شکر و احسان ہے، تو نے ہمیں تندرستی عطا فرمائی۔ تیرا شکر و احسان ہے کہ تو نے اہل و عیال عطا فرمائے۔ تیرا شکر و احسان ہے تو نے ہمیں گھر عطا فرمایا۔ تیرا شکر و احسان ہے کہ تو نے عافیت والی روزی عطا فرمائی۔ جس موقع پر جو بھی نعمت یاد آوے اللہ کی تعریف بیان کریں۔ صبح میں گھر سے نکلے، باہر جانا ہے، سواری مل گئی تو **الحمد لله، اللهم لك الحمد كله ولك الشكر كله** منزل پر بروقت پہنچ گئے، تو **الحمد لله، اللهم لك الحمد كله ولك الشكر كله** ہر واپس آئے، گھر میں داخل ہوتے ہی گھر والوں کو امن و امان میں دیکھا، کسی کو کوئی پر اہلم (Problem) نہیں ہے، کوئی پریشانی نہیں ہے، سب صحت مند ہیں، تو **الحمد لله، اللهم لك الحمد كله ولك الشكر كله** اس سے بڑی نعمت اور کیا ہے؟ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ آئے تو دیکھا کہ بچہ بیمار ہے، بیوی بیمار ہے، اور یہ دیکھ کر آپ کو اچانک

جھٹکا لگتا۔ لہذا ہر موقع پر اللہ کا شکر ادا کیجیے۔ اس شکر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نعمت میں اضافہ فرماتے ہیں، یہ تو دنیا کا فائدہ ہے۔

## بدست آوری دولتِ جاوداں:

آخرت کا فائدہ یہ ہے کہ شکر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آدمی کو جنت میں داخل فرمائیں گے۔ شکر کی وجہ سے آدمی شیطان کے حملہ سے محفوظ رہتا ہے۔ جیسا کہ گذر چکا نعمت کے ملنے پر شیطان تو انسان کا ذہن یہ بناتا ہے کہ یہ نعمت تیرے زورِ بازو سے، تیری محنت سے، تیری تدبیر اور کوششوں سے تجھے حاصل ہوئی؛ لیکن جب شکر ادا کرے گا تو شیطان کبر میں مبتلا کرنے کے لیے جو ذہن بنا سکتا تھا وہ نہیں بنے گا۔ شیطان کے حملہ سے بچ جائے گا۔

## نفسِ مجرب شکرِ خدا بر میار:

دیکھیے! شیطان کا بڑا حملہ اسی پر ہوتا ہے کہ آدمی اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کرے۔ قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ نہ کرنے کی بنا پر جب اپنی بارگاہ سے مردود کیا، تو اس نے اللہ کے سامنے قسم کھا کر کہا تھا: لَا تَتَّبِعُنِي مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ. (الاعراف: ۱۷) (میں آدم کی اولاد کو گمراہ کرنے کے لیے ان کے سامنے سے، ان کے پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے آؤں گا) اور میرے اس حملہ کا نتیجہ کیا ہوگا؟ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ. (الاعراف: ۱۷) (ان میں سے اکثر کو تو شکر گزار نہیں پائے گا) شیطان کا سب سے پہلا حملہ یہی ہوتا ہے کہ وہ آدمی کو شکر سے دور رکھتا ہے۔

## ہماری حالت:

ہماری حالت بھی عجیب ہے، جب پریشانی ہوتی ہے، تو دعائیں کرتے ہیں کہ اللہ! یوں ہو جائے، یوں ہو جائے۔ کہیں سفر میں جا رہے ہیں، تو دعائیں کرتے ہیں: اے اللہ! ٹرین مل جائے، ٹرین میں اچھی جگہ مل جائے۔ اب ٹرین بھی مل گئی، جگہ بھی مل گئی؛ لیکن زبان پر شکر کا لفظ نہیں آتا۔ پھر آگے کا سوچتے ہیں، ٹرین وقت پر پہنچ جائے، میں وہاں اتر جاؤں، میرا کام ہو جائے۔ اپنی سب حاجتیں تو مانگتے رہتے ہیں؛ لیکن جوں جوں حاجتیں پوری ہوتی جاتی ہیں، اس پر جو شکر ہونا چاہیے وہ ہم نہیں کر رہے ہیں۔ حالاں کہ جس طرح حاجتیں مانگیں، ہر حاجت کے پورا ہونے پر اللہ کا شکر بھی ادا کرنا چاہیے؛ لیکن شیطان شکر ادا کرنے نہیں دیتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم دیا تھا: اَعْمَلُوا اِلَّا دَاوُدَ شُكْرًا ۚ وَ قَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ۔ (سبأ: ۱۳) (اے داؤد کے گھرانے والو!) (یا خود حضرت داؤد کو حکم دیا جا رہا ہے) کہ آپ شکر کرو، اور میرے بندوں میں شکر کرنے والے بہت کم ہیں۔ شکر بہت کم ادا کیا جاتا ہے۔ انسان کا مزاج ہی یہ ہے کہ اس کو سو (۱۰۰) نعمتیں ملی ہوں، اور ایک نہ ملی ہو، تو جو نہیں ملی ہے اسی کو پکڑے رکھے گا۔ اور کسی کے سامنے بھی اسی کا تذکرہ کرے گا۔

## ذرا سب خراب آگیا ہے.....!!!

حضرت مولانا سید میاں اصغر حسینؒ ہمارے اکابر میں سے ہیں، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان کے گھر گیا تو حضرت کو بخار تھا۔ میں نے کہا: حضرت کیا

حال ہے؟ فرمانے لگے: الحمد للہ! میری آنکھیں سلامت ہیں، دیکھنے کا کام کر رہی ہیں۔ کان سلامت ہیں، سننے کا کام کر رہے ہیں۔ میری زبان سلامت ہے، بولنے کا کام کر رہی ہے۔ میرے ہاتھ ٹھیک ہیں۔ میرے پاؤں ٹھیک ہیں۔ دیر تک گنواتے رہے۔ پھر فرمایا: بس! ذرا سا بخار آ گیا ہے۔ ہم نعمتوں کو نہیں دیکھتے۔ جو چیز نہیں ملی ہے اسی کو پکڑ کر بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ ہمارا ناشکری والا مزاج ہے۔

ایک آدمی کو آپ نے گلاس میں پانی دیا، وہ پورا بھرا ہوا نہیں ہے، آدھا ہے۔ تو جو شکروالے مزاج کا ہوگا وہ کہے گا: الحمد للہ! آدھا گلاس پانی مل گیا۔ اور جو ناشکری والا ہوگا وہ کہے گا: یہ آدھا تو خالی ہے!!! اس کی نظر خالی پر جائے گی۔ اور جو شکروالے مزاج والا ہوگا اس کی نظر بھرے ہوئے حصہ پر جائے گی۔

## بخار بھی نعمت ہے..... کیسے؟

یہ بخار بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اس بخار کی وجہ سے تمہارے سب بچے ارد گرد آ کر بیٹھ گئے، دوستوں کے فون آرہے ہیں کہ بھائی! کیا ہوا؟ سنا ہے کہ آپ کو بخار ہو گیا ہے ہم آپ کے لیے دعا کرتے ہیں۔ لوگ خیریت پوچھتے ہیں۔ اس بخار سے تو آپ کو پتا چل گیا کہ کون کون آپ سے محبت کرتا ہے؟ دنیا میں کتنے لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں، اب تک آپ کو اس کا اندازہ نہیں تھا، لیکن اس بخار نے آپ کو یہ سب بتلا دیا!!! تو یہ کوئی مصیبت نہیں؛ بلکہ ایک نعمت ہے۔

## تو چاہتا تو.....:

حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تعریف فرمائی ہے:

اِنَّكَ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا۔ (الاسراء: ۳۰) (وہ شکر گزار بندے تھے) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جب آپ کھانا کھاتے تھے، تو یوں کہتے تھے: اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے کھانا دیا، تو چاہتا تو بھوکا بھی مار سکتا تھا۔ جب پانی پیتے تو یوں کہتے تھے: اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے سیراب کیا، تو چاہتا تو پیاسا بھی رکھ سکتا تھا۔ جب لباس پہنتے تو کہتے تھے: اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے لباس عطا فرمایا، تو چاہتا تو ننگا بھی رکھ سکتا تھا۔ اور جوتے پہنتے تو کہتے: اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے جوتے عطا فرمائے، تو چاہتا تو ننگے پیر بھی رکھ سکتا تھا۔ گویا ہر چیز پر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔ اس شکر کا فائدہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ شکر کی وجہ سے میں نعمتوں میں اضافہ کروں گا۔ تو آدمی کو چاہیے کہ ہر وقت شکر ادا کرنے کا اہتمام کرے۔

## پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا:

فتح آنے پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی کہا جا رہا ہے کہ شکر ادا کرو، اور اپنے گناہوں کی معافی مانگو، استغفار کرو۔ اب دیکھیے! شکر ادا کرنا اور معافی مانگنا دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ جب آپ ﷺ کی بعثت ہوئی تو جزیرۃ العرب کا کیا حال تھا؟ جہالت میں پڑے ہوئے تھے، گناہوں کے عادی تھے، قتل و غارت گری کے عادی تھے، شراب اور زنا کے عادی تھے۔ کون سی برائی تھی جو ان میں نہ تھی۔ اسی لیے جب آپ ﷺ پر پہلی وحی آئی اور اس کی وجہ سے آپ ﷺ پر جو ذمہ داری آئی تو آپ اس ذمہ داری سے ڈر رہے تھے۔ حضور ﷺ نے آکر حضرت خدیجہؓ سے کہا: اِنِّیْ اَخَافُ عَلٰی نَفْسِیْ مجھے اندیشہ معلوم ہوتا ہے۔ حضرت گنگوہیؒ اس جملہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اندیشہ یہ تھا کہ اس قوم کو سدھارنے کی اتنی بڑی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر ڈالی گئی ہے

اور اس قوم کا تو یہ حال ہے!!! میں کیسے اس ذمہ داری کو پورا کر سکوں گا؟ آپ ﷺ ڈر رہے تھے۔<sup>(۱)</sup> لیکن اللہ تعالیٰ نے سب کروایا۔ ۲۳ سال کے بعد نبی کریم ﷺ دنیا سے جا رہے ہیں تو پورے جزیرۃ العرب کی کایا پلٹ گئی تھی۔ جو بری بری عادتیں ان میں تھیں وہ ساری چھوٹ چکی تھیں۔ شراب کے بڑے عادی تھے، حالاں کہ شراب کی لت ایسی لت ہے جیسے کسی کو تمباکو کھانے کی یا گلکھا کھانے کی لت پڑ جائے تو آسانی سے چھوٹی نہیں ہے، شراب کا حال بھی ایسا ہی ہے، جلدی سے چھوٹی نہیں ہے؛ لیکن نبی کریم ﷺ کی تربیت کا نتیجہ یہ تھا کہ جب شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا تو۔ سورہ فاتحہ کی تفسیر میں بتلا چکا ہوں کہ۔ اس وقت لوگ ایک مکان میں بیٹھ کر شراب پی رہے تھے، مجلس لگی ہوئی تھی، ہاتھ میں جام ہے، اور باہر اعلان ہوا کہ شراب حرام کر دی گئی ہے، حضرت انسؓ جو وہاں موجود تھے، خدمت کر رہے تھے، ان سے لوگوں نے کہا کہ دیکھو باہر کیا اعلان ہو رہا ہے؟ انہوں نے آکر کہا کہ حضور ﷺ کا اعلان کرنے والا اعلان کر رہا ہے کہ شراب حرام کر دی گئی ہے، تو جس کے ہاتھ میں جام تھا وہ ہاتھ میں ہی رہ گیا، ہونٹ کے قریب تھا اس کو بھی ہٹا لیا، اور جو شراب کے مٹکے بھرے ہوئے تھے اسی وقت توڑ دیے گئے، اور مدینہ منورہ کی گلیوں میں شراب بہنے لگی۔<sup>(۲)</sup> یہ نبی کریم ﷺ کا کوئی معمولی کارنامہ تھا؟ نہیں۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو حکم فرما رہے ہیں: فسبح بحمد ربک گویا آپ ﷺ کو یہ نہیں سوچنا ہے کہ میں نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے، آپ اللہ کی تسبیح اس کی حمد کے ساتھ بیان کیجیے۔

(۱) لامع الدراری ۱/۵-۶ (ط: المكتبة الرشیدیة، سہارنپور، یوپی)۔

(۲) أخرجه البخاری برقم: ۲۳۳۲ ومسلم برقم: ۱۹۸۰۔



## استغفار کیوں.....؟؟؟

وَاسْتَغْفِرْهُ: استغفار کیجیے۔ آدمی کوئی گناہ کرے تو اس پر استغفار ہوتا ہے، حضور ﷺ سے۔ نعوذ باللہ۔ کیا غلطی ہوئی تھی؟ پھر بھی آپ ﷺ کو استغفار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے: فرماتے ہیں کہ جب نماز ختم ہوتی تو نبی کریم ﷺ سلام پھیرتے اور زور سے اللہ اکبر کہتے تو مجھے پتا چل جاتا کہ نماز مکمل ہو چکی۔<sup>(۱)</sup> اور حضرت ثوبانؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نماز کے بعد تین مرتبہ استغفر اللہ! استغفر اللہ! استغفر اللہ! پڑھتے تھے۔<sup>(۲)</sup> نماز پڑھنے کے بعد استغفر اللہ! کہا جا رہا ہے! قرآن کریم میں ہے:

كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ الْإِنسَانِ مَا يَهْتَجُونَ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ. (الذريت: ۱۷، ۱۸)

رات میں بہت کم سوتے ہیں، اور جب رات کا آخری حصہ آتا ہے تو اپنے گناہوں سے استغفار کرتے ہیں۔ رات بھر تو نماز پڑھتے رہے، کوئی گناہ کا کام تھوڑا کیا تھا؟ پھر بھی وہ استغفار کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ کی توفیق سے نماز پڑھی ہے؛ لیکن آدمی کو یوں سمجھنا چاہیے کہ نماز کا جو حق ہمیں ادا کرنا چاہیے تھا وہ ہم سے ادا نہیں ہوا۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز ملائکہ کہیں گے: ما عبدناک حق عبادتک (ہم نے تیری عبادت جیسی کرنی چاہیے ویسی نہیں کی)<sup>(۳)</sup> اسی لیے عبادات کے آخر میں استغفار ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ افطار کے وقت پڑھتے تھے: یا واسع المغفرة اغفر لی (اے معاف کرنے والے! میرے گناہوں کو معاف کر

(۱) صحیح البخاری: ۸۴۱ و ۸۴۲۔

(۲) صحیح مسلم: ۵۹۱۔

(۳) أخرجه الحاكم في المستدرک: ۴/۲۲۹ [۸۷۳۹] (ط: دار الكتب العلمية، بيروت)۔

دے) (۱) عام طور پر عبادات کے آخر میں استغفار رکھا گیا ہے، وہ اسی لیے کہ جو ذمہ داری ہم پر ڈالی گئی تھی ہو سکتا ہے کہ اس کی ادائیگی میں ہم سے کوتاہی ہوئی ہو۔

بہر حال! اللہ تعالیٰ جب کسی نعمت سے نوازے تو آدمی کو دو کام کرنے چاہیے:

(۱) اللہ کی حمد و ثناء بیان کرتے ہوئے اس کا شکر ادا کرنا ہے۔

(۲) استغفار کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(۱) شعب الإيمان للبيهقي: ۴۰۷/۵ [۳۶۲۰] (ط: مكتبة الرشد، ممبای، الهند).

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورہ لہب

(مؤرخہ ۱۷ شوال المکرم ۱۴۳۹ مطابق ۳۰ جون ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الْحَمْدُ لِلَّهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ  
بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ  
أَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ  
وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ أَرْسَلَهُ إِلَى  
كَافَّةِ النَّاسِ بِشِيرٍ أَوْ نَذِيرٍ أَوْ دَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَ  
عَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا. آمَنَّا بِعُد.

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ. بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ.

تَبَّتْ يُدَا أَبَى لَهَبٍ وَتَبَّ ۚ مَآ أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ ۚ وَمَا كَسَبَ ۚ سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ

لَهَبٍ ۚ وَامْرَأَتُهُ ۚ حَمَّالَةَ الْخَطَبِ ۚ فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ ۚ

## لہب کے معنی:

یہ سورہ لہب ہے، لہب عربی زبان میں بھڑکتے ہوئے شعلہ کو کہتے ہیں۔ لفظ لہب

اس سورت میں دو جگہ آیا ہے، اسی مناسبت سے اس کا نام سورہ لہب رکھا گیا ہے۔

## ترجمہ سورہ لہب:

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ (ابولہب کے دونوں ہاتھ برباد ہوں، اور وہ خود بھی ہلاک ہو چکا)

[تَبَّ - يَتَبُّ تَبًّا وَتَبًّا کے معنی ہیں ہلاک ہونا، برباد ہونا]

مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَ مَا كَسَبَ (اس کی دولت اور اس کی کمائی نے اس کو کچھ فائدہ نہیں پہنچایا، کچھ کام نہیں دیا)

سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (وہ بھڑکتے ہوئے شعلوں والی آگ میں داخل ہوگا)  
وَأَمْرَأَتُهُ حَبَّالَةَ الْخَطَبِ (اور اس کی بیوی بھی (اسی بھڑکتے ہوئے شعلوں والی آگ میں داخل ہوگی) ایسی حالت میں کہ وہ لکڑیاں اٹھائے ہوئے ہوگی)  
فِي جِيدٍهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ (اس کی گردن میں کھجور کی چھال کی رسی یا مضبوطی ہوئی رسی ہوگی)

## شان نزول:

در اصل اس سورت کے شان نزول کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ نبی کریم ﷺ کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو اسلام، توحید و رسالت کی دعوت کا حکم ملا۔ قرآن پاک کی آیت کریمہ **وانذر عشیرتک الاقربین و رهطک منهم المخلصین** (آپ اپنے قریبی رشتہ داروں اور خاص طور پر اپنی جماعت، اپنے کنبہ کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے) نازل ہوئی۔ **ورھطک منهم المخلصین** پہلے تھی، بعد میں اس کی تلاوت منسوخ ہوئی، البتہ مفہوم اب بھی باقی ہے۔ چنانچہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی، نبی کریم ﷺ کو ہ صفا پر تشریف

لے گئے (اُس وقت مستقل پہاڑی ہی کی طرح تھی، آج کل تو وہ دود یواروں کے درمیان محصور ہے) اور وہاں جا کر آپ ﷺ نے آواز لگائی **یا صباحا**! عربوں میں آپس میں بڑی عداوتیں ہوا کرتی تھیں، اور ایک قبیلہ اچانک رات کے اندھیرے میں کسی پر حملہ کر کے اس کو نقصان پہنچاتا تھا، قتل و غارت گری ہوا کرتی تھی۔ کب کس پر چڑھ آئے؟ اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی تھی۔ ایسے موقع پر جب کسی قبیلہ کے کسی فرد کو یہ معلوم ہوتا کہ میرے قبیلے کے خلاف دشمن قبیلہ چڑھائی کر کے آرہا ہے تو۔ اس زمانے میں ٹیلیفون یا آج کل آگاہ کرنے کے لیے اور خبر دینے کے لیے جو آلات ہوتے ہیں وہ تو تھے نہیں۔ وہ آدمی اپنے قبیلہ کو خبر کرنے، آگاہ کرنے، اس کا مقابلہ کرنے اور اس کا جواب دینے کے واسطے بلند جگہ پر چڑھ جاتا تھا اور آواز لگاتا تھا **یا صباحا**! اس کی آواز کوسن کر لوگ جمع ہو جاتے تھے، اور پھر اس شخص کو جو خبر دینی ہوتی، وہ دیا کرتا تھا۔

### یا صباحا:

نبی کریم ﷺ پر جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: وَإِنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (اے نبی! آپ اپنے قریبی خاندان والوں، رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے) کہ اگر وہ ایمان نہیں لائے، اپنے کفر و شرک سے توبہ نہیں کی، اللہ تعالیٰ کی توحید اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کا اقرار نہیں کیا، تو اللہ تعالیٰ کا سخت عذاب ان کو پہنچے گا۔ آپ ان کو بتلائیے۔ چنانچہ آیت کے نزول کے بعد نبی کریم ﷺ نے اپنے خاندان والوں کو جمع کرنے کے لیے اسی طرح کوہ صفا پر چڑھ کر آواز لگائی **یا صباحا**! اور پھر عمومی اور خصوصی انداز میں سب کو پکارا۔ عمومی انداز میں، جیسے: **یا بنی ہاشم! یا بنی عبدالمطلب! یا بنی**

فہر! یابنی لؤی! یابنی عبد مناف! اس طرح خاندانوں کا نام لے لے کر پکارا۔ اور اسی طرح قریش کے دیگر قبائل کو بھی نام لے کر پکارا۔ اور پھر افراد کے بھی نام لیے۔ یاعباس بن عبد المطلب! یاحمزة بن عبد المطلب! یاصفیه بنت عبد المطلب! اپنی پھوپھی اور اپنی صاحب زادی حضرت فاطمہؓ کا نام لیا۔ اور خصوصی، انفرادی، شخصی اعتبار سے بھی خطاب کیا۔ چناں چہ لوگ جمع ہو گئے۔ اس زمانہ کے دستور کے مطابق اگر کوئی شخص کسی وجہ سے خود حاضر نہ ہو سکتا، تو حالات معلوم کرنے کے لیے وہ اپنا نمائندہ بھیج دیتا تھا، چناں چہ سب لوگ جمع ہو گئے۔ جو لوگ آپ کے سامنے کھڑے تھے ان کو یہ نہیں معلوم کہ آپ ﷺ جس پہاڑی (صفا) پر کھڑے ہیں، اس کے پیچھے کیا ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے ان سے سوال کیا کہ بتلاؤ! اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑی کے دامن میں، پیچھے ایک لشکر ہے جو صبح یا شام تم پر حملہ کرنے والا ہے، تو کیا تم میری بات کو مانو گے؟ اس کو سچا سمجھو گے؟ تو لوگوں نے جواب میں کہا کہ ہاں! آج تک ہم نے کبھی آپ پر جھوٹ کا تجربہ نہیں کیا، یا آپ کو کبھی جھوٹا نہیں پایا۔ لہذا اگر آپ ایسی بات کہیں گے، تو ہم مان لیں گے۔ ان سے یہ اقرار کرانے کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں تم کو اللہ کے سخت عذاب سے ڈراتا ہوں۔ آپ کا اللہ کے سخت عذاب سے ڈرانے کا مطلب یہ تھا کہ تم جس کفر و شرک میں مبتلا ہو، اپنے آپ کو اس سے نکالو، توبہ کرو اور توحید و رسالت کا اقرار کرو۔ اگر کفر اور شرک نہیں چھوڑو گے، تو اللہ کا سخت عذاب تم پر آئے گا۔ آپ ﷺ نے یہ بات فرمائی۔

## ابولہب کون تھا.....؟؟؟

اس مجمع میں آپ ﷺ کا چچا ابولہب بھی تھا۔ (نبی کریم ﷺ کے دادا عبد المطلب کے

گیارہ (۱۱) بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک حضرت عبداللہ تھے، جو نبی کریم ﷺ کے والد بزرگوار ہوتے ہیں۔ اور بقیہ دس آپ ﷺ کے چچا تھے۔ ان میں سے ایک کا نام عبدالعزیٰ تھا۔ عزیٰ یہ اس بت کا نام ہے جس کی وہ لوگ پوجا کیا کرتے تھے، اسی کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس کا نام عبدالعزیٰ رکھا گیا تھا۔ جیسے اللہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے عبداللہ، عبدالرحمن نام رکھتے ہیں۔ اور اس کی کنیت اور لقب ابولہب تھا) لہب بھڑکتے ہوئے شعلہ کو کہتے ہیں۔ وہ بڑا حسین و جمیل تھا، اس کا چہرہ ایک دم سرخ و سفید تھا، سفیدی میں ایسی سرخی تھی جیسا کہ شعلہ بھڑک رہا ہو۔ اسی خوب صورتی کی وجہ سے اس کو ابولہب کا یہ لقب اور کنیت دی گئی تھی، اور اسی نام سے وہ مشہور تھا۔ وہ بڑا مالدار بھی تھا۔ قریش اور مکہ مکرمہ کے بڑے مالداروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس کی بیوی کا نام ارویٰ تھا۔ اس کی کنیت ام جمیل تھی، وہ ابوسفیان کی بہن ہوتی ہے۔

## ہر مؤمن کی دلی خواہش:

بہر حال! جس وقت آپ ﷺ نے اس بات (توحید و رسالت) کی دعوت پیش فرمائی، تو اس مجمع میں ابولہب بھی موجود تھا۔ یہ سن کر وہ بول پڑا: تَبَالُک سَائِرِ الْیَوْمِ الْہَذَا جمعنا؟ یا اَلْہَذَا دعوتنا؟ (تمہارے لیے ہمیشہ ہلاکت اور بربادی ہو، کیا اس کام کے لیے ہم کو یہاں بلایا تھا؟ اور جمع کیا تھا؟) اس نے تَبَالُک سے بددعا یہ جملہ کہا۔ اتنا ہی نہیں اس نے پتھر لے کر نبی کریم ﷺ کو مارا، اور اس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کی ایڑی مبارک زخمی ہو کر خون آلود ہوئی۔ جب حضور ﷺ کو اس نے یہ جملہ کہا، تو اس موقع پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے یہ سورت نازل ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اگر حضور ﷺ کو کوئی بددعا دے، تو ہر مؤمن کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کے جواب میں ہم اس کو بددعا دیں، گو یا ہر مؤمن

Copyright © <http://www.muftiahmedkhanpuri.com>



میں وہ میلہ ختم ہو جاتا تھا۔ منیٰ بازار کی اصطلاح اسی سے قائم ہوئی ہے۔ حج کے موقع پر تمام لوگ عرب کے قبائل سے آیا کرتے تھے، اس موقع پر نبی کریم ﷺ آنے والوں کو دعوتِ اسلام پیش کرنے کے لیے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس میلے میں تشریف لے جاتے تھے۔ میلے میں خرید و فروخت ہوتی تھی، آنے والے لوگ مال لے کر آتے تھے، فروخت کرتے تھے اور اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتے تھے، کچھ شعر و شاعری بھی ہوتی تھی۔ وقت گزاری کے لیے شعر و شاعری کے مقابلے بھی ہوتے تھے۔ تو حضور اکرم ﷺ ان آنے والوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کرتے تھے۔ تو حضرت طارق فرماتے ہیں: میں نے ذوالحجاز کے بازار میں ایک شخص کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو کہہ رہا ہے: **قُولُوا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ تَفْلَحُوا**۔ (اے لوگو! لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہو، کامیاب ہو جاؤ گے) تو ان کے پیچھے پیچھے ایک آدمی چلتا تھا اور کہتا تھا کہ۔ نعوذ باللہ۔ یہ جھوٹا ہے، پاگل ہے، اس کی بات کی طرف دھیان مت دو، اور وہ پتھر بھی مارتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اس دعوت دینے والے کے ٹخنوں اور ایڑی کے اوپر کے پٹھوں کو لہو لہان کر دیا تھا۔ انہوں نے معلوم کیا، تو پتہ چلا کہ یہ دعوت دینے والے آپ ﷺ ہیں اور پتھر مارنے والا نبی کریم ﷺ کا چچا ابولہب ہے، جو آپ ﷺ کے ساتھ اس طرح گستاخی کر رہا ہے۔ اس کی عادت تھی کہ جہاں جہاں حضور ﷺ لوگوں کو اسلام کی دعوت پیش کرنے کے لیے مجموعوں میں جاتے تھے، تو یہ پیچھے پیچھے جا کر اس طرح کہتا تھا کہ اس کی بات کو مت سنو۔ نعوذ باللہ۔ یہ جھوٹے ہیں، پاگل ہیں، اور پھر پتھر بھی مارتا تھا۔ یہ اس کی حرکت تھی۔ (۱)

## ابولہب کی بیوی کا مشغلہ:

اس کی بیوی ام جمیل بھی اس برائی میں اس کا ساتھ دیا کرتی تھی۔ اس کی عادت یہ تھی کہ وہ بھول کی لکڑیاں کاٹ کر لاتی تھی، جس میں کانٹے ہوا کرتے تھے۔ اور رات کو جہاں نبی کریم ﷺ کا گزرنے کا راستہ ہوتا تھا، وہاں بچھا دیا کرتی تھی، تاکہ صبح آپ ﷺ کو وہ کانٹے چھیں۔ اسی پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے یہ سورت سنادی گئی۔<sup>(۱)</sup>

## مال، دولت اور اولاد:

اس سے بعض لوگوں نے کہا کہ محمد ﷺ جو کہہ رہے ہیں، اس کے مطابق اگر سچ میں عذاب آیا تو تجھے کون بچا پائے گا؟ چوں کہ وہ بڑا مالدار تھا تو کہا کرتا تھا کہ میں اپنے مال کے ذریعہ سے اپنے آپ کو اس عذاب سے چھڑالوں گا۔ اسی پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا: مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَ مَا كَسَبَ (کچھ کام نہیں آیا اس کا مال و دولت اور جو اس نے کمائی کی تھی)<sup>(۲)</sup> یہاں کمائی اور دولت کو الگ الگ ذکر کیا، حالاں کہ دولت خود کی کمائی ہی سے ہوتی ہے۔ تو اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ مال تو آدمی کو کبھی بغیر کمائے ہوئے وراثت میں بھی ملتا ہے، لوگ ہدیہ میں بھی دیتے ہیں؛ جب کہ کمائی وہ ہے جو آدمی نے اپنے زور بازو سے حاصل کی۔ اسی مال کو جب کاروبار میں لگائے گا اور اس سے جو نفع کمائے گا اس کو کمائی سے تعبیر کریں گے۔ اور بعض نے کمائی کا مصداق اس کی اولاد کو بھی بتلایا ہے۔<sup>(۳)</sup>

(۱) تفسیر الطبری و بحر العلوم للسمرقندی ۱/ ۲۳۲۔

(۲) تفسیر البغوي ۵/ ۳۲۷ (ط: دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

(۳) تفسیر عبدالرزاق الصنعانی و تفسیر الطبری سورة الہلب۔

جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تمہاری اولاد تمہاری کمائی میں سے ہے۔<sup>(۱)</sup> تو اس سے بعض نے اولاد مراد لی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کی دولت، اس کی اولاد اس کے کسی کام نہیں آئی، اللہ کے عذاب سے اس کو بچا نہیں سکی۔

## حمالة الحطب سے کیا مراد ہے.....؟؟؟

حَمَالَةُ الْحَطَبِ (اس کی بیوی لکڑیاں اٹھانے والی ہے) لکڑیاں کون سی؟  
(۱) ایک مطلب تو وہی ہے جو ابھی گزرا کہ وہ بول کی کانٹے دار لکڑیاں لاتی تھی اور رات کو نبی کریم ﷺ کے راستے میں بچھایا کرتی تھی۔ اس لیے اس کو حمالة الحطب سے تعبیر کیا ہے۔<sup>(۲)</sup>

(۲) بعض نے لکڑیوں سے جلانے کی لکڑیاں، سوختہ۔ جس کو گجراتی میں بھلہ کہتے ہیں۔ مراد لی ہیں۔ اس کا گھرانہ مالدار ہونے کے باوجود؛ یہاں اس کے غایت بخل کو بتلانا مقصود ہے کہ مالدار گھرانہ ہونے کی وجہ سے یہ جلانے کی لکڑیاں تو وہ آسانی سے خرید سکتے تھے؛ لیکن وہ اتنی بخیل اور خسیس طبیعت کی تھی کہ جلانے کی لکڑیاں خریدنے کے بجائے خود لینے جاتی تھی۔<sup>(۳)</sup>

(۳) بعض حضرات حمالة الحطب کا فارسی میں ”ہیزم کش“ ترجمہ کرتے ہیں، اور ”ہیزم کش“ فارسی میں چغلی کرنے والے کو کہتے ہیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے: تیل ڈالتا ہے، پیٹرول ڈالنے کا کام کرتا ہے، یعنی آپس میں لڑانے کا کام کرنا۔ چنانچہ لکڑیاں بول کر چغلی

(۱) أخرجه الترمذي برقم: ۱۳۵۸.

(۲) تفسير الطبري وبحر العلوم للسمرقندي: سورة اللهب.

(۳) تفسير عبدالرزاق الصنعاني وتفسير الطبري: سورة اللهب.

مراد لی گئی ہے۔ چوں کہ وہ حضور ﷺ اور صحابہ کی چغلیاں تکلیف پہنچانے والے دشمنوں کے سامنے کرتی تھی، اور آپس میں لڑاتی بھڑاتی تھی۔ (۱)

(۴) چوتھا مطلب یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ جب یہ جہنم میں داخل ہوگی، تو وہاں بھی جس آگ میں اس کا شوہر جل رہا ہے، اس میں لکڑیاں ڈالے گی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سے بطور عذاب یہی کام کروایا جائے گا۔ (۲)

## ام جمیل کی موت:

فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ (اس کی گردن میں کھجور کی چھال کی مضبوط بیٹی ہوئی رسی ہے) مسد بٹ کر مضبوطی کے ساتھ بنائی جانے والی کھجور کی رسی کو کہا جاتا ہے۔ جب وہ لکڑیاں لے کر آتی تھی، تو اسی رسی سے لکڑیوں کو باندھتی تھی، اور لکڑیاں باندھ کر اپنی پیشانی پر جیسے بوجھ اٹھانے والے مزدور بوجھ کی رسی کا آگے والا حصہ پیشانی پر لپیٹتے ہیں اس طرح اٹھا کر آتی تھی۔ اور یہی اس کا طریقہ تھا۔ ایک مرتبہ تھک گئی اور ایک پتھر پر بیٹھی تو اس کی وہ رسی پیشانی سے نیچے آگئی اور اسی میں اس کی گردن الجھ گئی اور اس کو پھندا لگ گیا اور اسی میں اس کی موت واقع ہوگئی۔ (۲)

## حضور ﷺ کی بیٹیوں کو طلاق:

ابولہب حضور ﷺ کا چچا ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کے والد حضرت عبد اللہ کا علاقائی بھائی ہے، یعنی ماں دونوں کی الگ الگ تھیں، باپ ایک تھے۔ جب یہ سورت نازل ہوئی تو اس

(۱) تفسیر الطبری: سورة الہب.

(۲) تفسیر البغوی: ۳۲۷/۵ (ط: دار احیاء التراث العربی، بیروت) و تفسیر ابن کثیر: سورة الہب.

(۲) تفسیر الطبری: سورة الہب.

وقت حضور ﷺ کی چار صاحب زادیاں تھیں: (۱) حضرت زینبؓ (بڑی صاحب زادی) ان کا نکاح نبی کریم ﷺ نے نبوت سے سرفراز ہونے سے قبل ابو العاص بن ربیع، جو حضرت زینبؓ کے خالہ زاد بھائی ہوتے ہیں، حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کی بہن کے بیٹے یعنی بھانجے کے ساتھ کروایا تھا۔ دوسری دو صاحب زادیوں (۲) رقیہؓ (۳) ام کلثومؓ، کا نکاح بھی نبوت ملنے سے پہلے ابولہب کے دو بیٹوں (۱) عتبہ اور (۲) عتیبہ سے کرایا تھا۔ ابھی رخصتی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اور آپ ﷺ پر وحی نازل ہونے کا سلسلہ شروع ہوا، اور آپ ﷺ نے دعوت اسلام دینا شروع کیا، تو ابولہب نے مخالفت کی اور اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ چنانچہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو ابولہب نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم ان کی بیٹیوں کو طلاق دے دو، ورنہ میرے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ ان دونوں لڑکوں نے نبی کریم ﷺ کی صاحب زادیوں کو طلاق دی۔<sup>(۱)</sup> بڑے لڑکے نے صرف طلاق دینے پر ہی اکتفا کیا، اور کوئی گستاخی والا معاملہ نہیں کیا۔ چھوٹے نے تو برا بھلا بھی کہا، حضور ﷺ کے چہرہ انور پر تھوکا اور آپ ﷺ کی صاحب زادی ام کلثومؓ کو طلاق دی۔ جب اس نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ گستاخانہ سلوک کیا، تو حضور ﷺ نے اس موقع پر بددعا یہ جملہ ارشاد فرمایا تھا: اللہم سلط علیہ کلباً من کلابک۔ (اے اللہ! تیرے درندوں میں ایک درندے کو تو اس پر مسلط کر دے) ابوطالب بھی موجود تھے، جب انہوں نے یہ بددعا

(۱) تاریخ الطبری: ۲/ ۴۶۷-۴۶۸ (ط: دار التراث، بیروت) والسیرة النبویة وأخبار الخلفاء لابن حبان:

۱/ ۷ (ط: دار الکتب الثقافیة، بیروت) والاستیعاب فی معرفة الأصحاب لابن عبد البر: ۴/ ۱۸۳۹ -

۱۸۴۱ و ۴/ ۱۹۵۲-۱۹۵۳ (ط: دار الجیل، بیروت)

سنی، تو ابوطالب نے اس سے کہا کہ اب تم ان کی بددعا سے نجات نہیں پاسکتے ہو۔ خود ابولہب بھی جانتا تھا کہ اب ان کی بددعا تو اپنا رنگ اور اثر دکھائے گی۔ چنانچہ یہ باپ بیٹے ڈرے سمہے رہتے تھے کہ پتہ نہیں کب اس بددعا کا اثر ظاہر ہو؟

## ان سے زیادہ سچا کوئی نہیں:

ایک مرتبہ شام کے علاقہ میں ایک سفر میں ابولہب اپنے اسی بیٹے کو قافلہ میں لے کر جا رہا تھا، ایک جگہ پر قیام ہوا تو ابولہب نے کہا: ان کی بددعا کی وجہ سے ہم کو ڈر ہے، کہیں کوئی آکر میرے بیٹے کو پھاڑ نہ کھائے، اس لیے تم ہمارا لحاظ کرتے ہوئے اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست کرو۔ چنانچہ قافلہ والوں نے سب کے سامان کا ڈھیر لگایا اور اس کے اوپر ابولہب کے بیٹے کو لٹایا، اور سامان کے ڈھیر کے چاروں طرف قافلہ والے لیٹ گئے۔ رات کو شیر آیا اور اس نے سب کو سونگھا، اس کے بعد چھلانگ لگا کر اوپر گیا اور اس کا سر بدن سے الگ کر دیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ رات کو ابھی سونے کی نوبت نہیں آئی تھی، اسی وقت شیر نے باہر سے آواز لگائی، دھاڑا، تو اس کے گرجنے کی آواز سن کر یہ کانپنے لگا، لوگوں نے کہا: ہم نے بھی آواز سنی جیسے تو نے سنی۔ تجھ پر اتنا زیادہ اثر کیوں ہے؟ تو اس نے کہا کہ مجھ کو محمد ﷺ کی بددعا کے جملے یاد آ رہے ہیں، اس روئے زمین پر، آسمان کے نیچے ان سے زیادہ سچا کوئی نہیں ہے۔ کھانے کا وقت آیا تو ڈر اور خوف کی وجہ سے اس کا ہاتھ آگے نہیں جا رہا تھا۔ اور رات کو یہی واقعہ پیش آیا کہ شیر نے آکر اس کو ختم کر دیا۔ حالاں کہ ان دونوں کو حضور ﷺ کی صداقت کا یقین تھا اس کے باوجود ایمان نہیں لائے۔<sup>(۱)</sup>

(۱) دلائل النبوة لأبي نعيم الأصبهاني: ۱/ ۴۵۴-۴۵۸ (ط: دار النفائس، بيروت) ودلائل النبوة لقوام السنة الأصبهاني: ۱/ ۴۰-۴۱ (ط: دار طيبة، الرياض).

## تین ہجرتیں:

اس کے بعد حضور ﷺ نے حضرت رقیہؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کیا اور وہ ان کے نکاح میں تھیں، اسی زمانے میں ان دونوں میاں بیوی حضرت عثمانؓ اور حضرت رقیہؓ نے حبشہ کی جانب ہجرت کی۔ ایک مرتبہ گئے، پھر وہاں افواہ پھیلی کہ مکہ والے سب مسلمان ہو گئے اور اب وہ مسلمانوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچاتے ہیں اس لیے اس افواہ کو سن کر بہت سے لوگ مکہ واپس آ گئے، یہاں آئے تو معلوم ہوا کہ سلسلہ جوں کا توں باقی ہے۔ پھر دوبارہ مکہ ہی سے حبشہ کی ہجرت کی، اور پھر حبشہ سے مدینہ کی بھی ہجرت کی۔ گویا تین ہجرتیں کیں، حبشہ کی دو، اور مدینہ کی ایک۔

## ذوالنورین:

جب حضور ﷺ غزوہ بدر کے لیے نکلے، اس وقت حضرت رقیہؓ بیمار تھیں، حضرت عثمانؓ بھی نکلنا چاہتے تھے؛ لیکن حضرت رقیہؓ کی تیمارداری کے لیے حضور ﷺ نے ان کو روک دیا کہ آپ مت آئیے، ان کی تیمارداری میں رہو۔ اُدھر اللہ تعالیٰ نے غزوہ بدر میں مسلمانوں کو کامیابی عطا فرمائی، اور جب حضرت زید بن حارثہؓ بشارت دینے کے لیے مدینہ پہنچے، تو انہوں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کی صاحب زادی حضرت رقیہؓ کو دفن کیا جا رہا ہے۔<sup>(۱)</sup> حضرت رقیہؓ کے انتقال کے بعد حضور ﷺ نے اپنی دوسری صاحب زادی حضرت ام کلثومؓ کو بھی حضرت عثمانؓ کے نکاح میں دیا۔ اور فرمایا کہ پہلی بیٹی کو بھی اللہ کے حکم سے ہی ان کے

(۱) الاستیعاب فی معرفة الأصحاب: ۴/ ۱۸۳ (ط: دار الجیل، بیروت)۔

نکاح میں دیا تھا اور دوسری بیٹی کو بھی اللہ ہی کے حکم سے دیا ہے۔ پھر ۸/۹ھ میں حضرت ام کلثومؓ کا انتقال ہوا، اس موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا: اگر میری تیسری بیٹی بغیر نکاح کے ہوتی تو اس کو بھی ان کے نکاح میں دیتا۔<sup>(۱)</sup> حضور ﷺ کی دو بیٹیاں حضرت عثمانؓ کے نکاح میں تھیں، اس لیے حضرت عثمانؓ کو ذوالنورین کہتے ہیں۔ گویا حضور ﷺ کی ہر صاحب زادی ایک نور ہے، تو حضرت عثمانؓ دونوں والے ہوئے۔ یہ حضرت عثمانؓ کی خصوصیت ہے۔ آخری صاحب زادی حضرت فاطمہؓ کو تو حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کے نکاح میں دیا تھا۔ اس طرح ابولہب کے کہنے سے بیٹوں نے حضور ﷺ کی صاحب زادیوں کو طلاق دی۔

## ابولہب کا عبرت ناک انجام:

حضور ﷺ اور مسلمان ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے، ۲ھ میں غزوہ بدر پیش آیا۔ ابولہب کو بھی اس میں شریک ہونا تھا، مگر مارے ڈر کے شریک نہیں ہوا، اور اپنی جگہ ابو جہل کے بھائی کو رقم دے کر بھیجا۔ ادھر غزوہ بدر ختم ہوا، اس کے بعد چند ہی دنوں میں اس کو چچک کی بیماری لگ گئی۔ عربوں میں وہم پرستی تھی، جس کی وجہ سے وہ یوں سمجھتے تھے کہ چچک کی بیماری والے شخص کے پاس جو کوئی جاتا ہے اس کو بھی چچک کی بیماری لگ جاتی ہے۔ اس لیے اس کو بھی جب یہ بیماری لگی تو گھر والوں نے اپنے رہائشی گھر سے اس کو دوسرے گھر میں ڈال دیا۔ اور وہاں کوئی نہیں جاتا تھا، چند دنوں میں پورے جسم پر وہ بیماری

(۱) المعجم الكبير للطبرانی: ۱۸۴ / ۱۷ (ط: مكتبة ابن تيمية، القاهرة) وتاريخ دمشق لابن عساكر: ۳۹ / ۴۴ - ۴۷ (ط: دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع)



پھیل گئی، اسی میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ مرنے کے بعد اس کی لاش اسی مکان میں ویسی ہی پڑی رہی، بد بو آنے لگی تو لوگوں نے اس کے بیٹوں کو عار دلانی کہ تمہارا باپ مر گیا تو بھی خبر نہیں لیتے؟ انہوں نے ایک حبشی غلام کو پیسے دے کر تیار کیا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ اس نے ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اس کی لاش کو بٹھا دیا، پھر سب نے دور ہی سے اس کو پتھر مارے، اتنے پتھر مارے کہ وہ اسی میں دفن ہو گیا۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک گڑھا کھودا گیا اور لکڑی کے ذریعہ سے اس کی لاش کو اندر ڈالا گیا اور اوپر پتھر ڈال کر اس کو اسی طرح دفن کیا گیا۔ اس طرح ذلت اور رسوائی کے ساتھ اس کی موت آئی۔<sup>(۱)</sup>

## وہ مجھے نہیں دیکھ سکے گی:

حضور ﷺ مکہ میں تھے اور یہ سورت نازل ہوئی تھی، جب یہ سورت نازل ہوئی تو ابولہب کی بیوی ام جمیل کو پتہ چلا کہ ایسی سورت نازل ہوئی ہے، تو وہ حضور ﷺ کو بہت برا بھلا کہتی تھی، گالیاں دیتی تھی۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ ایسی سورت نازل ہوئی تو وہ آپ ﷺ کے پاس گالیاں دیتی ہوئی پتھر لے کر آئی، آپ ﷺ حرم میں بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابوبکرؓ بھی پاس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! وہ گالیاں دیتے ہوئے اور پتھر لیے ہوئے آرہی ہے۔ آپ کو مارے گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: گھبراؤ مت! وہ مجھے نہیں دیکھ سکے گی۔ چنانچہ جب وہ قریب آئی تو حضرت ابوبکرؓ سے پوچھتی ہے: تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟ حالاں کہ حضور ﷺ وہیں موجود تھے۔ انہوں نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں !!! اور کہا اگر میں ان کو پالوں گی، تو یہ پتھر ان کے منہ پر

(۱) المعجم الكبير للطبراني: ۱/۳۰۸ [۹۱۲]۔

ماروں گی، اور کہا: سن لو! میں شاعرہ ہوں۔ (۱)

## میں مذمّم نہیں، محمد ہوں:

اور اس نے یہ اشعار کہے۔۔۔۔۔

مُذَمَّمًا عَصَيْنَا وَأَمْرَهُ أَتَيْنَا وَدِينَهُ قَلِينَا

ترجمہ: ہم نے مذمّم کی نافرمانی کی، اور ہم نے ان کے حکم کو قبول کرنے سے انکار کیا، اور ہم نے ان کے دین سے دشمنی کی۔ وہ یہ شعر پڑھتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔  
**قلی - یقلی** اس کے معنی دشمنی کرنا ہیں۔ جیسے قرآن میں ہے: مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَى۔

نبی کریم ﷺ کو مکہ والے بجائے محمد کے -نعوذ باللہ- مذمّم کہتے تھے۔ تو وہ بھی یہ بولتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ محمد کا ترجمہ ہوتا ہے قابل تعریف، اور مذمّم کا ترجمہ ہوتا ہے قابل مذمت، برائی کیا جانے والا۔ دیکھیے! حضور ﷺ ان کے مذمّم بولنے پر ناراض نہیں ہوتے تھے؛ بلکہ حضور ﷺ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا کرم ہے کہ ان کی گالیوں کو اللہ تعالیٰ نے یوں ہی میرے اوپر سے ہٹا دیا۔ اس لیے کہ وہ لوگ جب بھی حضور ﷺ کو برا بھلا کہتے تھے، تو حضور ﷺ کے نام میں محمد نہیں بولتے تھے؛ بلکہ مذمّم بولتے تھے۔ تو حضور ﷺ فرماتے کہ وہ تو مذمّم کو برا بھلا کہتے ہیں، اور میں تو مذمّم ہوں نہیں!!! میرا نام تو محمد ہے!!! کتنی آسانی اور سادگی کے ساتھ حضور ﷺ نے اس کو حل کر دیا!!! ذرا بھی برا نہ لگا، اور معاملہ ختم ہو گیا۔ (۲)

(۱) سیرۃ ابن ہشام: ۱/۳۵۶ (ط: مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر)

(۲) سیرۃ ابن ہشام: ۱/۳۵۶ (ط: مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر)

## میں نے اللہ سے ان دونوں کو مانگ لیا ہے:

فتح مکہ کے موقع پر حضور ﷺ نے حضرت عباسؓ سے کہا: تم اپنے بھتیجوں کو میرے پاس نہیں لاتے؟۔ ابولہب کا ایک بیٹا عتیبہ تو مارا گیا تھا، دوسرا عتبہ تھا، اور تیسرا معتبہ تھا۔ آپ نے فرمایا: ان کو لے آؤ! حضرت عباسؓ ان کو تلاش کرنے کے لیے نکلے، وہ بھاگ کر عرفات چلے گئے تھے، حضرت عباسؓ ان کو لائے، وہ آئے، اور ایمان قبول کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میں نے اللہ تعالیٰ سے ان دونوں کو مانگ لیا ہے۔ (۱) حضور ﷺ کی شفقت دیکھو! جس آدمی نے آپ ﷺ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا تھا ان کی اولاد کے ساتھ یہ سلوک! حضور ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر لوگوں کو بلا بلا کر ایمان کی دعوت دی۔ حضرت ابوبکرؓ کے والد جن کا نام عثمان تھا، ابوقافہ کنیت تھی۔ ان کو دعوت دی، تو وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح اور بہت سارے وہ لوگ جو تکلیفیں پہنچاتے تھے، ان کو بلا کر اپنے سامنے بٹھاتے تھے اور دعوتِ اسلام پیش کرتے تھے۔ یہ حضور ﷺ کی رحمت اور شفقت کا معاملہ ہے۔ (۲)

## ابولہب کی کنیت کیوں.....؟؟؟

ایک سوال یہ ہے کہ ابولہب کی کنیت کیوں لی گئی؟ اس کا نام کیوں نہیں لیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا نام عبدالعزیٰ تھا۔ چوں کہ اس میں بت کی طرف نسبت ہوتی

(۱) الطبقات الكبرى لابن سعد: ۴/۴۲-۴۵ [۳۵۵ و ۳۵۶] (ط: دار الکتب العلمیہ، بیروت).

(۲) أخرجه ابن حبان فی الموارد برقم: ۱۷۰۰ (ط: دار الکتب العلمیہ، بیروت) وابن هشام فی

سيرته: ۲/۴۰۵-۴۰۶ (ط: مطبعة مصطفى البابي الحلبي) و الحاكم فی المستدرک: ۳/۲۸

(ط: دار الکتب العلمیہ، بیروت) وغیرہم.

تھی، اس لیے اس نام کو قرآن میں ذکر کرنا مناسب نہیں تھا، اس لیے ابولہب کنیت بولا گیا۔  
پھر ابولہب میں اس بات کی طرف اشارہ بھی تھا کہ وہ بھڑکنے والی آگ میں داخل ہوگا۔

## درس عبرت:

اس سورت میں بڑی عبرت بھی ہے۔ ایک مَا آغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ بھی ہے۔  
بہت سے لوگ اپنے مال کے غرور اور گھمنڈ میں حق کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں، اور  
اللہ کے مقبول بندوں کو ستاتے ہیں۔ جیسا کہ ابولہب نے انکار کیا تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ حق  
ہے، اور حضور ﷺ جو اللہ کے مقرب تھے ان کو ستایا۔ تو اس میں یہ عبرت ہے کہ مال کی وجہ  
سے ایسے کام نہیں کرنے چاہیے، مال کسی کام آنے والا نہیں ہے۔  
اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق عطا فرمائے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورۃ اخلاص

(مؤرخہ: ۱۷ شوال المکرم ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰ جون ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ  
بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرٍ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاَتٍ اَعْمَالِنَا وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرٍ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاَتٍ  
اَعْمَالِنَا مَنْ یَّہْدِہٖ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُضِلّْہٗ فَلَا هَادِیَ لَہٗ وَ نَشْہَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ  
وَ حْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْہَدُ اَنْ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ اَرْسَلْہٗ اِلَی  
کَافَّةِ النَّاسِ بِشَیْرٍ اَوْ نَذِیْرٍ اَوْ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرِّ اَجَامُنِیْرٍ اَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ  
عَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَ بَارَکَ وَ سَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ۔

أعوذ بالله من الشیطن الرجیم۔ بسم الله الرحمن الرحیم۔

قُلْ هُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۝ اللّٰہُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ یَلِدْ ۙ وَ لَمْ یُولَدْ ۙ وَ لَمْ یَكُنْ لَہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝

یہ سورۃ اخلاص ہے، اس میں چار آیتیں ہیں۔ اور رائج قول کے مطابق مکہ مکرمہ  
میں نازل ہوئی ہے۔ جس وقت اللہ تبارک و تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا تو  
پورے عرب؛ بلکہ پوری دنیا میں لوگ بت پرستی میں مبتلا تھے، اپنے ہاتھوں سے بتوں کو  
بناتے تھے، پتھر کے بت، لکڑی کے بت اور دیگر اشیاء کے، اور پھر انہی کی عبادت کرتے  
تھے، انہی کو اپنا حاجت روا اور کارساز سمجھتے تھے۔ ایسے ماحول میں نبی کریم ﷺ نے آ کر  
لوگوں کو ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دی۔

## عقیدہ توحید:

توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو توحید کی طرف بلایا اور کہا: ایک اللہ کی عبادت کرو، اسی کی اطاعت و فرماں برداری کرو، اسی کے احکام کو اپناؤ۔ چنانچہ وہ لوگ جس ماحول میں تھے، اس اعتبار سے ان میں سے بعض کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اور ان لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات عالی کے متعلق کچھ ناروا اور نامناسب سوالات کیے۔

## شان نزول:

(۱) دو آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، اور انھوں نے سوال کیا کہ آپ جس خدا کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں۔ نعوذ باللہ۔ وہ کس سے بنا ہے؟ سونے سے؟ چاندی سے؟ لوہے سے؟ لکڑی سے؟ تو ان کے اسی سوال کے جواب میں یہ سورت اللہ تبارک و تعالیٰ نے نازل فرمائی۔ (۱) اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اپنا تعارف کرایا ہے۔

(۲) بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے اللہ تبارک و تعالیٰ کے حسب و نسب کے متعلق سوال کیا۔ دنیا میں ہم جب کسی آدمی کا تعارف اور پہچان کرنا چاہتے ہیں، تو پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو؟ تمہارا باپ کون ہے؟ تمہارا خاندان کیا ہے؟ چنانچہ بعض لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات عالی کے متعلق اسی

(۱) أخرجه أبو الشيخ في العظمة عن أنس رضي الله عنه ۱/ ۳۴۰ [۸۶] (ط: دار العاصمة، الرياض)

طرح کے سوال کیے۔ اس کے جواب میں اللہ تبارک تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ (۱)

## واحد اور احد میں فرق:

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ.

اے نبی! آپ کہہ دیجیے! ان لوگوں کو بتلائیے! کہ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے ایک ہے۔ یہاں **اللہ احد** کہا۔ حضرات مفسرین اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ لفظ **واحد** استعمال نہیں کیا، لفظ **احد** استعمال کیا، بظاہر لفظ **واحد** اور **احد** میں ہمیں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا؛ لیکن حضرات مفسرین لکھتے ہیں کہ لفظ **”واحد“** اثنین، **ثلاثة** اور **اربعة**، دو، تین، چار کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ ایک سے مافوق تمام اعداد کے مقابلہ میں واحد یعنی ایک بولا جاتا ہے۔ اور **احد** اس ذات کے لیے بولا جاتا ہے، جس کا کوئی جز نہ ہو۔ (۲) بعض مرتبہ کوئی چیز ایک تو ہوتی ہے؛ لیکن وہ مختلف اجزاء سے بنی ہوئی ہوتی ہے۔ جیسے کرسی ہے، اس کے پائے ہیں، دستہ ہے، بیٹھنے کی جگہ ہے، پیچھے ٹیک لگانے کی جگہ ہے، کئی چیزوں، اجزاء اور پارٹس (parts) کے مجموعہ سے تیار ہوئی ہے۔ تو یہ **واحد** تو ہے؛ لیکن اس کو **احد** نہیں کہیں گے۔ **احد** اسی کو کہیں گے جس کا کوئی جز نہ ہو، جو بسیط ہو۔ تو اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے لفظ **احد** استعمال کیا، گویا اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے ایک ہے۔ وہ لوگ تو کئی معبودوں کے قائل تھے۔ وہ تو ہیں ہی نہیں؛ لیکن اللہ کی ذات کی وحدانیت ایسی ہے کہ اس کا کوئی

(۱) أخرجه الترمذي في سننه برقم: ۳۳۶۲ (ط: مصطفى البابي الحلبي، مصر) و البخاري في

التاريخ الكبير: ۱/ ۲۴۵ [۷۷۸] (ط: دائرة المعارف العثمانية، حيدرآباد، دکن).

(۲) النهاية في غريب الحديث والأثر لابن الأثير: ۱/ ۲۷ (ط: دار المكتبة العلمية، بيروت).

جز بھی نہیں ہے، اجزاء سے بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات پاک اور منزہ ہے۔

## عربی زبان میں مترادف نہیں:

اللہ الصمد

عام طور پر **الصمد** کا ترجمہ بے نیاز کرتے ہیں، لیکن حضرت مولانا مفتی محمد تقی

عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ بے نیاز والا ترجمہ **صمد** کے مفہوم کو ادا کرنے کے

لیے کافی نہیں ہے۔ عربی زبان ایسی عجیب و غریب زبان ہے کہ اس کے کلمات جس مفہوم کو ادا

کرتے ہیں، اس مفہوم کو مکمل طور پر ادا کرنے کے لیے بسا اوقات ہماری اردو زبان میں کوئی

ایک لفظ نہیں ہوتا۔ اسی لیے بعض حضرات تو فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں کوئی مترادف (ہم

معنی لفظ synonym) نہیں ہے۔ دو لفظ ہیں، لوگ تو یوں سمجھتے ہیں کہ جو مطلب اس کا ہے

وہی مطلب دوسرے کلمہ کا بھی ہے، دونوں کلمے بظاہر ایک مفہوم اور معنی کو ادا کرتے ہیں؛

لیکن جب ان کے مفہوم میں غور کیا جاتا ہے، تو ہر ایک کے مفہوم میں کوئی ایک بات ایسی ہوتی

ہے، جو دوسرے میں نہیں پائی جاتی۔ کوئی بھی کلمہ دوسرے کلمہ کے ساتھ من کل الوجوہ مترادف

نہیں ہوتا۔ مترادف ایسے کلمے کو کہتے ہیں کہ دوسرا کلمہ اسی مفہوم اور اسی مطلب کو ہو بہو ادا کرتا

ہو، چنانچہ عربی کے ہر کلمہ میں کچھ ایسی بات ہوتی ہے جو دوسرے میں نہیں ہوتی۔ لیکن اس

پہلو کو چھوڑ کر لوگ اکثری اعتبار سے مترادف کہتے ہیں؛ لیکن حقیقتہً وہ مترادف نہیں۔

## صمد کا معنی:

آگے لفظ **صمد** مذکور ہے، **صمد** عربی زبان میں ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ تمام

مخلوقات اپنی ضرورتوں میں اس کی محتاج ہوں اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ دونوں باتیں ہیں:



وہ کسی کا محتاج نہیں، اور سب اس کے محتاج ہیں۔ اب حضرت مفتی تقی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ جب ہم ترجمہ کرتے ہیں بے نیاز، تو بے نیاز کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں؛ لیکن ”سب اس کے محتاج ہیں“ وہ معنی اس ترجمہ میں نہیں آیا۔ گویا لفظ بے نیاز سے جب لفظ **صمد** کا ترجمہ کیا جائے گا، تو کلمہ **صمد** کا جو مفہوم ہے وہ پورے طور پر ادا نہیں ہوتا؛ بلکہ اس میں کمی رہ جاتی ہے۔ اور یہاں وہی بتلانا مقصود ہے کہ تمام مخلوقات اپنی تمام ضرورتوں میں اللہ تعالیٰ کی محتاج ہیں اور اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت مفتی تقی صاحب دامت برکاتہم اس کا ترجمہ اسی طرح کرتے ہیں: اللہ ہی ایسا ہے کہ سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔<sup>(۱)</sup> یہاں **الصمد** کا ترجمہ انہوں نے بے نیاز نہیں کیا؛ بلکہ کلمہ **الصمد** کا مقصود ادا کیا۔ تو اس میں ان لوگوں کا جواب آ گیا کہ اللہ تعالیٰ نہ تو سونے سے بنے ہیں، نہ تو چاندی سے بنے ہیں۔ اس لیے کہ اگر کوئی چیز سونے سے بنتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سونا پہلے وجود میں آیا، اور وہ چیز اپنے بننے میں سونے کی محتاج ہے۔ اگر چاندی سے بنی ہوئی ہے، تو گویا پہلے چاندی کا وجود ہوا، اور وہ چیز جو چاندی سے بنی ہے اپنے بننے میں، اپنے وجود میں چاندی کی محتاج ہے۔ تو احتیاج ثابت ہوئی، اور اللہ تعالیٰ کی ذات تو بے نیاز ہے!!! گویا اللہ کسی کا محتاج نہیں، اور سب چیزیں اس کی محتاج ہیں یہ کہہ کر دونوں طرف سے ایسا مفہوم بتلایا گیا کہ اب اس کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو انہوں نے قائم کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کس سے بنے ہیں؟ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

(۱) توضیح القرآن آسان ترجمہ قرآن از حضرت عثمانی دامت برکاتہم۔

## نہ جنا، نہ جنا گیا:

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ.

نہ اللہ نے کسی کو جنا، یعنی نہ اللہ کی کوئی اولاد ہے ولہ یولد نہ اللہ جنا گیا، یعنی اللہ کسی کی اولاد نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی بھی اولاد نہیں۔ جو سوال کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا حسب و نسب کیا ہے؟ اللہ کا نسب بتلاؤ۔ ان کے باپ کون ہیں؟ دادا کون ہیں؟ تو کہا: اللہ تعالیٰ کسی سے پیدا ہی نہیں ہوئے۔ اب عربوں میں یا بعض اور دینوں میں کسی کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا جاتا ہے، جیسے خود عرب کے لوگ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ تو لہ یلد (اللہ نے کسی کو نہیں جنا) سے اس کی نفی ہو گئی۔ یا جیسے عیسائی ہیں، حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں، لہ یلد کہہ کر اس کی بھی نفی ہو گئی۔ اور اسی طریقے سے یہودی حضرت عزیر علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں، اس کی بھی نفی ہو گئی۔ اللہ نے کسی کو نہیں جنا۔

وَلَمْ يُولَدْ (اور نہ وہ کسی سے جنا گیا) تو اس سے ان لوگوں کی الوہیت کی بھی نفی ہو گئی، جب یہ لوگ دوسروں سے پیدا ہوئے ہیں، تو وہ معبود اور خدا نہیں بن سکتے۔

## اس کا ہمسر کوئی نہیں:

وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ (اور کوئی بھی اس کے جوڑ کا اور ہم سر نہیں ہے)

کفو اس کو کہتے ہیں کہ دو شخصیتوں کا اپنے کمالات و اوصاف میں ایک دوسرے کے برابر ہونا۔ کوئی کسی چیز میں کسی سے کم نہ ہو۔ اس عالم میں اور کائنات میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی برابری کا دعویٰ کر سکے۔ گویا کوئی اللہ کے جوڑ اور برابری کا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان تنہا

اور یکتا ہے۔ کسی صفت و خوبی اور کمال میں کوئی اللہ کے مشابہ نہیں ہو سکتا، اس کی نفی ہو گئی۔  
 دو چیزیں خاص طور پر ہیں: احادیث اور صمدیت۔ اللہ اکیلا ہے اور کوئی اس کے  
 مشابہ نہیں ہے، کوئی اس جیسا نہیں ہے، کسی میں وہ کمالات نہیں ہیں جو اللہ کے اندر ہیں، اللہ  
 کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، اللہ ہی عبادت کے لائق ہیں۔ اور **صمد** کا مطلب یہ  
 ہے کہ سب لوگ اس کے محتاج ہیں اور اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ اور اخیر میں کوئی  
 اس کا ہم سر نہیں ہے کہہ کر اس کفو کی بھی نفی کر دی ہے۔ اس طرح اس سورت میں اللہ تبارک و  
 تعالیٰ کے وہ صفات اور کمالات بیان کیے گئے ہیں کہ کوئی دوسرا اس میں اللہ تعالیٰ کا شریک  
 اور سا جھے دار نہیں ہے، اسی معنی کر کے اس کو سورہٴ اخلاص سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

## فضائل سورہٴ اخلاص:

اور اس سورت کے بڑے فضائل ہیں، اب سورہٴ اخلاص کے فضائل کے سلسلہ میں  
 جو روایات وارد ہوئی ہیں، ان کو میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

## تہائی قرآن کے برابر:

(۱) حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے دوسرے سے قل  
 ہو اللہ احد سنی، پڑھنے والا اس کو بار بار پڑھ رہا تھا۔ جب صبح ہوئی تو یہ (سننے والا) نبیؐ  
 کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آپ ﷺ سے عرض کیا کہ فلاں شخص رات کو بار  
 بار سورہٴ قل ہو اللہ احد پڑھ رہا تھا۔ اور پوچھنے والے کا بیان کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ  
 اس کے اس بار بار پڑھنے والے عمل کو کم اور معمولی سمجھ رہا تھا، اس لیے اس نے ایسے انداز  
 سے بیان کیا تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک یہ سورت تہائی قرآن کے برابر

ہے، یعنی اس کے پڑھنے پر تہائی قرآن پڑھنے کا ثواب ملے گا۔ گویا سائل کا مقصد تو کچھ اور تھا، وہ تو یوں سمجھتا تھا کہ یہ بار بار کیوں پڑھ رہا ہے؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے اس کا یہ اجر و ثواب بتلا کر کے اس کی اہمیت کو اجاگر کیا۔<sup>(۱)</sup>

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت مسلم شریف میں ہے: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہیں تہائی قرآن پڑھ کر سناتا ہوں۔ صحابہؓ کو جمع کر کے آپ ﷺ نے یہ بات فرمائی تھی، اور اس کے بعد آپ ﷺ نے سورۃ قل ہو اللہ احد پوری پڑھ کر سنائی۔<sup>(۲)</sup> گویا یہ تہائی قرآن کے برابر ہے۔ اسی لیے ہمارے یہاں عام طور پر ایصال ثواب میں آسان تدبیر ہے کہ تین مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر اس کا ثواب میت کو پہنچایا جاتا ہے۔ تین مرتبہ پڑھنے سے حکماً، فضیلت کے اعتبار سے پورے قرآن کا ثواب مل جاتا ہے۔

## اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرماتے ہیں:

(۳) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ یہ بھی مسلم شریف کی روایت ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ نے ایک فوجی دستہ بھیجا، اور ایک آدمی کو اس کا امیر بنایا۔ یہ آدمی جب بھی نماز پڑھتا تھا، تو ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد کوئی سورت پڑھنے کے بعد پھر قل ہو اللہ احد بھی پڑھتا تھا۔ گویا سورۃ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورت ملانے کو کافی نہیں سمجھا، اور ہر رکعت میں قل ہو اللہ احد بھی ضرور ملاتا تھا۔ اب یہ لوگ جب واپس آئے تو نبی کریم ﷺ سے لوگوں نے اس کا تذکرہ کیا تو آپ ﷺ نے اس آدمی سے پوچھا: تم ایسا کیوں کرتے تھے؟ اس نے جواب

(۱) أخرجه البخاري برقم: ۵۰۱۳.

(۲) أخرجه مسلم برقم: ۸۱۲.

میں کہا: اس میں رحمن کی صفات بیان کی گئی ہیں، اس لیے میں اس سورت کو بہت محبوب جانتا ہوں کہ اس کو پڑھوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اسے بتا دو کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرماتے ہیں۔<sup>(۱)</sup>

(۴) ترمذی شریف کی روایت ہے، حضرت انسؓ نے یہ روایت بیان کی اور یوں کہا کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں قل هو اللہ احد سے محبت کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس سورت سے تیری جو محبت ہے اس نے تجھے جنت میں داخل کر دیا۔<sup>(۲)</sup>

(۵) حضرت کلثوم بن ہدمؓ جن کے گھر میں نبی کریم ﷺ نے قیام فرمایا تھا، ہجرت فرما کر جب آپ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے، تو آپ ﷺ کا پہلا قیام ۱۴ روز تک قبا میں رہا، تو قبا میں حضور ﷺ نے ان کے گھر میں قیام فرمایا تھا۔ اور وہ قبا والوں کے امام تھے، جب نماز پڑھاتے تو سورہ فاتحہ کے بعد کوئی سورت پڑھنے کے بعد پھر قل هو اللہ احد پڑھتے۔ تو لوگوں نے کہا: تم یہ سورت (قل هو اللہ احد) پڑھتے ہو تو اسی کو پڑھو، دوسری سورت نہ پڑھو۔ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ تم کو اگر میری امامت منظور ہے تو ٹھیک، میں تو اسی طرح پڑھوں گا، ورنہ میں الگ ہو جاتا ہوں۔ اور وہ ایسی شخصیت تھی کہ لوگ ان کی امامت چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ تو لوگوں نے پھر نبی کریم ﷺ سے شکایت کی کہ یہ ایسا کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے ان سے پوچھا، تو انہوں نے وہی جواب دیا: مجھے اس سورت کے ساتھ محبت ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ تو نبی کریم ﷺ

(۱) أخرجه مسلم برقم: ۸۱۳.

(۲) أخرجه البخاري تعليقا في باب الجمع بين السورتين والترمذي برقم: ۲۹۰۱.

نے فرمایا: تمہاری اس محبت نے تم کو جنت میں داخل کر دیا۔<sup>(۱)</sup>

## جنت میں دو محل:

(۶) حضرت سعید بن المسیبؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس نے دس مرتبہ قل هو اللہ احد پڑھ لی، اس کے لیے جنت میں ایک محل بنا دیا جائے گا، اور جس نے بیس مرتبہ پڑھ لی اس کے لیے جنت میں دو محل بنا دیے جائیں گے۔ اور جس نے تیس مرتبہ پڑھی اس کے لیے جنت میں تین محل بنا دیے جائیں گے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ کی قسم! اس صورت میں تو ہم دس دس مرتبہ یہ سورت پڑھ کر اپنے لیے بہت زیادہ محل بنالیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ بہت بڑا داتا ہے۔ جتنا عمل کرو گے اس کے پاس اس سے بہت زیادہ انعام ہے۔ یعنی اللہ کے خزانے میں کوئی کمی نہیں، تم جتنے چاہو اپنے لیے محل بنالو۔<sup>(۲)</sup>

## جنت واجب ہو گئی:

(۷) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک آدمی کو سورہ قل ہو اللہ احد پڑھتے ہوئے سن لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے لیے واجب ہو گئی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں: میں نے پوچھا: کیا واجب ہوا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: جنت

(۱) أخرجه الترمذي برقم: ۲۹۰۱.

(۲) أخرجه الدارمي برقم: ۳۲۷۲، وهو حديث مرسل (ط: دار المغني للنشر والتوزيع، المملكة العربية السعودية).

واجب ہوگئی۔ (۱)

بہر حال! اس سورت کے بڑے فضائل و مناقب ہیں۔ اس لیے اس کے پڑھنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ روزانہ کم سے کم ایک تسبیح اس کی اگر پڑھ لیں تو اس سے۔ ان شاء اللہ۔ بڑا اجر و ثواب ہمارے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا۔

اس مختصر سی سورت میں اللہ تعالیٰ کے لیے خالص توحید کو ثابت کیا گیا ہے، اس لیے اس کو سورہٴ اخلاص سے تعبیر کیا جاتا ہے۔  
اللہ تعالیٰ ہم سب کو توحیدِ خالص کی نعمت سے مالا مال فرمائے۔

(۱) أخرجه الترمذي برقم: ۸۸۹.

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورہ فلق

(مؤرخہ ۲۲ جمادی الثانی ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۰ مارچ ۲۰۱۸ء شب یکشنبہ)

(قط-۱)

الْحَمْدُ لِلَّهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ  
بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ  
أَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ  
وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ أَرْسَلَهُ إِلَى  
كَافَّةِ النَّاسِ بِشِيرَاوَنَذِيرٍ أَوْذَاعِيًّا إِلَى اللَّهِ بِأَذْنِهِ وَسِرَاجًا مُبِينٍ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَ  
عَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا. أَمَّا بَعْدُ.

فَاعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ. بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ.

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴿١﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿٢﴾ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ ﴿٣﴾ وَمِنْ  
شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ ﴿٤﴾ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ﴿٥﴾.

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ. قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿١﴾ مَلِكِ النَّاسِ ﴿٢﴾ إِلَهِ النَّاسِ ﴿٣﴾ مِنْ  
شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ﴿٤﴾ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ﴿٥﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿٦﴾.

## معوذتین:

یہ قرآن پاک کی آخری دو سورتیں ہیں، سورہ فلق اور سورہ ناس۔ ان کو معوذتین

بھی کہتے ہیں۔



معوذتین، واو کی تشدید اور واو کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے گا یعنی آدمی کو اللہ کی پناہ دلانے والی، ان کو پڑھے گا، تو اللہ تعالیٰ آدمی کو اپنی پناہ میں لے لیتے ہیں۔ معوذہ، وہ جس کو پناہ دی جاتی ہے، تو عام طور پر اردو میں معوذتین بولتے ہیں اس طرح نہیں پڑھیں گے؛ بلکہ معوذتین، واو کے زیر کے ساتھ یہ صحیح قرار دیا گیا ہے۔

## بینک میں جمع کرنے کی ضرورت نہیں:

یہ دوسورتیں ایک خاص نسبت سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے نازل فرمائیں۔ اس سے قبل ایک چیز بنیادی طور پر بتلا دوں کہ قرآن شریف میں کئی سورتیں اور کئی آیتیں ایسی ہیں جو کسی خاص واقعہ کے نتیجہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے نازل فرمائیں۔ مشرکین، یہود یا مسلمانوں کی طرف سے کوئی سوال کیا گیا، اور اُس سوال کے جواب کے طور پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایک آیت، چند آیتیں یا کوئی سورت نازل فرمائی۔

جیسے: (۱) حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ثعلبہؓ نے آپ ﷺ سے پوچھا (ابھی زکوٰۃ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا) کہ ہمارے کچھ غلام اور متعلقین ہیں، ہم ان پر کیا خرچ کریں؟ تو آیت نازل ہوئی: وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ. (البقرة: ۲۱۹) (اے نبی! یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کے راستہ میں کیا خرچ کریں؟ تو آپ جواب دے دیجیے کہ جو مال تمہارے پاس بچے وہ خرچ کر دو) تمہاری ضرورت تم نے پوری کر لی، جو بچا، اس کو بینک میں جمع کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کو خرچ کر دو۔ زکوٰۃ سے پہلے یہ حکم نازل ہوا تھا۔ (۱)

(۱) تفسیر ابن کثیر، سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۱۹

(۲) بخاری شریف میں روایت ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ مدینہ منورہ کی بنجر زمین - خرابہ - سے گزر رہے تھے، میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھا، وہاں کچھ یہودی بیٹھے ہوئے تھے، آپ کا گزر ان کے پاس سے ہوا، وہ نبی کریم ﷺ کو دیکھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے کہ ان سے سوال کریں؟ یہودیوں کی عادت تھی، وہ شرارت کرتے رہتے تھے، نبی کریم ﷺ کو چھیڑتے رہتے تھے، اور سوالات کرتے تھے، اور ان کا مقصد یہ ہوتا کہ ہم ایسا سوال کریں جس کا یہ جواب نہ دے سکیں؛ تاکہ ہمیں یہ کہنے کا موقع ملے کہ اگر یہ اللہ کے سچے نبی ہوتے، تو ہمارے سوال کا جواب دیتے۔

چنانچہ حضور ﷺ کو دیکھ کر ان کو شرارت سوچھی، ایک نے کہا: روح سے متعلق سوال کیجیے، پھر دوسرے نے کہا: بھئی! تمہیں تو معلوم ہے کہ یہ اللہ کے سچے نبی ہیں تم پوچھو گے تو وہ جواب دیں گے!!! کوئی ایسی بات نہیں کہیں گے جو تمہیں ناگوار ہو، کاہے کو پوچھتے ہو؟ تم جس مقصد کے لیے پوچھنا چاہتے ہو تمہارا وہ مقصد تو حاصل ہونے والا نہیں ہے، پھر بھی بعض نے کہا: نہیں! ہم ضرور پوچھیں گے، چنانچہ انہوں نے روح کے متعلق سوال کیا۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ: حضور ﷺ کے ہاتھ مبارک میں کھجور کی ایک ٹہنی تھی، جس سے ٹیک لگاتے ہوئے آپ چل رہے تھے، جیسے عصا سے ٹیک لگایا جاتا ہے۔ جب ان لوگوں نے سوال کیا تو آپ ﷺ کھڑے ہو گئے، اور ان کو کوئی جواب نہیں دیا، میں سمجھ گیا کہ آپ ﷺ پر وحی کا نزول شروع ہو گیا، اور میں اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ وحی نازل ہوتے وقت نبی کریم ﷺ کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ آپ کا چہرہ انور سرخ ہو جاتا، اور سخت سردی میں بھی آپ کی پیشانی مبارک سے پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح لڑھکتے تھے، خراٹوں کی سی آواز آتی تھی، چنانچہ یہ کیفیت شروع ہو گئی۔ وہ کیفیت جب ختم ہوئی تو

اس کا مطلب یہ ہوا کہ وحی کے نزول کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ پس جب وحی نازل ہو گئی، تو حضور ﷺ نے آیت پڑھی: وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (سورۃ الاسراء: ۸۵) (۱)

مفسرین کی اصطلاح میں اس واقعہ (یہودیوں کے سوال کرنے) کو ان آیات کا شان نزول اور سبب نزول کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہودیوں کے سوال کے جواب کے طور پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

## شان نزول:

کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی واقعہ پیش آیا اور اس سلسلہ میں لوگوں کو ہدایت اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی، تو اس پر آیتیں نازل ہوئیں، تو وہ واقعہ ان آیات کا شان نزول، سبب نزول ہوا۔ یعنی ان آیات کے اترنے کا سبب یہ واقعہ بنا (لیکن وہ حکم، ہدایت اور وہ تعلیم قیامت تک کے لیے ہوگی، مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے) تو یہ شان نزول ایک خاص اصطلاحی لفظ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت یا اس سورت کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارے جانے کا سبب یہ ہوا۔ تو جب بھی درس کے دوران یوں کہیں گے کہ اس کا شان نزول یا سبب نزول یہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس آیت یا سورت کو نازل فرمایا۔

## بوقت ہجرت مدینہ منورہ میں آباد اقوام:

ان دونوں سورتوں کا بھی ایک شان نزول ہے۔ مکہ میں یہودی نہیں تھے، وہاں

قریش ہی قریش تھے، عرب ہی عرب تھے۔ جب حضور ﷺ مدینہ منورہ آئے تو مدینہ منورہ میں دو قومیں آباد تھیں: (۱) عرب، جن کا مذہب بت پرستی تھا۔ اور ان کے دو قبیلے تھے: اوس اور خزرج۔ (۲) اور یہودی، یہ اہل کتاب بھی کہے جاتے تھے، یعنی وہ لوگ جن کو اللہ کی طرف سے پہلے آسمانی کتاب دی گئی ہو۔ چوں کہ یہودی حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام پر ایمان لاتے ہیں، اور حضرت موسیٰ پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے توریت نازل فرمائی، لہذا حضرت موسیٰ پر ایمان لانے والی اس قوم کو اہل کتاب کہا جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام پر اللہ تعالیٰ نے انجیل نازل فرمائی اور حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام پر ایمان لانے والے عیسائی کہلاتے ہیں، ان کو بھی اہل کتاب کہا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ لوگ جن کو اللہ کی طرف سے ان کے نبی کے واسطے سے کتاب دی گئی، وہ اہل کتاب کہے جاتے ہیں۔ جیسے ہمیں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے واسطے سے قرآن پاک عطا فرمایا۔ تو یہ دو قومیں یہود اور نصاریٰ، اہل کتاب کہلاتی ہیں۔

چنانچہ یہود مدینہ منورہ میں ان عربوں کے ساتھ آباد تھے، یہودی چوں کہ اہل کتاب ہیں، ان کے نبی پر اللہ کی طرف سے عطا کردہ کتاب ان کے پاس تھی۔ اور اس کے پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ تھا، مدرسے تھے، وہاں توریت پڑھائی جاتی تھی، اور پڑھانے والے بڑے بڑے علماء تھے، جیسے آج کل ہمارے مدارس اور ان میں پڑھنے والے طلبہ اور علماء ہیں، اس زمانے میں یہودیوں کے مدارس تھے۔ آج بھی ہیں۔

## جب یہودی مسلمانوں کا قصہ ہوا:

حضور ﷺ کے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد یہودیوں میں ایک

قصہ ہوا کہ ایک مرد نے ایک عورت کے ساتھ زنا کیا۔ (یہود کے یہاں زنا کی سزا رجم یعنی سنگسار کرنا) پتھر مار کر ختم کر دینا) تھی۔ ہر زنا کی سزا، چاہے وہ زنا کرنے والے شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ اسلام میں زنا کرنے والے اگر غیر شادی شدہ اور آزاد ہیں تو ان کی سزا ۱۰۰ کوڑے ہیں، غلام ہیں تو ۵۰ کوڑے۔ اور شادی شدہ ہیں اور آزاد ہیں تو ان کی سزا رجم (یعنی پتھر مار کر ختم کر دینا ہے) بہر حال! یہودیوں کے سماج میں یہ زنا کا قصہ پیش آیا، تو ان یہودیوں نے سوچا کہ یہ نئے نبی آئے ہیں، ان کی شریعت بہت آسان ہے، اس میں بڑی سہولتیں ہیں، آج ہم اپنے آدمیوں کا فیصلہ ان کے پاس کرائیں۔

اس موقع پر علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں: ان کی بے وقوفی دیکھو! دین میں داخل ہوئے بغیر اس دین کی جو فیسیلیٹی ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ارے بھائی! پہلے ایمان تولاؤ، مسلمان تو بنو، پھر اس دین کی سہولتوں سے فائدہ اٹھاؤ! مسلمان تو بنتے نہیں اور سہولتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو!

خیر! وہ آئے، اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا کہ ان دو مرد اور عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہے، آپ ان کا فیصلہ کر دیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ جو فیصلہ کریں گے وہ بہت آسان ہوگا، سہولت والا ہوگا۔ تو حضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے یہاں اگر کوئی زنا کرے تو اس کی سزا کیا ہوتی ہے؟ تمہاری کتاب میں کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا: ہمارے یہاں تو کوئی زنا کرتا ہے تو اس کو سواری پر لٹا بٹھاتے ہیں، منہ کالا کرتے ہیں، اور اس کا ڈھنڈورا پٹوا دیتے ہیں۔ گویا ایک طرح کی اس کی فضیحت (Sodomy) کروادیا، یہ سزا ہو گئی۔ انہوں نے یہ کہا تو حضور ﷺ نے فرمایا: تمہاری کتاب تو ریت میں سنگساری اور رجم کا حکم نہیں ہے؟ تو انہوں نے کہا: نہیں ہے۔ ان کا عالم ابن صورت تھا، وہ

وہاں کے مدرسہ میں بڑا مدرس تھا، وہ ساتھ آیا تھا، اس نے کہا: ہماری کتاب میں یہ نہیں ہے۔

## بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے:

اس مجلس میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ جو پہلے یہودی تھے اور یہود کے بہت بڑے عالم تھے، توریت سے واقف تھے، موجود تھے۔ انہوں نے کہا: کیا توریت میں آیت رجم نہیں ہے؟ لاؤ! توریت لاؤ! فَاتُّوا بِالتَّوْرَةِ فَاتْلُوهَا إِنَّ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (توریت لاؤ! اور اس کی تلاوت کرو، اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو) (ال عمران: ۹۳) تو وہ توریت لائے، اور جوان کا عالم تھا، وہی پڑھتا تھا، اس نے آیت رجم پر اپنی ہتھیلی رکھ دی، اور اوپر نیچے کا پڑھنے لگا۔ تو حضرت عبداللہ بن سلامؓ جو ایمان لا چکے تھے، انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے ہٹایا کہ یہ پڑھو۔ چنانچہ ہاتھ کے نیچے آیت رجم نکلی، سنگساری کا حکم تھا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب رجم کا حکم ہے، تو کرو رجم!!! وہ سوچ کر آئے تھے کہ کچھ آسان فیصلہ ہوگا، انہوں نے سوچا کہ کیا سوچ کر گئے تھے اور کیا ہو گیا! الٹا ہم اپنے یہاں رکھتے تو وہ اپنا کالے منہ والا فیصلہ ہو جاتا۔ حالاں کہ انہوں نے توریت کے حکم میں تحریف اور رد و بدل کر دیا تھا، اور کالا منہ کرنا ان کی شریعت کا حکم نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے یوں سوچا کہ اگر ہم یہی رد و بدل والا کرتے تو فائدہ میں رہتے، یہ تو مار کھانی پڑی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ مسجد نبوی کے پڑوس میں جہاں جنازے پڑھے جاتے تھے وہاں ان دونوں کو رجم کیا گیا۔<sup>(۱)</sup> خیر! میں نے تو یہ قصہ اس لیے بیان کیا تھا کہ ان کے یہاں بھی مدرسے تھے، علماء تھے۔

(۱) صحیح البخاری: ۱۳۲۹ و ۳۱۳۵ و ۲۵۵۶ و ۲۸۱۹ و ۲۸۲۱ و ۳۳۲۲ و ۵۴۳۳۔

## یہود کو حضور کی رسالت کا یقین تھا:

حاصل یہ ہے کہ یہود نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کے دشمن تھے۔ حضور ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے، تو عرب میں اوس و خزرج ہی ایمان لائے تھے، اور آپ ﷺ نے ان یہودیوں کے ساتھ صلح کا معاملہ کیا کہ ہم آپس میں امن و امان کے ساتھ رہیں گے، آپس میں لڑیں گے نہیں، اور کسی کے دشمن کے مقابلہ میں اس دشمن کی مدد نہیں کریں گے۔ یہ طے ہوا تھا، یہودیوں نے صلح تو کی تھی؛ لیکن اندرونی طور پر وہ مسلمانوں کو اور نبی کریم ﷺ کو تکلیف پہنچانے کا کام کرتے رہتے تھے۔ اور اس سے قبل یہ بات گزر چکی کہ یہود بالیقین جانتے تھے کہ حضور اکرم ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں، جس نبی کو اللہ تعالیٰ نبی آخر الزمان، خاتم النبیین بنا کر بھیجنے والے تھے وہ یہی ہیں، ان کی توریت میں باقاعدہ اس کی بشارت سنائی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نبی آخر الزمان کو بھیجیں گے، ان کی یہ یہ نشانیاں ہوں گی، وہ ساری نشانیاں جو اپنی کتاب میں تھیں اس کے مطابق وہ لوگ دیکھ رہے تھے، اور اس کی وجہ سے ان کو اس بات کا یقین تھا۔

## یہ عرفونہ کہا یہ عرفون أبناءہم:

چنانچہ روایتوں میں آتا ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کا پہلا قیام قباء میں رہا، قباء میں آپ ﷺ ۱۲ یا ۲۴ روز تک ٹھہرے۔<sup>(۱)</sup>

(۱) قال أنس رضي الله عنه: ..... فأقام النبي ﷺ فيهم أربع عشرة ليلة. (صحيح البخاري: ۲۲۸) قال العيني: وهذه رواية الأكثرين وكذا في رواية أبي داود عن شيخه مسدد وفي رواية المستملي والحموي "أربعاً وعشرين ليلة" وعن الزهري "أقام فيهم بضع عشرة ليلة" وعن عويمر =

اسی زمانہ میں قبیلہ بنو نضیر کا ایک سردار حُجی بن اخطب، جو ام المؤمنین حضرت صفیہؓ کا باپ تھا؛ عالم اور بڑے دبدبہ والا بھی تھا، تو وہ فوراً اپنے بھائی ابو یاسر بن اخطب کے ساتھ آپ ﷺ کا امتحان لینے کے لیے اور دیکھنے کے لیے کہ یہ وہی نبی ہیں قباء گیا اور رات آپ ﷺ کے ساتھ گزاری۔ صبح جب گھر آیا تو اس کے بھائی کے ساتھ بات چیت ہوئی، تو بھائی نے پوچھا: یہ وہی ہیں؟ وہی یعنی آخری نبی جن کی حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیشین گوئی دی ہے؟ تو اس نے کہا: واللہ! یہ وہی ہیں۔ تو بھائی نے کہا: **أَتَعْرِفُهُ وَتَنْبَتُهُ** (کیا تو اس کو جانتا اور اس کو تسلیم کرتا ہے؟) تو حُجی بن اخطب نے کہا: جی ہاں! پھر بھائی نے پوچھا: تیرے دل میں اس کے باب میں کیا بات ہے؟ تو حُجی بن اخطب نے کہا: بخدا! تادم حیات اس سے دشمنی رکھوں گا، پس وہ ایمان نہیں لایا۔ <sup>(۱)</sup> دیکھو! یہ گفتگو دو بھائیوں کے درمیان گھر میں ہوئی تھی، اس کو سننے والی حضرت صفیہؓ تھیں، انہوں نے بعد میں بتایا تھا۔ بہر حال! وہ یقین کے ساتھ جانتے تھے کہ اللہ کے سچے نبی ہیں، قرآن میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ ابْنَاءَهُمْ**۔ (سورۃ البقرہ: ۱۲۶) (اے نبی! یہ لوگ آپ کی نبوت کو اور آپ کے نبی ہونے کو ایسا جانتے ہیں جیسا اپنی اولاد کو جانتے ہیں)

= بن ساعدة ”لبث فيهم ثمانى عشرة ليلة ثم خرج“ اھ۔ (عمدة القاري: ۲/ ۲۵۹ ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

(۱) الروض الأنف (۳/ ۳۱۱ ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت) وإحياء علوم الدين (۳/ ۱۹۰) (ط: دار المعرفة بيروت) قال العراقي: رواه ابن اسحاق في السيرة قال: حدثني عبد الله بن أبي بكر بن محمد بن عمرو بن حزم قال: حدثت صفية فذكره نحوه وهو منقطع أيضا (أي بين عبد الله بن أبي بكر وصفية رضي الله عنهم)

(تخريج أحاديث إحياء علوم الدين: ۴/ ۱۸۴۳) (ط: دار العاصمة للنشر، الرياض)



ایک باپ اپنے بیٹے کا بیٹا ہونا یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ یہ یقینی طور پر میرا بیٹا ہے اسی طرح یہ لوگ بالیقین جانتے تھے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

## اس سے بھی زیادہ:

بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے آیت کریمہ: **يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمْ** کے متعلق پوچھا کہ یہ لوگ حضور ﷺ کا نبی ہونا ایسا جانتے ہیں، جیسا اپنے بیٹوں کا بیٹا ہونا جانتے ہیں۔ تو حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: میں ان کو اپنی اولاد سے زیادہ جانتا ہوں، حضرت عمرؓ نے پوچھا: کیوں؟ تو انہوں نے کہا: ایک باپ اپنے بیٹے کا بیٹا ہونا اس لیے جانتا ہے کہ یہ میری بیوی کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے؛ لیکن ممکن ہے کہ اس کی بیوی نے خیانت کی ہو، اور کسی دوسرے سے تعلق قائم کیا ہو، اور اس کا نطفہ قرار پا گیا ہو، اور اس سے بیٹا پیدا ہوا ہو، یہ تو محض اپنا بیٹا ہونے کو جانتا ہے؛ اندر کی بات اس کو معلوم نہیں۔ تو حضرت عبداللہ بن سلامؓ فرماتے ہیں کہ بیٹے کے بیٹا ہونے کے یقین میں تو گر بڑ ہو سکتی ہے؛ لیکن ان کے اللہ کا رسول ہونے میں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضرت عمرؓ نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا۔<sup>(۱)</sup> تو یہودی حضور ﷺ کا نبی ہونا بالیقین جانتے تھے۔

## یہ ہم میں سے نہیں:

یہودی ایمان نہیں لائے۔ کیوں نہیں لائے؟ حسد کی وجہ سے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے توریت، انجیل، اگلی آسمانی کتابوں اور دوسرے صحیفوں میں بھی نبی کریم ﷺ کے

(۱) الکشاف للزمخشري ومفاتيح الغیب للرازي، سورة البقرة: ۱۲۶۔

آنے کی خبر تو دی تھی، نشانیاں بھی بتلائی تھیں؛ لیکن یہ نہیں بتلایا تھا کہ وہ کون سے خاندان میں آئیں گے؟ آنے والے ہیں اور آئیں گے، یہ بات تم لوگوں کو بتاؤ، اور آئیں تو ان پر ایمان لانا، اللہ نے پہلے تمام نبیوں سے عہد لیا کہ اگر تمہاری زندگی میں وہ آخری نبی آئیں تو تم ان پر ایمان لاؤ گے۔ قرآن میں اس عہد کا تذکرہ ہے۔ لیکن یہ یہود سمجھتے رہے کہ آخری نبی ہمارے اندر ہی آئیں گے۔

اس سے قبل گزر چکا کہ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے: (۱) حضرت اسحق (۲) حضرت اسماعیلؑ۔ حضرت اسحق کے ایک بیٹے حضرت یعقوبؑ تھے۔ حضرت یعقوب ہی کا دوسرا نام اسرائیل تھا۔ اور انہیں کے بارہ بیٹے تھے۔ ان کی نسل میں جو لوگ پیدا ہوئے وہ سب یہودی کہلائے۔ تو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسحاقؑ کے بعد جنے بھی نبی آئے وہ سب حضرت یعقوبؑ کی اولاد میں آئے، اور سب بنو اسرائیل کہلائے۔ حضرت عیسیٰؑ بھی بنو اسرائیل میں سے ہیں۔ لیکن آخری نبی کو اللہ نے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں بھیجا۔ وہ سب کے اوپر بھاری ہو گئے۔ چنانچہ یہودی یوں سمجھتے تھے کہ اب تک جیسے نبی بنو اسرائیل میں سے آئے تو آخری نبی بھی بنو اسرائیل ہی میں سے آئیں گے؛ لیکن انہوں نے جب دیکھا کہ بنو اسماعیلؑ میں سے آئے، عربوں میں آئے، تو ان کو حسد ہو گیا کہ ہم میں کیوں نہیں آئے؟ آج دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو یوں سمجھتے ہیں کہ خوبی، کمال ہمارے ہی اندر ہونا چاہیے، دوسروں میں وہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ یہی یہودیوں والی فطرت ہے۔ تو یہ یہودی اسی لیے ایمان نہیں لائے کہ یہ آخری نبی اسماعیلؑ کی اولاد میں کیوں آئے؟ بنو اسرائیلؑ میں کیوں نہیں آئے؟ بلکہ ان کو اس معاملہ میں اتنی شدت ہے کہ حضرت جبریلؑ سے بھی یہ لوگ دشمنی رکھتے ہیں کہ یہ وحی ان کے پاس لے کر کیوں آئے؟ حضرت

جبرئیل حضور ﷺ کے پاس اپنی مرضی سے آئے تھے؟ اللہ کے حکم سے لائے؛ لیکن وہ یوں کہتے ہیں انہوں نے دوسرے کو بھیج دی۔ جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں۔

## جانتے ہیں، مانتے نہیں:

حاصل یہ ہے کہ یہودیوں کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ بڑی دشمنی تھی۔ حالاں کہ شروع میں جب حضور ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے، تو بہت سے احکام میں حضور ﷺ ان کی موافقت کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی صریح حکم نازل نہ ہوا ہو، تو حضور ﷺ یہودیوں کی موافقت کو پسند کرتے تھے، تاکہ ان کی دل جوئی ہو، اور وہ اسلام کی طرف مائل ہوں؛ لیکن جتنی ان کی دل جوئی کی گئی وہ اتنے زیادہ اکڑتے گئے اور ان کی دشمنی اور زیادہ شدت اختیار کرتی گئی۔ یہاں تک کہ بعد میں حکم دیا گیا کہ ان کی مخالفت کرو۔

چنانچہ یہودی حضور ﷺ پر اسی حسد کی وجہ سے کہ آپ بنو اسماعیل میں کیوں آئے؟ بنو اسرائیل میں کیوں نہیں آئے؟ آپ ﷺ پر ایمان نہیں لائے۔ حالاں کہ ان سب کو یقین تھا کہ یہ آخری نبی، جن کی بشارتیں، علامتیں، نشانیاں بتلائی گئیں وہ یہی ہیں۔ ساری نشانیاں دیکھ رہے ہیں، جان رہے ہیں پھر بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اسی حسد کی وجہ سے وہ حضور ﷺ کو بہت ساری تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ ایسی تکلیفیں پہنچانا ان کا مزاج بن گیا تھا۔ قرآن میں اس کا تذکرہ موجود ہے: وَ لَسْتُمْ مَعَهُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْكُوكُوا أَدَىٰ كَثِيرًا وَإِنْ تَصْبِرُوا وَ تَتَّقُوا فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَمَلِ الْأُمُورِ۔ (ال عمران: ۸۶)

(تم سے پہلے جن کو کتاب دی گئی وہ اور جو مشرک ہیں، ان سے تم

بہت تکلیف دینے والی باتیں سنو گے؛ لیکن اس وقت تم صبر کرنا) قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے تو یہ یہودی مختلف طریقوں سے تکلیف پہنچاتے تھے۔

## آپ ﷺ پر سحر:

اسی سلسلہ میں یہ امر پیش آیا کہ ان لوگوں نے نبی کریم ﷺ پر جادو کرایا۔ یہ واقعہ فتح الباری میں علامہ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ حضور اکرم ﷺ جب حدیبیہ سے لوٹے، اس کے بعد محرم کے ہ میں جادو کا واقعہ پیش آیا۔<sup>(۱)</sup> لبید بن اعصم نامی ایک شخص تھا، یہ اصل تو انصار کی ایک شاخ بنو زریق سے تعلق رکھتا تھا، لیکن یہ سب حلیف اور دوست تھے، ان کا یہودیوں کے ساتھ دوستانہ عہد اور ایگریمنٹ ہوا تھا۔ تو یہ لبید بن اعصم یہودیوں کا حلیف تھا، اس نے خود اپنی بیٹیوں اور بیٹیوں کو جادو سکھلا کر خود بھی شریک ہوا اور بیٹیوں کے ذریعہ جادو کرایا۔<sup>(۲)</sup>

جادو کرانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا؟ نبی کریم ﷺ جس کنگھے سے سر اور داڑھی کو کنگھا کرتے تھے اس کنگھے کے کچھ دندانے، اور کنگھا کرنے کے بعد نکلنے والے کچھ بال استعمال کیے۔ حضور ﷺ کی خدمت میں ایک یہودی لڑکا آیا کرتا تھا، اس کو پھسلا کر اس کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کے بال مبارک اور کنگھے کے کچھ دندانے حاصل کیے، اور اس

(۱) الطبقات الكبرى لابن سعد (۲/۱۵۲، ط: دار الكتب العلمية، بيروت) وفتح الباري لابن حجر (۱۰/۲۲۶، دار المعرفة، بيروت)

(۲) قال ابن سعد: قال اسحاق بن عبدالله: فأخبرت عبد الرحمن بن كعب بن مالك بهذا الحديث فقال: إنما سحره بنات أعصم أخوات لبید وكن أسحر من لبید وأخبث إلخ... (الطبقات الكبرى: ۱۵۲/۲)

### (۱) میں جادو کیا۔ اور کمان کی تانت پر گرہیں لگائیں۔

اس لیے کہ جس پر سحر کیا جاتا ہے اس کے جسم کی کوئی چیز (ناخن، بال وغیرہ) ہونی چاہیے۔ یا کوئی ایسی چیز جو اس کے استعمال میں رہی ہو۔ اس کے بغیر جادو نہیں ہوتا۔ جادو میں کچھ ایسے کلمات پڑھے جاتے ہیں جن کے ذریعہ شیاطین کو خوش کیا جاتا ہے، ان کلمات کو سن کر وہ خوش ہوتے ہیں، اور ان کو جو کہا جائے وہ کرتے ہیں۔ یعنی جادوگر ان کلمات کو بول کر کے ان کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں۔ ہر سال وہ اس کی تجدید کرتے ہیں۔ سال میں ایک مرتبہ پڑھیں گے تو یہ کلمات سن کر وہ شیطان ایسا مطیع اور فرماں بردار بن جاتا ہے، کہ اس سے کہا جائے کہ اس کو نقصان پہنچاؤ، تو برابر اس کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ ہم تو ساری دنیا کے احسانات برداشت کر کے بھی اللہ کی اتنی فرماں برداری نہیں کرتے جتنا یہ شیطان اپنے خوشامدی کی کرتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اس تانت کے اوپر پڑھ پڑھ کر گیارہ گرہیں لگائی گئیں، پھر اس تانت میں وہ بال اور کنگھے کے دندانے رکھے گئے۔

اور بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور ﷺ کا موم کا ایک چھوٹا سا پتلا بنایا، اس میں چھوٹی چھوٹی گیارہ گرہیں لگائیں۔ (۲) بہر حال! جادو کا عمل تیار تھا، اس کو نہ کھجور کے شگوفہ کے گور میں بند کر کے بنوز ریق کے ایک کنویں میں ایک بڑے پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس کنویں کا نام بَرّذی اروان تھا۔

(۱) بحر العلوم للسمرقندی (۳/۲۳۶-۲۳۷، ط: دار النشر: دار الفکر، بیروت) والكشف والبيان

عن تفسير القرآن للشعلبي (۱۰/۳۳۸، ط: دار احیاء التراث العربی، بیروت)

(۲) بحر العلوم للسمرقندی (۳/۲۳۷، ط: دار الفکر، بیروت)

## جادو کا اثر، ذاتِ رسالت پر:

اس سحر کا اثر یہ ہوتا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے کوئی کام نہیں کیا ہے اور آپ ﷺ یوں سمجھتے تھے کہ وہ کام کیا ہے۔ چنانچہ بخاری شریف میں ہے: **كَانَ يَرَى أَنَّهُ يَأْتِي النِّسَاءَ وَلَا يَأْتِيَهُنَّ** <sup>(۱)</sup> دراصل یہ جادو بیویوں کے ساتھ تعلق کے معاملہ میں کیا گیا تھا کہ آپ ﷺ نے بیویوں کے ساتھ صحبت نہیں کی؛ لیکن اس جادو کے اثر کی وجہ سے یوں سمجھتے تھے کہ صحبت کی۔ بس! یہ تھا وہ اثر۔ چھ مہینے تک یہ اثر رہا۔ <sup>(۲)</sup> اور اس جادو کے نتیجے میں آپ ﷺ اپنے آپ کو ایسا محسوس کرتے تھے کہ میں بندھا ہوا ہوں۔ آپ ﷺ کو بہت تکلیف ہوتی تھی، اس جادو کا اور کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ آپ ﷺ کے فرض منصبی (آنے والے احکام اور وحی کو دوسرے بندوں تک پہنچانے) میں اس جادو کا کوئی اثر نہیں تھا۔

کوئی بڑے سے بڑا جادو گر بھی کسی نبی پر ایسا جادو نہیں کر سکتا، جس کے اثر سے وہ اپنے فرض منصبی اور اپنی ڈیوٹی کی ادائیگی میں کوتاہی کرے، یہ ناممکن ہے۔ تو اس جادو کی

(۱) صحیح البخاری: ۵۷۶۵۔

(۲) أخرجه الإمام أحمد في مسنده برقم: ۲۳۸۲۶ (ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت) وقال الحافظ ابن حجر: وقع في رواية أبي ضمرة عند الإسماعيلي فأقام أربعين ليلة، وفي رواية وهيب عن هشام عند أحمد: ستة أشهر، ويمكن الجمع بأن تكون الستة أشهر من ابتداء تغير مزاجه والأربعين يوماً من استحكامه. (فتح الباري: ۲۰۶/۱۳، ط: دار طيبة، الرياض) وقال السهيلي لم أقف في شيء من الأحاديث المشهورة على قدر المدة التي مكث النبي ﷺ فيها في السحر حتى ظفرت به في جامع معمر عن الزهري أنه لبث ستة أشهر كذا قال وقد وجدناه موصولاً بالإسناد الصحيح فهو المعتمد. (الروض الأنف: ۲/۲۰۰ - ۲۰۱، ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت، الت: السلامي)

وجہ سے آپ ﷺ کی فیملی زندگی پر اثر ہوا۔ اور اس کی وجہ سے آپ ﷺ ایک گھٹن اور تکلیف محسوس کرتے تھے۔

## جادو کا توڑ؛ دعا کی طاقت:

بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ میرے یہاں رات کو تشریف لائے، میری باری کا دن تھا؛ لیکن حضور ﷺ دعا میں مشغول رہے۔  
**دعا و دعا۔** اور مسلم شریف میں تین مرتبہ آیا ہے۔<sup>(۱)</sup> یعنی خوب دعا کی۔

اس تین مرتبہ لفظ ”دعا“ پر حضرت شیخ زکریاؑ نے بڑی اچھی بات لکھی، فرماتے ہیں: سحر کے اثر کو دور کرنے کے لیے سب سے مؤثر چیز دعا ہے۔ رور و کر اللہ سے مانگو، تو اللہ تعالیٰ اس کا راستہ نکالیں گے۔<sup>(۲)</sup>

پھر خواب میں دو آدمی آئے، وہ دو فرشتے تھے، ایک حضرت جبرائیلؑ، وہ سر کے پاس بیٹھے۔ اور دوسرے حضرت میکائیلؑ، پاؤں کے پاس بیٹھے۔ اب حضرت جبرائیلؑ حضرت میکائیلؑ سے پوچھ رہے ہیں کہ ان کو کیا ہو گیا؟ تو حضرت میکائیلؑ نے جواب دیا: ان پر جادو کیا گیا ہے۔ انہوں نے پوچھا: کس نے جادو کیا؟ تو جواب میں کہا: لبید بن اعصم نے۔ کس چیز میں جادو کیا؟ تو کہا: کنگھے اور اس سے نکلے ہوئے بالوں میں۔ وہ کہاں رکھا؟ تو کہا: زکھجور کے شگوفے میں۔ اس کو کہاں دفن کیا؟ کہا: ذی اردوان نامی کنویں میں پتھر کے نیچے۔ یہ سب حضور ﷺ کو خواب میں بتلایا گیا۔

(۱) صحیح مسلم: ۲۱۸۹۔

(۲) الأبواب والتراجم: ۱۵۱/۶ (ط: دار البشائر الإسلامية، بیروت، لبنان)

## اللہ نے حل بتلادیا:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں جب حضور ﷺ بیدار ہوئے، تو مجھ سے کہا: عائشہ! میں نے اللہ تعالیٰ سے جو چیز پوچھی تھی، اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا حل بتلادیا ہے۔ یعنی وہی دعا کی تھی کہ مجھے کیا تکلیف ہے؟ تو خواب میں بتلادیا کہ یہ جادو ہے، جو آپ پر کیا گیا ہے۔<sup>(۱)</sup> حضور ﷺ اپنے مخصوص صحابہ حضرت علیؓ، حضرت عمارؓ، اور دو اور صحابی رضی اللہ عنہم تھے۔<sup>(۲)</sup> ان کو لے کر گئے اور سب کچھ اندر سے نکالا اور ختم کیا۔ اگر جادو کی ترتیب اور اس کا سینک ختم کر دیا جائے، تو جادو کا اثر بھی ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ترتیب ختم کر دی اور اس کو ایک جگہ دفن کر دیا۔

## أحسن إلى من أساء إليك کی عملی تصویر:

حضور ﷺ نے دوسرے مسلمانوں کے سامنے بھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ نے لوگوں کو کیوں نہیں بتلایا؟ لوگوں کو بتلادیتے کہ اس آدمی نے یہ حرکت کی ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مجھے اللہ نے شفا دے دی، اب میں نہیں چاہتا کہ کسی آدمی کے خلاف فتنہ بھڑکاؤں۔<sup>(۳)</sup> وہ آدمی منافق تھا۔ اگر آپ ﷺ اظہار کر دیتے، تو صحابہ کو حضور ﷺ کے ساتھ جو محبت تھی

(۱) صحیح البخاری: ۵۷۶۴ و ۵۷۶۵۔

(۲) جبیر بن ایاس الزرقی و قیس بن محصن الزرقی (الطبقات الكبرى لابن سعد ۲/ ۱۵۲ و

۱۵۳، ط: دارالکتب العلمیہ، بیروت)۔

(۳) صحیح البخاری: ۵۷۶۴۔



حضور ﷺ کے پسینے کے قطرے کی جگہ پر اپنے خون کو بہانے والے، وہ اس آدمی کے تو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے، لہذا حضور ﷺ نے کسی کو نہیں بتایا اور اخیر تک پتہ نہیں چلنے دیا۔ اور وہ منافق آپ ﷺ کی مجلس میں آتا تھا، پھر بھی آپ ﷺ نے اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں فرمائی۔ یہ حضور ﷺ کے اخلاق ہیں، آپ ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ ایسا ہو تو اپنے دشمن کے ساتھ اس طرح معافی کا معاملہ کرو۔ تو آپ ﷺ نے ایسا معاف کیا کہ لوگوں کو بتایا بھی نہیں۔ اور آج کیا ہوتا ہے؟ حالاں کہ آپ ﷺ کو یہ جادو کس نے کیا؟ کس طرح کیا؟ یہ وحی کے ذریعہ بتایا گیا تھا۔ اس لیے کہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ حضرت جبریلؑ اور میکائیلؑ نے اللہ کے حکم سے آکر بتایا تھا تب بھی آپ نے کسی کو نہیں بتایا کہ کس نے جادو کیا ہے۔

## عامل کا کہنا معتبر نہیں:

آج کس نے جادو کیا؟ کوئی بات یقینی نہیں ہے۔ اور آدمی دشمنی نکالنا شروع کر دیتا ہے۔ عامل لوگوں کو بھی چاہیے کہ کسی کو یہ نہ کہیں کہ فلاں نے کیا۔ آپ علاج کر لیجیے۔ لوگ بعض مرتبہ اس چکر میں پڑتے ہیں کہ بتاؤ کس نے کیا؟ کیوں کہ عامل جن چیزوں کے ذریعہ معلوم کرتے ہیں وہ کوئی وحی نہیں ہے۔ شریعت میں کسی کے خلاف ثبوت کے لیے یہ مسئلہ ہے کہ اولاً وہ آدمی خود اقرار کرے کہ میں نے یہ حرکت کی ہے، یا دوسری گواہ جنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، اپنے کانوں سے سنا ہو وہ گواہی دیں، تو کسی چیز کا ثبوت ہو سکتا ہے۔ ان دو کے علاوہ کوئی تیسرا طریقہ کسی چیز کے ثبوت کا نہیں ہے۔ صرف عامل کہہ دے یہ معتبر نہیں۔

## ایک سبق:

حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ میں نقل کیا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ نے القول الجمیل میں ایک جگہ چور کے معلوم کرنے کا عمل بتلایا ہے۔<sup>(۱)</sup> تو اس کے نیچے لکھا ہے کہ یہ اس لیے نہیں ہے کہ آپ کسی پر الزام لگاؤ؛ بلکہ اس لیے ہے کہ اس کے ذریعہ آپ اندرونی طور پر تحقیق کر کے چپکے سے اس کو بتا سکتے ہو کہ دیکھو! یہ پتہ چلا ہے وہ مان لے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ قطعی اور یقینی طور پر اس پر الزام لگانا درست نہیں۔ کیوں کہ یہ

(۱) امداد الفتاویٰ ۴/ ۸۶ و ۸۸ والقول الجمیل (مخطوط عربی) ص: ۴۴

شاہ ولی اللہ صاحبؒ ”القول الجمیل فی بیان سواء السبیل“ میں فرماتے ہیں: چور کی پہچان کے لیے دو آدمیوں کو بدھنا تھا دیا جائے جسے وہ اپنے کلمے کی دونوں انگلیوں سے پکڑ لیں، مشکوک شخص کا نام کاغذ پر لکھ کر اسے بدھنے میں ڈال دے، ”من المکرمین“ تک سورہ یس پڑھے اگر وہی شخص چور ہوگا تو بدھنا گھوم جائے گا، اگر نہ گھومے تو دوسرے آدمی کا نام اس میں ڈال کر پھر یہی عمل دہرایا جائے، اسی طرح تمام مشکوک آدمیوں کا نام ڈالتا جائے اور ”من المکرمین“ تک پڑھتا جائے، چور کا نام سامنے آجائے گا۔ (القول الجمیل فی بیان سواء السبیل) (مترجم) ص: ۹۹، ط: تصوف فاؤنڈیشن، لاہور) نیز حضرت فرماتے ہیں: ووجب علی من اطلع علی السارق بامثال هذه أن لا یجزم بسرقة ولا یشیع فاحشته بل یتبع القرائن فإنما هی طریق اتباع القرائن . قال الله تعالى : ولا تقف مالم یس لک به علم . (القول الجمیل) (مخطوط عربی) ص: ۴۴

نوٹ: حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ (۴/ ۸۶ و ۸۸) میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے حوالے سے جو عمل نقل کیا ہے، وہ اُس عمل کے موافق نہیں ہے، جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنی کتاب القول الجمیل میں نقل کیا ہے۔ پس یہی کہا جائے گا کہ حضرت تھانویؒ نے یہ عمل شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کسی اور کتاب سے نقل کیا ہے، یا پھر نقل میں خطا ہے۔ المعصوم من عصمه الله. والله أعلم۔۔۔

کوئی شرعی ثبوت نہیں۔ شرعی ثبوت دوہی ہیں جس کا ذکر اوپر ہو چکا کہ وہ آدمی خود اقرار کرے یا دونیک، صالح، عادل مسلمان گواہی دیں تب بات بن سکتی ہے۔

دیکھو! ہم لوگوں کے لیے اس میں بڑا سبق ہے۔ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ بتایا، اس کے باوجود آپ ﷺ نے اظہار نہیں کیا، بلکہ اس آدمی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، آپ ﷺ نے اس کا خاص خیال کیا۔ اور ہم صرف گمانوں کی بنیاد پر کیا کیا کر ڈالتے ہیں!!!

بہر حال! یہ واقعہ پیش آیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریلؑ کے ساتھ یہ دو سورتیں نازل فرمائیں۔ ان میں گیارہ آیتیں ہیں، سورہ فلق میں پانچ ہیں اور سورہ ناس میں چھ ہیں۔ تو حضور ﷺ نے اس کو پڑھا، آپ ﷺ پڑھتے جاتے تھے اور تانت پر جو گیارہ گرہیں لگائی گئی تھیں، وہ کھلتی جاتی تھیں، اور جو موم کا پتلا بنایا گیا تھا اس میں جو سونیاں چھوئی گئی تھیں وہ بھی نکلتی جاتی تھیں۔

جب یہ عمل ہو گیا تو حضور ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بندھا ہوا تھا، اب کھل گیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے جادو کے لیے یہ عمل نازل فرمایا۔ اگر علاج کے لیے آدمی یقین کے ساتھ اس کو انجام دے، تو اس سے ان شاء اللہ فائدہ ضرور ہوگا حضور ﷺ کے اس عمل میں ہم لوگوں کے لیے بڑا سبق ہے۔

## جادو کا حکم:

اب جادو کا مسئلہ بھی جاننا چاہیے کہ جادو کا کیا حکم ہے؟ دیکھو! جن طریقوں سے جادو کیا جاتا ہے، اس میں آدمی کچھ کلمات پڑھتا ہے، کچھ بول بولتا ہے، جن کے ذریعہ ان شیاطین کو خوش کیا جاتا ہے، اور ان کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جس پر جادو کیا جائے اس کو تکلیف پہنچتی

ہے، اکثر وہ کفریہ کلمات ہوتے ہیں۔ یعنی اس جملہ کے زبان سے نکالنے کی وجہ سے آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے۔ بسا اوقات کچھ اعمال کرواتے ہیں، بعض مرتبہ تو باقاعدہ بچوں کو اغوا کر لیتے ہیں، قتل کر دیتے ہیں، بعض دیویوں پر ان کی بکی چڑھاتے ہیں، اور اسی طرح قرآن کو نجاست میں ڈالتے ہیں۔ اس کے بغیر جادو سیکھ ہی نہیں سکتے۔ الحاصل جادو میں ایسے کام یا ایسے کلمات کروائے اور کہلوائے جاتے ہیں کہ نتیجہً آدمی ان کی وجہ سے ایمان سے نکل جاتا ہے۔ سو یہ ایک خطرناک چیز ہے۔ اگر ایسا کفریہ کام یا کلام نہیں ہے تب بھی وہ حرام ہے۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا ہے: تم سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے اپنے آپ کو بچاؤ، اس میں ایک جادو کو بھی ذکر فرمایا ہے۔<sup>(۱)</sup> یہ اعلیٰ درجہ کا حرام ہے۔ اور اسلامی حکومت میں اگر سحر ثابت ہو جائے یا وہ اقرار کر لے، تو اس کے لیے بڑی سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

(مؤرخہ ۲۹ / جمادی الثانی ۱۴۳۹ھ مطابق: ۱۸ / مارچ ۲۰۱۹ء، شب یک شنبہ)

(قسط - ۲)

الْحَمْدُ لِلَّهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ  
بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ  
أَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّه فَلَا هَادِيَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ  
وَخَدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ أَرْسَلَهُ إِلَى  
كَافَّةِ النَّاسِ بِشِيرٍ أَوْ نَذِيرٍ أَوْ دَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُبِينًا صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَ  
عَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا. أَمَّا بَعْدُ.

فَاعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ. بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ.

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴿١﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿٢﴾ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ ﴿٣﴾ وَمِنْ  
شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ ﴿٤﴾ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ﴿٥﴾.

یہ سورہ فلق ہے، گزشتہ مجلس میں سورہ فلق اور سورہ ناس (معوذتین) کا شان  
نزل تفصیل سے بتلایا تھا، اب اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔

## اللہ تعالیٰ کی خاص صفت:

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (آپ کہہ دیجیے کہ میں صبح کے مالک کی پناہ مانگتا ہوں)  
فلق رات کے اندھیرے سے صبح کی نمودار ہونے والی روشنی کو کہتے ہیں، جس کو پو

پھٹنا کہتے ہیں۔ رات بھر اندھیرا رہا، صبح اللہ تبارک و تعالیٰ روشنی پھیلا کر رات کے اندھیرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کر دیتے ہیں۔ اور اپنی قدرت سے لوگوں کے قلوب میں امید پیدا کرتے ہیں کہ رات گئی، دن نمودار ہوا، یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ایک خاص صفت ہے کہ وہ رات کے بعد دن کو لاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اسی صفت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اللہ کی پناہ حاصل کی گئی کہ میں صبح کے مالک کی پناہ چاہتا ہوں۔

## اللہ ہی کی پناہ حاصل کیجیے:

مِنْ شَيْءٍ مَا خَلَقَ (ہر اس چیز کی برائی اور شر سے جو اس نے پیدا کی ہے) اس دوسرے جملہ میں تمام مخلوقات کی برائی سے پناہ چاہی گئی ہے۔ چوں کہ سب کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی ان میں موجود برائیوں اور ان شرور سے بچا سکتے ہیں، اسی لیے اللہ کی پناہ حاصل کی جاتی ہے۔ جیسے کوئی آدمی کسی کی ملاقات کے لیے جائے اور گھر کے صحن میں خطرناک قسم کا کتا حفاظت کے لیے رکھا گیا ہے، جو ہر آنے والے پر حملہ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے، تو یہ جانے والا کیا کرے گا؟ اسی مالک مکان کو اطلاع کرے گا کہ بھی! میں آپ کے یہاں آنا چاہتا ہوں؛ مگر آپ کے اس کتے کو قابو میں کیجیے، اس کی طرف سے تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے، اس سے میری حفاظت کا بندوبست کیجیے۔ یہ کام مالک ہی کرے گا۔

اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی چیزیں پیدا کی ہیں، ان تمام کے شر سے اگر کوئی ہمیں بچا سکتا ہے، تو وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس لیے اللہ ہی کی پناہ حاصل کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس دوسری آیت میں جن چیزوں سے پناہ حاصل کی جاتی ہے اس میں ابتداءً ایک عام لفظ استعمال کیا

یعنی ہر اس چیز کے شر سے جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی، اس میں تمام مخلوقات شامل ہو گئیں۔ مخلوقات میں عامۃً دونوں حیثیتیں ہوتی ہیں: خیر اور شر۔ اللہ تعالیٰ نے بعض مخلوقات کو چھوڑ کر دنیا کی تمام مخلوقات میں خیر اور شر دونوں کو رکھا ہے۔ فرشتے اور حضرات انبیاء معصوم ہیں۔ اور خیر کے حاصل کرنے اور شر سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ آدمی نیا لباس پہنتا ہے تو دعا کرتا ہے: **اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ كَسَوْتَنِي إِنْ أَسْأَلَكَ مِنْ خَيْرٍ وَخَيْرِ مَا صُنِعَ لَهُ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهِ وَشَرِّ مَا صُنِعَ لَهُ**۔<sup>(۱)</sup> یا سوار ہو، تو دعا پڑھتا ہے: **اللّٰهُمَّ إِنْ أَسْأَلَكَ مِنْ خَيْرٍ هَا وَخَيْرٍ مَا جَبَلْتَ عَلَيْهِ**۔<sup>(۲)</sup> گویا اس خیر کا سوال کرتا ہوں جس کے لیے یہ پیدا کی گئی ہے، اور اس شر سے حفاظت چاہتا ہوں جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔ چناں چہ ہر چیز میں خیر و شر کا پہلو موجود ہے۔ لہذا مخلوقات کے شر سے پناہ چاہی گئی ہے اور پناہ دینے والی ذات اللہ ہی کی ہے۔ اس لیے پہلے ہمیں تمام مخلوقات کے شر سے پناہ چاہنے کا حکم دیا گیا۔

## تین برائیوں سے پناہ:

اس کے بعد تین برائیاں ایسی ہیں، جن سے خصوصی طور پر پناہ چاہنے کا حکم دیا گیا ہے۔  
وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ (اور میں اندھیری رات کے شر سے پناہ چاہتا ہوں جب وہ پھیل جائے)

غاسق اندھیرے کو بھی کہتے ہیں اور اندھیری رات کو بھی۔ رات کا اندھیرا جب چھا

(۱) أخرجه أبو داود في سننه برقم: ۴۰۲۰، (ط: المكتبة العصرية، صيدا، بيروت) وغيره.

(۲) أخرجه ابن ماجه في سننه برقم: ۱۹۱۸ (ط: دار احياء الكتب العربية، فيصل عيسى البابي الحلبي) و الحاكم في المستدرک برقم: ۲۸۱۲ (ط: دار الحرمين للطباعة والنشر والتوزيع) و النسائي في الكبرى برقم: ۱۰۰۲۱ (ط: مؤسسة الرسالة)

جاتا ہے، اور ہر چیز پر اس کا اثر آ جاتا ہے، اس کے بعد بہت سی چیزوں سے تکلیف پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: جب سورج غروب ہوتا ہے، تو شیاطین اور جنات باہر نکل پڑتے ہیں، اسی لیے حدیث شریف میں اس وقت بچوں کو گھر میں رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ <sup>(۱)</sup> کیوں کہ یہ شیاطین اور جنات اس وقت ادھر ادھر منتقل ہوتے ہیں؛ یہ بچے کہیں ان کی زد میں نہ آ جاویں۔ جب رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے، تو شیاطین، جنات، درندے، سانپ، بکھو اور حشرات الارض اپنے بلوں سے باہر آتے ہیں، لہذا ان کے شر سے بھی پناہ چاہی گئی ہے۔ اسی طریقہ سے چوری کرنے والے، لوگوں کو نقصان پہنچانے والے بھی اپنا کام رات کو ہی کرتے ہیں۔ ان کے شر سے بھی پناہ چاہی گئی۔ جادو کرنے والے بھی اپنا عمل عام طور پر رات کے اندھیرے میں کرتے ہیں، سو ان سے بھی پناہ چاہی گئی ہے۔ بہر حال! جتنی بھی نقصان پہنچانے والی چیزیں ہیں، ان کے اثرات زیادہ تر رات کے وقت ہوتے ہیں، اس لیے خاص طور پر رات کے شر سے پناہ چاہی گئی ہے۔

## حسی اور معنوی اندھیرا:

اندھیرا ایک توحسی ہوتا ہے اور ایک اندھیرا معنوی ہوتا ہے۔ جیسے: کفر و شرک کا اندھیرا، فسق و فجور کا اندھیرا، معاصی اور گناہوں کا اندھیرا، بد اخلاقیوں کا اندھیرا، گمراہیوں کا اندھیرا۔ قرآن کریم میں مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (البقرة: ۲۵۷) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہاں یہ حسی اندھیریاں مراد نہیں ہیں؛ بلکہ معنوی اندھیریاں مراد ہیں، کفر و شرک کی گمراہیاں مراد

(۱) آخر جہ البخاری برقم: ۳۲۸۰ و مسلم برقم: ۲۰۱۲۔



ہیں۔ اور نور سے مراد ایمان کا نور ہے۔ چنانچہ معنوی اندھیروں سے بھی پناہ چاہی گئی ہے۔ یہ چیزیں بھی انسان کو شدید نقصان پہنچاتی ہیں۔ ہم لوگ اس کا تذکرہ تو کرتے ہیں کہ آج کل ماحول بڑا خطرناک ہے، برائیاں پھیلی ہوئی ہیں، اندھیرا ہی اندھیرا ہے؛ لیکن اس سے پناہ چاہنے کے لیے جو تدبیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتائی گئی ہے، اس کا جس قدر اہتمام ہونا چاہیے وہ نہیں ہوتا۔ اس سورت کو پڑھتے وقت آدمی اس بات کا بھی تصور کرے۔

## روز اول سے انابت کا اہتمام ہو:

وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ (اور ان [شخصیتوں اور جانوں] کی برائی سے جو گرہوں پر پھونک مارتی ہیں)

**نفث** کا معنی ہے کچھ پڑھ کر کے دم کرنا اس طور پر کہ تھوک کے کچھ ذرات بھی باہر نکلیں۔ جادو کے وقت جادوگر کی طرف سے جو کلمات پڑھے جاتے ہیں، اُن میں شیاطین وغیرہ سے مدد چاہی جاتی ہے، شرکیہ کلمات پڑھ کر تاگوں پر گرہیں لگا کر اس پر دم کرتے ہیں اسی کو نفث کہتے ہیں۔ تو جادو کے لیے جادوگر عام طور پر یہی ترکیب اختیار کرتے ہیں، لہذا ان کے جادو کے شر سے پناہ چاہنا ہے۔

**نَفَثَاتٍ** کا ترجمہ بہت سوں نے تو عورتوں سے کیا ہے؛ لیکن صاحب روح المعانی اور اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ ایسا ترجمہ کیوں نہ کیا جائے جو ہر قسم کے جادوگروں کو (عورتیں ہوں یا مرد) شامل ہو۔ چنانچہ **نَفَثَاتٍ** کو نفوس کی صفت قرار دیا گیا، یعنی **من شر النفوس** **النَّفَثَاتِ** یعنی ان جانوں کے شر سے جو گرہوں پر جادو کرنے کے لیے پھونک مارتی ہیں۔<sup>(۱)</sup>

(۱) روح المعانی ۱۵/۵۲۰ و ۵۲۱ (ط: دار الکتب العلمیہ، بیروت)

تو جادوگر کے شر سے بھی پناہ چاہی گئی ہے۔ جس آدمی پر جادو کیا جاتا ہے عموماً اس کو پتہ نہیں چلتا کہ وہ اپنے آپ کو بچانے کی تدبیر کر سکے۔ مدتوں تک تو آدمی پریشان رہتا ہے، آدمی بیماری سمجھتا ہے، مختلف علاج و معالجے کرتا ہے، پھر بڑی مشکل سے اس کی تشخیص ہوتی ہے کہ یہ تو سحر ہے، پھر اس کے علاج کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تو سب کچھ جانتے ہیں، لہذا اگر پہلے ہی دن سے اللہ کی پناہ کا اہتمام کیا جائے، تو اللہ تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں، اور بچنے کی شکل پیدا فرماتے ہیں۔

## گھٹن؛ حسد کا پہلا درجہ:

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ (اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے)  
**حسد** کہتے ہیں کسی کی نعمت کو دیکھ کر دل کے اندر گھٹن پیدا ہونا۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کو دولت دی، اب آدمی دیکھتا ہے کہ اس کو دولت کیوں ملی؟ اس کی دولت کی وجہ سے اس کے دل میں تنگی اور گھٹن سی پیدا ہوتی ہے۔ کسی کو اللہ تعالیٰ نے کوئی عہدہ عطا فرمایا، کسی کا کاروبار خوب چل رہا ہے، دوکان خوب چل رہی ہے، فیکٹری خوب چل رہی ہے، اس کو دیکھ کر اس کے دل میں گھٹن ہو رہی ہے کہ اس کے پاس یہ نعمت کہاں سے آگئی؟ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی کو مقبولیت عطا فرماتے ہیں، اس کے کسی کام کی وجہ سے لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں، اور دیکھنے والوں میں بہت سے لوگوں کے دلوں میں گھٹن پیدا ہوتی ہے، اسی گھٹن کو حسد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ گھٹن حسد کا پہلا درجہ ہے۔

## دوسرا درجہ اور اس کا علاج:

دوسرا درجہ یہ ہوتا ہے کہ اس گھٹن کے بعد وہ یہ تمنا کرتا ہے کہ یہ نعمت اس کے پاس

کیوں ہے؟ اس سے یہ نعمت چھن جانی چاہیے۔ ان دو درجوں میں پہلا درجہ غیر اختیاری ہے۔ آدمی کے اختیار کو اس میں دخل نہیں، آدمی کے نہ چاہتے ہوئے بھی، غیر اختیاری طور پر دل میں خیال آ جاتا ہے؛ لیکن امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ آدمی کو چاہیے کہ اس کی طرف سے غافل نہ رہے؛ بلکہ اس خیال کو جمنے ہی نہ دے، اس سے پہلے ہی دل کو اس سے پاک و صاف کرنے کی کوشش کرے۔<sup>(۱)</sup>

## گھٹن کا علاج:

### (۱) توبہ و استغفار:

چنانچہ اس پہلے مرحلے میں اللہ سے توبہ و استغفار کرے، معافی چاہے کہ اے اللہ! میرے دل میں اس آدمی کی اس نعمت سے متعلق گھٹن کیوں آرہی ہے؟ تو یہ کیفیت ختم کر دے۔ اور اللہ سے توبہ کرے۔ یہ توبہ کا پہلا مرحلہ ہے۔

### (۲) ترقی کی دعاء:

دوسرا مرحلہ یہ ہے اس آدمی کے لیے ترقی کی دعاء کرے۔ یہ بڑا سخت مرحلہ ہے، بہت کڑوی گولی ہے۔ لیکن بھائی! بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ جب تک کڑوی گولیاں استعمال نہ کرے، وہاں تک وہ ٹھیک نہیں ہوتی ہیں۔ جیسے کسی کولرزہ والا بخار (ملیریا) ہو گیا ہو تو کوینائن (Quinine) استعمال کرنی ہی پڑے گی، بغیر کوینائن کے وہ جانے والا نہیں ہے۔ تو علاج کے اس دوسرے مرحلہ میں اس کے لیے دعا کرے کہ اے اللہ! اس کی اس

(۱) إحياء علوم الدين للغزالي: ۱۹۰/۳ - ۱۹۲ (ط: دار المعرفة، بيروت)

نعمت میں برکت عطا فرما۔ اس کی وجہ سے دل کٹے گا، گویا دل پر آ رہ چل رہا ہے، یہی اس کا علاج ہے، اس کے بغیر یہ چیز جانے والی نہیں ہے۔

### (۳) لوگوں میں تعریف:

علاج کا تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کرے۔ اس کی خوبیوں کو بیان کرے۔ اس کے دل میں تو گھٹن ہو رہی تھی، یہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اس کی تعریف کریں، جب اس سے اس کی مقبولیت نہیں دیکھی جاتی تھی تو بھلا اپنی زبان سے اس کی تعریف کرنا یہ کتنا مشکل کام ہے!!! اس سے بھی دل پر آ رہے چلیں گے۔ یہ دوسری کڑوی ٹیبلٹ ہے۔ یہ تین چیزیں ہیں، ان تین چیزوں کا اہتمام کریں گے، تو دل کی کیفیت بدلے گی۔

گھٹن کو دل ہی دل میں رہنے نہ دیں، رہنے دیں گے تو یہ اندر جمے گی، اور ترقی کرے گی، پھر اس کا علاج مشکل ہو جائے گا۔ اور گھٹن کی کیفیت عام طور پر ہر ایک کے دل میں پیدا ہوتی ہے، بعضوں کو کبھی کبھی دل میں خیال آتا ہے؛ لیکن اس کو فوراً دور کرنے کے لیے اللہ کے حضور توبہ و استغفار اور جس کے لیے یہ کیفیت پیدا ہو رہی ہے اس کے لیے ترقی کی دعا اور لوگوں کے اندر اس کی تعریف، یہ تین چیزیں کریں۔

دوسرا مرحلہ اس کی نعمت چھن جانے کی تمنا کا تھا۔ یہ بھی کبھی غیر اختیاری ہوتا ہے۔ اس کے متعلق بھی امام غزالی فرماتے ہیں کہ اس دوسرے مرحلے میں بھی آدمی کو مطمئن ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیے؛ بلکہ اس کی طرف خاص توجہ کر کے علاج کی طرف دھیان دینا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بیماری اندر سرایت کر جائے۔<sup>(۱)</sup>

## یہ خطرناک ہے:

تیسرا مرحلہ اختیاری ہے۔ وہ یہ ہے کہ نعمت چھن جائے اب تک تو یہ خیال تھا، اب وہ نعمت اس کے ہاتھ سے نکالنے کے لیے آپ تدبیریں کر رہے ہیں۔ جہاں اس کو اونچا مقام ملا تھا، جس ادارے کی طرف سے ملا تھا، یا جس کے ماتحت یہ کام کرتا ہے، اس کے ذمہ دار کی طرف سے اس کو یہ مقام دیا گیا تھا، اس کے پاس جا کر اس کی جھوٹی شکایتیں کرنا، اس کے متعلق اس کو بدگمان کرنا؛ تاکہ وہ اس کے پاس سے یہ کام واپس لے لے۔ بہت سے یہی کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ کوشش اختیاری ہے۔ یا اس کو بدنام کرنے کے لیے مستقلاً جھوٹی خبریں چلانا، اس کی غیبت کرنا، اس کے متعلق لوگوں میں بدگمانیاں پیدا کرنا، جھوٹا پروپیگنڈا کرنا، یہ اختیاری چیز ہے۔ یہ تیسرا درجہ خطرناک ہے، لہذا آدمی کو چاہیے کہ یہ پیدا ہونے سے قبل ہی پہلے دو درجوں میں ہی اس کے علاج کی طرف خصوصی توجہ کرے، اور اس کا طریقہ وہی ہے جو ابھی گزرا کہ توبہ و استغفار ہو۔ اور جس کے متعلق یہ چیز دل میں پیدا ہوئی ہے اس کے لیے دعاؤں کا اہتمام ہو، اور لوگوں کے سامنے اس کی خوبیوں کا پوری بشارت کے ساتھ تذکرہ کیا جائے۔ ورنہ یہ بیماری ایسی خطرناک ہے کہ آدمی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔

## حداک:

لوگ جادو بھی اسی لیے کرواتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے خلاف کچھ کر نہیں سکتے، لہذا اس کو تکلیف پہنچانے کے لیے جادو والا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ کسی جادوگر سے رابطہ کرتے ہیں، باقاعدہ پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ یہ کوئی نیکی کے لیے پیسہ خرچ کرنا ہوا؟ اس کو

پیسہ دے کر اس آدمی کے خلاف جادوئی عمل کرواتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ تکلیف میں گرفتار ہوتا ہے۔

اور جادوئی عمل میں کبھی کفر یہ باتیں یا کبھی کفر یہ کام کرنے پڑتے ہیں، تو آدمی کفر تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ حسد ایسا خطرناک مرض ہے کہ اس کے نتیجے میں آدمی ایمان تک سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور اگر تیسرے درجہ کی وجہ سے یہ کام نہ کریں تو بھی دل میں جو گھٹن ہے وہ تو ایک ایسی آگ لگی ہوئی ہے، جو اندر ہی اندر اس کو جلانے کا کام کر رہی ہے۔ اس لیے اس کو دور کرنے لیے جو تدبیر بتائی گئی اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔ ورنہ یہ حسد کی آگ آدمی کو کھا جاتی ہے۔

حسد بڑا خطرناک مرض ہے، اس سے بہت ساری مصیبتیں پیدا ہوتی ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ خود آدمی اس کا علاج کرے، اس کی طرف توجہ کرے۔ یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ باری تعالیٰ نے اس کے لیے مستقل ایک آیت وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ نازل فرمائی ہے۔

## حاسد مت بنیے:

دیکھو! آدمی کے دل میں غیر اختیاری خیال آیا، گھٹن پیدا ہوئی، پھر یہ خیال آیا کہ یہ نعمت اس سے چھن جائے، یہ غیر اختیاری ہے۔ یہ حاسد تو ہے؛ لیکن اس نے ابھی کوئی کارروائی شروع نہیں کی ہے۔ اور تیسرا درجہ جو بتایا، کارروائی شروع کی تو اب آپ پر تکلیف آئے گی۔ پہلے دو درجے تک محسود پر کوئی تکلیف نہیں ہے، حاسد خود ہی اپنی آگ میں جل رہا ہے؛ لیکن اگر یہ حسد یہاں ختم نہیں ہوا اور آگ بڑھا تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ محسود کے لیے

تکلیف میں مبتلا ہونے کی نوبت آئے گی۔ اور کون کس پر حسد کرتا ہے؟ پتہ چلتا نہیں ہے، اسی لیے اللہ کی پناہ حاصل کرے، وہ سب کے دلوں سے واقف ہے، وہی حسد کرنے والے کے شر سے بچا سکتے ہیں۔ اس لیے خاص طور پر اللہ کی پناہ حاصل کی گئی ہے۔ چناں چہ حسد سے اپنے آپ کو خاص طور سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

## آسمان وزمین میں سب سے پہلا گناہ؛ حسد:

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ نے تفسیر عزیزی میں لکھا ہے کہ سب سے پہلا گناہ جو آسمان میں ہوا وہ بھی حسد، اور سب سے پہلا گناہ جو زمین میں ہوا وہ بھی حسد۔  
آسمان میں: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کو پیدا کیا اور ان کو مقام عطا فرمایا تو شیطان نے آپ پر حسد کیا۔

زمین میں: حضرت آدم کے دو بیٹے ہابیل اور قابیل تھے۔ ہابیل کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا فرمائی وہ قابیل سے دیکھی نہیں گئی اور نتیجتاً اس نے اپنے بھائی کو قتل کرنے کی سازش کی اور قتل کیا۔<sup>(۱)</sup> تو مطلب یہ ہے کہ یہ حسد آدمی کو کہاں تک پہنچاتا ہے؟ قتل تک کرواتا ہے۔ تو آدمی کو چاہیے کہ اس حسد کی بیماری سے اپنے آپ کو چھٹکارا دینے کے لیے بھرپور کوشش کرے۔

## حسد، ایک حماقت:

حسد ایک حماقت ہی ہے۔ حسد کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ مال کیوں دیا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ عہدہ کیوں دیا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ عزت کیوں دی؟ اللہ تعالیٰ

(۱) تفسیر عزیزی پارہ ۵، ص: ۶۹۰، ط: کتب خانہ فیض ابرار، انگلشور، گجرات۔

نے یہ مقبولیت کیوں دی؟ گویا اللہ تعالیٰ ایک نعمت اپنے بندے کو دے رہے ہیں، اس پر اس حاسد کو اعتراض ہے۔ تو یہ اعتراض کس پر ہو رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ پر!!! اگر آپ اپنے ماتحتوں میں سے کسی کو کوئی چیز دیں، کوئی انعام دیں تو آپ کے ماتحتوں میں سے کوئی آپ پر اعتراض کرے کہ یہ آپ نے کیوں دیا؟ تو کیا آپ اس کو برداشت کر سکیں گے؟ نہیں۔ آپ اس کو سخت سے سخت سزا دیں گے۔ بھائی! تو کون بولنے والا؟ میری چیز تھی، میں نے اس کو دی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ. (الجمعة: ۴) اَمْرٌ يَّحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ. (النساء: ۵۴) یہ حسد کرنے والے؛ اللہ نے جس کو اپنے فضل سے نعمت دی ہے، اس پر حسد کرتے ہیں؟ ان کو کڑھن ہوتی ہے؟ ان کے پیٹ میں درد ہوتا ہے؟ بھائی! اللہ نے اس کو اپنے فضل سے دیا، آپ کے پیٹ میں کیوں درد ہوتا ہے؟ آپ کیوں تکلیف میں پڑ رہے ہیں؟ حاصل یہ ہے کہ یہ براہ راست اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے، یہ بڑا خطرناک مرحلہ ہے، اس سے آدمی ایمان تک سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہاں اس سورت میں اس سے پناہ چاہی گئی ہے کہ حاسد جب حسد پر اترتا ہے، اور تکلیف پہنچانے کے لیے میدان میں آتا ہے، تو مسئلہ بڑا سنگین ہو جاتا ہے۔ اس کے شر سے اللہ ہی حفاظت فرمائے۔ لہذا ہمیں خود بھی اپنے آپ کو حسد سے بچانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

## دین کو مونڈنے والی:

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **إياكم والحسد فإنه يأكل الحسنات كما تأكل النار الحطب.** (۱) تم اپنے آپ کو حسد سے بچاؤ، اس لیے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح

(۱) أخرجه البخاري في تاريخه تعليقا: ۲/ ۲۷۲ (ط: دائرة المعارف العثمانية حيدرآباد، دکن) و

أبو داود في سننه برقم: ۴۹۰۳ وغيرهما.



کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھاتی ہے۔ یعنی آگ سے لکڑی ختم ہو جاتی ہے تو حسد کی وجہ سے نیکیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے: **قد دب إليکم داء الأمم قبلکم: الحسد و البغضاء. هي الحالقة، لا أقول: تحلق الشعر، ولكن تحلق الدين. إلخ أو كما قال ﷺ.** (۱) **حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ:** تم میں رفتہ رفتہ وہ دو چیزیں آرہی ہیں، جو اگلی امتوں میں تھیں: حسد اور دشمنی۔ یہ مونڈنے والی ہیں، میں نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈتی ہیں، بلکہ دین کو مونڈتی ہیں۔ جو آدمی اس میں مبتلا ہوتا ہے وہ غیبت کرے گا، تہمتیں لگائے گا، اس کو تکلیف پہنچانے کی تدبیریں کرے گا، یہاں تک کہ سب کچھ کر ڈالتا ہے۔ الحاصل یہ چیز آدمی کو دین سے محروم کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس لیے حسد سے اپنے آپ کو نہایت اہتمام کے ساتھ بچانے کی ضرورت ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہم سب کو اس مرض سے بھی اور اس مرض میں جو گرفتار ہیں ان کی وجہ سے جو تکلیفیں پہنچ سکتی ہیں ان سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

(۱) أخرجه الترمذي في جامعه برقم: ۲۵۱۰ (ط: مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر) وغيره.

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورۃ ناس

(مؤرخہ ۶/ رجب المرجب ۱۴۳۹ھ مطابق: ۲۴/ مارچ ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

(قسط-۱)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِيْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ  
 بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرٍ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاَتٍ اَعْمَالِنَا وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرٍ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاَتٍ  
 اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُّضِلِّهٖ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ  
 وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ اَرْسَلَهُ اِلَى  
 كَافَّةِ النَّاسِ بِشِيْرٍ اَوْ نَذِيْرٍ اَوْ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهِ وَسِرَّ اَجَامُنِيْرٍ اَصْلَى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَ  
 عَلَى اٰلِهِ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّم تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ.

أعوذ بالله من الشيطان الرجيم . بسم الله الرحمن الرحيم .

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿١﴾ مَلِكِ النَّاسِ ﴿٢﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ﴿٣﴾ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ  
 الْخَنَّاسِ ﴿٤﴾ الَّذِي يُّوسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ﴿٥﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿٦﴾

یہ معوذتین کی دوسری سورت ہے، پہلی سورہ قلقل تھی، اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور  
 یہ دوسری سورہ ناس ہے۔ دونوں کا شان نزول اور سبب نزول بتلایا جا چکا ہے۔ اب یہاں  
 اس کا ترجمہ دیکھتے ہیں۔

## دونوں سورتوں میں منرق:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (اے نبی! آپ کہیے کہ میں پناہ مانگتا ہوں سب لوگوں کے

## پروردگار کی

ان دونوں سورتوں میں بڑا فرق ہے۔

فرق یہ ہے کہ سورہ فلق میں پناہ صرف اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ذکر کر کے اس کے واسطے سے مانگی گئی، اسی کی پناہ حاصل کی گئی۔ اور جن چیزوں سے پناہ مانگی گئی تھی وہ کل چار ہیں: (۱) تمام مخلوق جو اللہ نے پیدا کی۔ (۲) اندھیری رات کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے، پھیل جائے۔ (۳) گرہوں پر پھونک مارنے والی جانیں۔ (۴) حسد کرنے والے کے شر اور حسد سے، جب کہ وہ حسد کرنے پر آوے۔ جن سے پناہ مانگی گئی ہے وہ کل چار ہیں، اور جس کی پناہ حاصل کی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ایک ذات ہے۔ اس لیے کہ یہاں دنیوی مصائب سے پناہ چاہی گئی ہے۔ اور یہ مصائب صرف انسانوں کے ساتھ خاص نہیں ہیں؛ بلکہ دیگر مخلوقات کو بھی پیش آسکتی ہیں، اس لیے اللہ کی ایک صفت **رب الفلق** کو بیان کیا گیا۔

اور سورہ ناس میں ہے کہ میں تمام لوگوں کے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔ انسانوں کا تذکرہ اس لیے کیا کہ اس میں جس مصیبت کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ دنیوی نہیں؛ بلکہ اخروی ہے، اور اس کا تعلق انسانوں سے ہے، دوسری مخلوقات کو یہ مصیبت پیش نہیں آتی، انسان اور جنات ہی کو پیش آتی ہے، اور انسان کو زیادہ پیش آتی ہے؛ اس لیے یہاں رب الناس کا تذکرہ کیا گیا کہ میں پناہ چاہتا ہوں تمام لوگوں کے پروردگار کی۔

مَلِكِ النَّاسِ (تمام لوگوں کے بادشاہ کی)

إِلَهِ النَّاسِ (تمام لوگوں کے معبود کی پناہ چاہتا ہوں)

## احسروى نقصان بڑا ہے:

یہاں اللہ کی تین صفات کا تذکرہ کیا گیا: (۱) صفت ربوبیت (۲) صفت ملکیت

(۳) صفت الوہیت۔ گویا تین صفات کے واسطے سے اللہ کی پناہ حاصل کی گئی۔ اور جس چیز سے پناہ چاہی گئی ہے وہ ایک ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس دوسری سورت میں معوّذ منہ۔ وسوسہ ڈالنے والا شیطان۔ کتنا خطرناک ہے!!! یہ اخروی مصیبت ہے، دین سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ اس وسوسہ کی وجہ سے خدا نخواستہ ایمان برباد ہو گیا، تو آخرت خراب ہو جائے گی۔ سورہ فلق میں جن چار چیزوں سے پناہ مانگی گئی تھی ان کا تعلق اور ان کا نقصان صرف دنیوی ہے۔ اور سورہ ناس میں مذکور چیز کا تعلق آخرت سے ہے، اس لیے اس میں بڑا اہتمام کیا گیا، اور اللہ تعالیٰ کی تین صفات کے حوالے سے اللہ کی پناہ چاہی گئی۔

پروردگار جس کی پرورش کرتا ہے وہ اس کی حفاظت کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کا پروردگار ہے تو ان کی حفاظت کا بھی انتظام کریں گے۔ بادشاہ اپنی رعیت کی حفاظت کا اہتمام کرتا ہے، اور معبود اپنی عبادت کرنے والوں کی حفاظت کا اہتمام کرتا ہے۔ گویا یہاں تین تین طریقوں سے حفاظت کو مد نظر رکھا گیا، اور پھر جو پناہ چاہی گئی وہ ایک شر سے کہ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو پیچھے کو چھپ جاتا ہے۔

**الوسواس** عربی زبان کا مصدر ہے؛ یہاں اسم فاعل کے معنی میں ہے، اور مصدر جب اسم فاعل کے معنی میں لیا جائے، تو مبالغہ مقصود ہوتا ہے، یعنی بہت زیادہ وسوسہ ڈالنے والا۔ اور اتنا ہی نہیں کہ وسوسہ ڈالے؛ بلکہ **خناس** وسوسہ ڈال کر پیچھے کو چھپ جاتا ہے۔ **خَنَّسٌ - يَخْنِسُ** کا معنی پیچھے چھپ جانا ہے۔ لہذا اگر وہ جنات و شیاطین میں سے ہے، تو نظر نہیں آتا، پھر مزید برآں کہ وہ وسوسہ ڈال کر چھپ بھی جاتا ہے۔

## وسوسہ کیسے ڈالتا ہے؟

حدیث شریف میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: شیطان انسان کے قلب پر اپنی سونڈ رکھتا ہے۔ جب بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے، تو پیچھے چھپ جاتا ہے اور جب ذکر سے غافل ہوتا ہے، تو قلب میں وسوسے ڈالنے لگتا ہے۔ <sup>(۱)</sup> جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ مچھر کاٹنے کے لیے آتا ہے تو کیسا اپنی سونڈ رکھتا ہے۔ ایک بزرگ نے عالم مکاشفہ میں شیطان کو دیکھا تو اسی شکل میں دیکھا کہ وہ انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے؛ لیکن انسان جب اللہ کو یاد کرتا ہے، اللہ کا ذکر کرتا ہے، تو وہ فوراً پیچھے کھسک جاتا ہے۔ گویا بہت زیادہ پیچھے کو چھپنے والا اور بہت زیادہ وسوسہ ڈالنے والا۔ وسوسہ بھی ڈالتا ہے اور جوں ہی اللہ کا ذکر ہوتا ہے، ویسے ہی پیچھے چھپ بھی جاتا ہے۔

## وسوسہ کیا ہے.....؟

شیطان برائی کے وسوسے ڈالنے کے لیے دل کے راستہ سے اپنا اثر پیوست کرتا ہے، دل سے باتیں کرتا ہے۔ وسوسہ کیا ہے؟ شیطان کا انسان کے دل سے باتیں کرنا۔ ہمیں آواز تو سنائی دیتی ہے دل میں، وہ سامنے آتا ہے، لیکن نظر نہیں آتا۔ اسی طرح شیطان انسانی قلوب میں اپنا اثر پیوست کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (چاہے جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے)

(۱) أخرجه ابن أبي الدنيا في مكايد الشيطان: ۱ / ۱۹ (ط: المركز العربي للكتاب، الإمارات العربية المتحدة - الشارقة) وأبو يعلى الموصلي في مسنده: ۴ / ۲۷۸ (ط: دار المأمون للتراث، دمشق) وابن عدي في الكامل: ۲ / ۱۲۹ (ط: دار الكتب العلمية بيروت، لبنان)

دونوں میں سے ہو سکتا ہے۔ شیاطین جن کی ایک قسم ہے۔ كَانَ مِنَ الْجِنَّ۔  
(الکھف: ۵۰) باری تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں۔ ابلیس سب شیطانوں کا باوا ہے، یہ بھی  
جنات کی قسم سے تھا۔

## انسان بھی وسوسہ ڈالتے ہیں:

وسوسہ ڈالنے والے صرف شیاطین ہی نہیں؛ انسان بھی ہوتے ہیں۔ شیاطین نظر  
نہیں آتے، اور انسان نظر آتے ہیں، بات چیت کرتے ہیں۔ جو لوگ دوسروں کو برائی کی  
ترغیب دیتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں؟ دوسروں کے سامنے اُن غلط کاموں کی خوبیاں اس  
انداز سے بیان کرتے ہیں کہ وہ سن کر کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہی ہے وسوسہ اندازی۔  
چنانچہ اس سورت میں وسوسہ ڈالنے والا چاہے جنات ہو یا انسان، دونوں سے پناہ چاہی  
گئی ہے۔ چوں کہ اس کا نقصان آخرت سے متعلق ہے، اس لیے اس کا بڑا اہتمام کیا گیا۔  
شیطان ہی انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ بہت سی مرتبہ تو اس کے وسوسہ ڈالنے کی وجہ  
سے لوگ ایمان سے محروم ہو جاتے ہیں، یا اس کی ایمان سے محرومی کی کوشش تو رہتی ہے؛ مگر  
وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اور کبھی بجائے ایمان سے محرومی کے؛ گناہوں اور فسق و فجور  
کے وسوسے ڈالتا ہے، اور کبھی انہی وسوسوں کے نتیجہ میں آپس کے تعلقات خراب ہوتے  
ہیں۔ بھائی۔ بھائی میں لڑائی ہوتی ہے، میاں بیوی میں جھگڑا ہوتا ہے، اور اسی جھگڑے کے  
نتیجہ میں طلاق کی نوبت آتی ہے۔ یہ سب کون کراتا ہے؟ شیطان!

## گھر یلو جھگڑے ایک وظیفہ:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ شیطان پانی پر اپنا تخت بچھاتا ہے اور پھر اپنے چیلوں

چپاٹوں، چھوٹے چھوٹے شیاطین، شتو نگڑوں سے رپورٹ لیتا ہے، وہ سب اس کے سامنے آکر اپنے کارنامے بیان کرتے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ میں فلاں آدمی کے پیچھے رہا، وہ نماز پڑھنے کے لیے جا رہا تھا، تو اس کو نماز پڑھنے نہیں جانے دیا، دوسرے کام میں لگا دیا۔ فلاں آدمی فلاں نیک کام کرنے جا رہا تھا، میں نے اس کو وہاں سے ہٹا کر دوسرے کام میں مشغول کر دیا۔ اس طرح ہر ایک اپنا کارنامہ بیان کرتا ہے۔ وہ سب سے کہتا ہے: تم نے کچھ نہیں کیا اسی دوران ایک آکر کہتا ہے کہ میں نے میاں بیوی میں لڑائی جھگڑا کرایا، یہاں تک کہ طلاق کی نوبت آگئی۔ تو وہ اسے اپنے قریب کرتا ہے اور کہتا ہے: **نعم أنت** (تو بڑا اچھا آدمی ہے) یہاں تک کہ اسے گلے لگا لیتا ہے۔ <sup>(۱)</sup> چنانچہ جو طلاقیں واقع ہوتی ہیں، میاں بیوی کے جھگڑے ہوتے ہیں، ان میں بھی شیطان کی وسوسہ اندازی کا دخل ہوتا ہے۔ اور اس سے حفاظت کا طریقہ یہی ہے کہ ان سورتوں کو بکثرت پڑھنے کا معمول بنایا جائے۔ جہاں میاں بیوی کے جھگڑے بہت ہوتے ہوں اس کا بہت آسان وظیفہ ہے کہ اس سورت کو پڑھنے کا اہتمام کیا جائے۔ شیطان کی وسوسہ اندازی کی وجہ سے ہی ایسا ہوتا ہے۔

## نماز کا وسوسہ:

آدمی کو جو وسوسے ڈالے جاتے ہیں ان کو علما نے لکھا ہے اور بعض روایتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے، جیسے نماز میں وسوسہ۔ بخاری شریف کی روایت ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں: جب اذان ہوتی ہے تو شیطان اذان کی آواز سن کر ہوا چھوڑتا ہوا بھاگتا ہے۔ <sup>(۲)</sup> اس لیے کہ

(۱) أخرجه مسلم برقم: ۲۸۱۳.

(۲) أخرجه البخاري برقم: ۶۰۸.

جو بھی اذان کی آواز سنے گا، اللہ تعالیٰ نے اس پر لازم کر دیا ہے کہ وہ گواہی دے، اور شیطان گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس لیے شیطان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کے کان میں اذان کی آواز نہ آئے۔ اس لیے وہ بھاگتا ہے، اور بھاگ کر ایسی جگہ چلا جاتا ہے، جہاں اذان کی آواز نہ آئے۔ پھر واپس آ جاتا ہے۔ پھر جب نماز کے لیے اقامت کہی جاتی ہے، تو چوں کہ اقامت بھی **أحد الأذنین** (دو اذانوں میں سے ایک اذان) کہلاتی ہے، وہی کلمات اقامت کے بھی ہیں، پھر بھاگ جاتا ہے۔ پھر جب اقامت پوری اور نماز شروع ہوتی ہے تو وہ انسان کے دل پر آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جو چیزیں اس کو نماز سے پہلے یاد نہیں تھیں، جن کی طرف اس کا دھیان بھی نہیں تھا، نماز کی نیت باندھی نہیں کہ یہ یاد کر، یہ یاد کر سب اس کو یاد دلاتا ہے۔ عجیب عجیب چیزیں اس کو یاد دلاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی قراءت بھی بھول جاتا ہے، اس کو غلطی ہو جاتی ہے۔ یہ نماز کا وسوسہ ہے۔ (۱)

### وضو کا وسوسہ:

وضو نماز کا مقدمہ ہے، وضو میں بھی وسوسہ ڈالتا ہے۔ وضو میں وسوسہ ڈالنے والا مستقل ایک الگ شیطان، جس کا نام **ولہان** ہے۔ (۱) بعض لوگ وضو میں بھی وسوسہ کا شکار ہوتے ہیں، وضو کرنے کے لیے بیٹھتے ہیں تو آدھا آدھا گھنٹے، ایک ایک گھنٹے تک ان کا وضو ہی ختم نہیں ہوتا، یہ شیطان کا اثر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کوئی آدمی کب تک اس کا مقابلہ کرے گا؟ کچھ مدت کے بعد آدمی مایوس ہو کر کہ بھی! یہ ہمارے بس کا نہیں ہے، نماز ہی چھوڑ دے گا۔ اور اس کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ اور ان وسوسوں کا علاج بھی یہی ہے کہ اس



کے ان وسوسوں پر عمل نہ کیا جائے۔

## اب تو بغیر وضو کے ہی نماز پڑھوں گا:

حضرت گنگوہیؒ کے متعلق لکھا ہے: حضرت فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ وضو کر کے اٹھا، تو خیال آیا کہ کہنی ذرا خشک رہ گئی ہے، تو گیا اور اس کو دھولیا۔ تاکہ خشک دور ہو جائے۔ اس کے بعد نماز کی نیت باندھنا ہی چاہتا تھا کہ پھر خیال آیا کہ دوسری بھی خشک رہ گئی ہے، پھر جا کر اس کو دھویا۔ تاکہ یہ شبہ بھی باقی نہ رہے۔ پھر نماز کی نیت باندھنا ہی چاہتا تھا کہ خیال آیا کہ پاؤں کا ٹخنہ ذرا خشک رہ گیا ہے۔ جب یہ خیال آیا تو سوچا کہ یہ تو گرو گھنٹال ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ: میں نے کہا: اب تو میں بغیر وضو کے ہی نماز پڑھوں گا۔ پھر نہیں گیا۔ اس کا یہی ایک علاج ہے۔

موطا امام مالک میں ہے: حضرت سعید بن مسیبؒ - جو کبار تابعین میں سے ہیں ان - کے پاس ایک آدمی آیا، اور کہا: جب میں نماز کی نیت باندھتا ہوں، تو نماز میں یہ خیال آتا ہے کہ کچھ قطرہ نکلا، کچھ تری مجھے محسوس ہوتی ہے۔ تو حضرت سعید بن مسیبؒ نے کہا کہ وہ میری ران پر بہہ کر نیچے اترے گا، تب بھی نماز نہیں توڑوں گا۔<sup>(۱)</sup> شیطان اس طرح نماز سے ہٹانا چاہتا ہے۔

## وہم کا علاج:

بخاری شریف میں ہے: ایک آدمی کے متعلق حضور ﷺ سے عرض کیا گیا کہ وہ نماز

(۱) الموطأ للإمام مالک: ۵۲ (ط: دار إحياء التراث العربی، بیروت، لبنان)

کی نیت باندھتا ہے تو اس کو خیال آتا ہے کہ ہوا خارج ہوئی۔ اور اس کی وجہ سے وہ نماز توڑ کر وضو کے لیے جاتا ہے۔ اور اس کو بار بار یہ وہم ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ گیس کی وجہ سے ہوا خارج تک آکر واپس چلی جاتی ہے؛ لیکن آدمی کو یوں خیال آتا اور شبہ ہو جاتا ہے کہ شاید ہوائی ہو اور وضو ٹوٹ گیا ہو۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: جب تک آواز نہ سنے یا بو محسوس نہ کرے تب تک نماز نہ توڑے۔<sup>(۱)</sup> اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ جس کو یہ مرض نہیں ہے، اس کو یقین ہے کہ ہوائی، پھر وہ یوں کہے کہ میں نے آواز تو سنی نہیں۔ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جو وہم کا شکار ہو، اسی کو حضور ﷺ نے بیماری سے نکالنے کے لیے ایک تدبیر بتلائی۔ ورنہ اصل تو یہ ہے کہ جب کسی کو وضو کے ٹوٹنے کا یقین ہو جائے تو چاہے بدبو محسوس ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، آواز سنی ہو یا نہ سنی ہو، وضو کرنا ہے۔

آئندہ مجلس میں وساوس کے موضوع پر ان شاء اللہ، اللہ نے توفیق دی تو مستقلاً بات کریں گے۔ ابھی تو ترجمہ ہی پراکتفا کرتے ہیں۔

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ کہیے کہ میں پناہ مانگتا ہوں سب لوگوں کے پروردگار کی۔

مَلِكِ النَّاسِ تمام لوگوں کے بادشاہ کی۔

إِلَهِ النَّاسِ تمام لوگوں کے معبود کی۔

مِنْ شَمْلِ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ اس وسوسہ ڈالنے والے کی برائی اور شر سے جو پیچھے کو چھپ جاتا ہے۔ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔

مِنْ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ چاہے وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

بہر حال! معوذتین کے خاص خاص فضائل ہیں۔ اور خاص مقصد کے لیے نازل کی

گئی تھیں، اس لیے نبی کریم ﷺ نے بھی مختلف مواقع پر اس کے پڑھنے کی تاکید فرمائی اور ان کے فضائل بیان کیے ہیں۔

## [۱] پریشانی کے وقت معوذتین کا ورد:

ابوداؤد شریف کی روایت ہے، حضرت عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ سرور عالم ﷺ کے ہمراہ جحفہ اور ابواء کے درمیان تھا کہ اچانک آندھی آئی، اور سخت اندھیرا ہو گیا، حضور اکرم ﷺ سورۃ قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس کے ذریعہ اس مصیبت سے اللہ کی پناہ مانگنے لگے، یعنی ان کو پڑھنے لگے، اور فرمایا: اے عقبہ! ان سورتوں کے ذریعہ اللہ کی پناہ حاصل کرو! کیوں کہ ان جیسی اور کوئی چیز نہیں جس کے ذریعہ کوئی پناہ لینے والا پناہ حاصل کرے۔ اور پھر آپ نے ہمیں نماز پڑھائی اور یہی دونوں سورتیں نماز میں پڑھیں۔<sup>(۱)</sup>

دیکھو! بارش کے موسم میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خوب اندھیرا چھا جاتا ہے، بارش کی وجہ سے ایک طوفان کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے؛ لیکن ہمیں کبھی ان سورتوں کے پڑھنے کا خیال نہیں آتا۔ اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔

## [۲] پریشانی کے وقت پڑھنے کا عمل:

حضرت معاذ بن عبد اللہ بن خبیبؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم ایسی رات میں جس میں بارش ہو رہی تھی اور سخت اندھیرا بھی تھا، حضور ﷺ کو تلاش کرنے کے لیے نکلے، چناں چہ ہم نے آپ ﷺ کو پالیا، آپ ﷺ نے فرمایا: کہو۔ میں نے عرض کیا: کیا کہوں؟

(۱) أخرجه أبو داود في سننه برقم: ۱۲۶۳.

حضور ﷺ نے فرمایا: جب صبح اور شام ہو سورۃ قل هو اللہ احد، سورۃ قل اعوذ برب الفلق اور سورۃ قل اعوذ برب الناس تین بار پڑھ لو۔ یہ عمل کر لو گے تو ہر ایسی چیز سے تمہاری حفاظت ہو جائے گی جس سے پناہ لی جاتی ہے۔ (یعنی ہر موزی سے اور ہر بلا سے محفوظ ہو جاؤ گے) (۱)

کبھی معوذات، جمع کا صیغہ بھی بولا جاتا ہے تو اس میں سورۃ قل هو اللہ بھی شامل کر لی جاتی ہے۔

### [۳] فرض نمازوں کے بعد پڑھنے کا معمول

حضرت عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ ہر نماز کے بعد معوذات پڑھا کروں۔ (۲)

اس کی عادت بنا لو تو بہت اچھی بات ہے۔

### [۴] سفر میں، نماز خیر میں:

حضرت عقبہ بن عامرؓ نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ سفر میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے عقبہ! کیا میں تمہیں دو بہترین سورتیں نہ بتاؤں؟ پھر حضور ﷺ نے مجھے قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس دونوں سورتیں سکھائیں۔ آپ ﷺ کو اندازہ ہوا کہ مجھے زیادہ خوشی نہیں ہوئی، جب فجر کی نماز کے لیے اترے تو حضور ﷺ نے ان دونوں

(۱) أخرجه الترمذي في جامعه برقم: ۳۵۷۵ وأبو داود في سننه برقم: ۵۰۸۲.

(۲) أخرجه أحمد في المسند برقم: ۱۷۱۷ (ط: مؤسسة الرسالة) وأبو داود في سننه برقم: ۱۵۲۳.

وغیرہما.

سورتوں کی نماز میں تلاوت فرمائی۔ اور نماز سے فارغ ہو کر فرمایا: بولو عقبہ! تم نے کیسا دیکھا؟ (یہ فرما کر آپ نے ان دونوں کی فضیلت بتائی) <sup>(۱)</sup>

## [۵] رات کا ایک عمل:

بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ روزانہ رات کو جب حضور ﷺ بستر پر تشریف لاتے تو سورۃ قل هو اللہ احد، سورۃ قل اعوذ برب الفلق اور سورۃ قل اعوذ برب الناس پڑھ کر ہاتھ کی دونوں ہتھیلیوں کو ملا کر ان میں اس طرح پھونک مارتے تھے کہ کچھ تھوک بھی پھونک کے ساتھ نکل جاتا تھا۔ پھر دونوں ہتھیلیوں کو پورے بدن پر جہاں تک ممکن ہوتا تھا، پھیر لیتے تھے۔ یہ ہاتھ پھیرنا سر اور چہرے سے اور سامنے کے حصے سے شروع فرماتے تھے، اور یہ عمل تین بار کرتے۔ <sup>(۲)</sup>

## [۷] بیماری کا ایک عمل:

بخاری شریف میں ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کو جب کوئی تکلیف ہوتی تھی تو اپنے جسم پر سورۃ قل اعوذ برب الفلق اور سورۃ قل اعوذ برب الناس پڑھ کر دم کیا کرتے تھے، (جس کا طریقہ اوپر گزرا) پھر جس مرض میں آپ ﷺ کی وفات ہوئی اس میں، میں (حضرت عائشہؓ) یہ عمل کرتی تھی۔ (چوں کہ بیماری کی شدت کی وجہ سے حضور ﷺ بول نہیں سکتے تھے، پڑھ نہیں سکتے تھے) کہ میں دونوں سورتیں پڑھ کر آپ

(۱) أخرجه أبو داود في سننه برقم: ۱۲۶۲.

(۲) أخرجه البخاري برقم: ۵۰۱۷.

کے ہاتھ مبارک پر دم کر دیتی تھی، پھر آپ ﷺ کے ہاتھوں کو آپ کے جسم پر پھیر دیتی تھی۔ آپ کے ہاتھوں سے برکت کے حصول کے لیے۔ (۱)

بہر حال! یہ سورتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں، ان کو پڑھنے کی عادت ڈالو، صبح اور شام تو یقیناً پڑھا کرو، اور ہر نماز کے بعد اگر پڑھیں تو بہت اچھا ہے۔ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ ہر مصیبت سے حفاظت فرمائیں گے۔

آج کل لوگ شکایت کرتے ہیں کہ فلاں نے یہ کر دیا، فلاں نے جادو کر دیا، کچھ کالا کر دیا۔ یہ سب اس لیے ہے کہ حفاظت کے جو طریقے نبی کریم ﷺ نے بتلائے ہیں، ان کا ہم اہتمام نہیں کرتے۔ ہمارے اسلاف کے یہاں ان سب چیزوں کا بڑا اہتمام تھا، وہ یہ سب کرتے تھے اس لیے وہ محفوظ بھی رہتے تھے۔ آج کل تو ساری چیزیں چھوٹ ہی گئی ہیں، ان کی طرف ہماری توجہ ہی نہیں ہے۔ اس لیے ان ساری چیزوں پر عمل کی عادت ڈالی جائے، اپنے بچوں کو بھی سکھایا جائے، تاکہ بچپن سے ہی وہ اس کے عادی بن جائیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان شاء اللہ اس طرح کی مصیبتوں سے حفاظت فرمائیں گے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورۃ ناس

(مؤرخہ ۱۲ رجب المرجب ۱۲۳۹ھ مطابق ۳۱ مارچ ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

(قسط-۲)

الْحَمْدُ لِلَّهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ  
بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ  
أَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ  
وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ أَرْسَلَهُ إِلَى  
كَافَّةِ النَّاسِ بِشِيرٍ أَوْ نَذِيرٍ أَوْ دَاعِيٍّ إِلَى اللَّهِ يَازِنُهُ وَسِرَاجًا مُنِيرًا صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَ  
عَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا. آمَنَّا بَعْدُ.

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ. بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ.

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿١﴾ مَلِكِ النَّاسِ ﴿٢﴾ إِلَهِ النَّاسِ ﴿٣﴾ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ﴿٤﴾  
الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ﴿٥﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿٦﴾

## گزشتہ سے پیوستہ:

اگلی مجلس میں سورۃ ناس کا ترجمہ ہو چکا تھا، وضاحت بھی آئی تھی، آج پھر دوبارہ  
ترجمہ سن لیجیے۔

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ (کہیے کہ میں پناہ مانگتا ہوں سب لوگوں کے پروردگار کی)  
 مَلِكِ النَّاسِ (تمام لوگوں کے بادشاہ کی)  
 إِلَهِ النَّاسِ (تمام لوگوں کے معبود کی)

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ اس وسوسہ ڈالنے کے  
 والے کی برائی اور شر سے جو پیچھے کو چھپ جاتا ہے۔ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔  
 مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ چاہے وہ جنات میں سے ہو، چاہے انسانوں میں سے۔

## دین دار طبقہ کا سب سے بڑا پرابلم:

میں نے اگلی مجلس میں وعدہ کیا تھا کہ وسوس کے متعلق کچھ عرض کروں گا؛ کیوں کہ  
 آج کل دین دار طبقہ کو سب سے بڑا پرابلم انھیں خیالات اور وسوس کا ہے۔ بہت سے لوگ  
 ان کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں اور تکلیف کا شکار ہوتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ  
 اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ نے جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں (بالخصوص حضرات صحابہؓ کے  
 سوالات کے جواب میں) وہ آپ کے سامنے وضاحت اور تفصیل کے ساتھ پیش کی جائیں؛  
 تاکہ اس سلسلے میں آپ کو ایسی معلومات ہوں جو اطمینان کا ذریعہ بنیں۔

اللہ تبارک و تعالیٰ حضرات صحابہؓ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ انہوں نے بہت سی  
 ہمیں پیش آنے والی باتیں حضور اکرم ﷺ سے پوچھیں، اور آپ ﷺ نے ان کا جواب  
 دے کر اس کا حل بتلایا۔

## روایاتِ وسوس:

وسوس کے سلسلے میں بھی حضور اکرم ﷺ کے بہت سارے ارشادات ہیں۔



ہمارے مدارس میں عربی کے چھٹے سال میں مشکوٰۃ شریف پڑھائی جاتی ہے، اس میں صاحب مشکوٰۃ نے مستقل ایک باب قائم کیا ہے باب فی الوسوسۃ اس باب کے تحت بہت سی روایات صاحب مشکوٰۃ نے پیش کی ہیں۔ ان سب کا پیش کرنا تو مشکل ہے، بقدر ضرورت کچھ باتیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

(۱) حضور اکرم ﷺ کا ایک ارشاد بخاری شریف اور دوسری احادیث کی کتابوں میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے منقول ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: **إِنَّ اللَّهَ تَجَاوَزَ لِي عَنْ أُمَّتِي مَا وَسَّوَسَتْ بِهِ صَدُورُهَا، مَا لَمْ تَعْمَلْ أَوْ تَكَلَّمْ**۔ (اللہ تبارک و تعالیٰ نے میری امت سے معاف کر دیا ان چیزوں کو جن کے ان کے دلوں میں وسوسے آتے ہیں جب تک کہ وہ ان پر عمل نہ کریں یا ان کو اپنی زبان سے ادا نہ کریں) (۱)

(۲) دوسری روایت مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: **إِنَّا سَأَلْنَا مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ سَأَلُوا النَّبِيَّ ﷺ إِنَّا نَجِدُ فِي أَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاطَمُ أَحَدُنَا أَنْ يَتَكَلَّمَ بِهِ**۔ (حضور ﷺ کے صحابہ میں سے بعض نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ ہم اپنے دلوں میں کچھ ایسی باتیں پاتے ہیں جن کا اپنی زبان سے بولنا اور ظاہر کرنا ہمیں بہت بھاری اور گراں معلوم ہوتا ہے) (۲) تو نبی کریم ﷺ نے ان کا یہ سوال سن کر ان سے پوچھا: **أَوْ قَدْ وَجَدْتُمُوهُ؟** کیا واقعۃً دل کی یہ کیفیت ہے؟ یعنی ان خیالات کی وجہ سے آپ کو ایسا ہوتا ہے اور ان کو ظاہر کرنا بہت گراں اور بھاری سمجھتے ہو؟ صحابہؓ نے کہا: **نعم**۔ جی ہاں! تو

(۱) أخرجه البخاری برقم: ۲۵۲۸

(۲) أخرجه مسلم برقم: ۱۳۲

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **ذالک صریح الإیمان** (یہ تو کھلم کھلا ایمان ہے)۔

(۳) تیسری روایت مشکوٰۃ شریف میں حضرت ابن عباسؓ کی ہے: **أن رجلاً**

**سأل النبي ﷺ إني أحدث نفسي بالشيء لأن أكون حممة أحب إلي من أن اتكلم به**۔ (ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: میں دل ہی دل میں باتیں کرتا ہوں،

میں جل کر کوئلہ ہو جاؤں یہ مجھے زیادہ پسند ہے نسبت اس کے کہ میں ان باتوں کو اپنی زبان سے بولوں) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **الحمد لله الذي رد أمره إلى الوسوسة**۔ (تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے اس کا معاملہ وسوسہ تک محدود کر دیا) <sup>(۱)</sup>

ان ہی تین روایات کو سامنے رکھ کر آج آپ کے سامنے اس موضوع پر کچھ بات کرتا ہوں؛ تاکہ آج کل لوگوں کو خاص کر نوجوانوں کو رہبری ملے۔

## شیطان بے وقوف تھوڑا ہے:

یاد رکھنا! وساوس دین دار طبقے اور ایمان والوں کو ہی پیش آتے ہیں۔ کافروں کو تو کاہے کو آئیں گے؟ اس لیے کہ شیطان ان وساوس کے ذریعہ سے ہی سامنے والے کو اپنا شکار بناتا ہے۔ کافر تو پہلے سے کافر ہی ہے، شیطان کو اس کو وسوسہ ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ اپنی محنت کیوں بے کار اور برباد کرے گا؟

ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ہمارے حضرت مفتی محمود حسن صاحبؒ جس زمانہ میں تدریس کی نسبت سے مظاہر علوم میں مقیم تھے۔ (یہ آزادی سے پہلے کی بات ہے) اس زمانے میں قادیانیت کا زور تھا، اور بہت سے لوگ قادیانی ہو رہے تھے، اس وقت ایک شیعہ آیا ہوا تھا

(۱) السنن لأبی داود: ۵۱۱۲ و مشکوٰۃ المصابیح: ۴۳۔

اور وہ کئی روز مدرسہ کے مہمان خانہ میں ٹھہرا، اور مختلف مسائل پر مفتی صاحب سے اس نے باتیں کیں، سوالات و جوابات کیے۔ اس نے اپنے مذہب شیعیت کی حقانیت کو ظاہر کرنے کے لیے ایک بات یہ بھی کہی کہ جتنے بھی لوگ قادیانی بنتے ہیں، وہ سب سنی ہوتے ہیں۔ ایک بھی شیعہ آج تک قادیانی نہیں بنا۔ حضرت نے جواب میں فرمایا کہ شیطان بے وقوف تھوڑا ہے؟ جو اپنی محنت ضائع کرے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ شیعہ تو پہلے سے ہی کافر ہے، تو اس پر محنت کر کے کا ہے کو وقت ضائع کروں جس کے پاس ایمان ہو اس کو محروم کروں۔ بہر حال! حقیقت یہ ہے کہ یہ وسوسے ایمان والوں کو آتے ہیں اور ان میں بھی دین دار طبقہ ہی کو زیادہ آتے ہیں۔

## وسوسہ کی اقسام:

### (۱) ایمانیات سے متعلق:

ان وسوسوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ ہر ایک کا حل میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔  
(ان شاء اللہ)

(۱) وسوسہ کی پہلی قسم ایمانیات سے متعلق ہے۔ ہمیں ایمان لانے کا حکم دیا گیا،

آپ بچپن سے پڑھتے ہیں: **أَمِنَّا بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْقَدَرِ**  
**خَيْرِهِ وَشَرِّهِ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ**۔ (ایمان لایا میں اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، قیامت کے دن پر، تقدیر پر بھلا ہو یا برا سب اللہ کی طرف سے ہے۔ اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے پر) یہ ایمان مفصل ہے، اس میں ان باتوں کو کوڈ کر کیا گیا ہے۔ یہ احکامات قرآن میں بھی ہیں۔

## امنت باللہ:

[۱] اللہ پر دو چیزوں کا ایمان لانا ہے، ایک تو اللہ کی ذات کو ماننا ہے۔ دنیا میں ایسے بہت سے لوگ ہیں، جو اللہ کو مانتے ہی نہیں، اللہ ہے ہی نہیں۔ نعوذ باللہ۔ ایسی باتیں کرتے ہیں۔ انکار کرنے والوں نے ہر ایک چیز کا انکار کیا، اللہ کے وجود کا بھی انکار کیا؛ البتہ موت ایک ایسی حقیقت ہے، جس کا آج تک کوئی انکار نہیں کر سکا ہے۔ باقی سب چیزوں کا انکار کرنے والے دنیا میں ہیں۔ چنانچہ ایک تو اللہ کے وجود کو مانیں، اور اس کی صفات پر بھی ایمان لائیں، اللہ کے ننانوے (۹۹) ناموں میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی جن صفات کو بیان کیا گیا ہے، ان پر ایمان لانا، اللہ تعالیٰ علیم، علم والا ہے، قدرت والا ہے، سننے والا ہے، دیکھنے والا ہے۔ الی آخرہ..... اللہ اور اللہ کی تمام صفات کو مانو۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ جیسے: پیدا کرنا، پیدا اللہ ہی نے کیا، دنیا میں اللہ کے علاوہ کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے جو پیدا کرنا جانتا ہو، اسی طرح جو کچھ دینے والا ہے وہ بھی اللہ ہی دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ایمان لانا ہوا۔

## و ملئکتہ:

[۲] فرشتوں پر ایمان لانا، وہ ایک مخلوق ہے جو اللہ تعالیٰ نے نور سے پیدا کی ہے، جو نہ تو کبھی اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی کرتی ہے، اور اللہ تعالیٰ جو حکم دیتے ہیں، وہ اس کو پورا کرتی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ. (التحریم: ۱) (اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا اس کے ذرہ برابر بھی خلاف نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا اللہ نے ان کو حکم دیا ہے) اس کائنات کے نظام کو اللہ تعالیٰ چلاتے ہیں، اس نظام

کے چلانے میں یہ سارے فرشتے استعمال ہوتے ہیں۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کا اسٹاف ہیں۔ اور بھی بہت سارے کام اللہ تعالیٰ ان سے لیتے ہیں۔

## و کتبہ:

[۳] اللہ تعالیٰ نے کتابیں بھیجیں۔ توریت حضرت موسیٰؑ پر، زبور حضرت داؤدؑ پر، انجیل حضرت عیسیٰؑ پر، اور قرآن پاک ہمارے پیغمبر حضور ﷺ پر نازل فرمایا۔

## ورسلہ:

[۴] رسولوں پر ایمان لانا۔ حضرت آدمؑ کے زمانے سے لے کر حضور ﷺ تک مختلف ادوار میں موقع بموقع نبی آئے، جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے وحی لے کر آتے تھے، وہ اللہ کے بندوں تک اس وحی کو پہنچاتے تھے، اللہ کے بندوں کو وہ احکام سکھلاتے تھے۔ تو رسولوں کی رسالت اور نبیوں کی نبوت پر ایمان لانا۔ آخری نبی، نبی کریم ﷺ ہیں، آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔ تو آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لانا۔

ان سب چیزوں پر ایمان لانا ہے، یہ ایمانیات کہلاتے ہیں۔ یہ ایمان کی جڑ ہیں، ان کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے، ان کے بغیر کوئی آدمی مؤمن نہیں بن سکتا ہے۔ اور خدا نخواستہ اس میں ذرا بھی انیس بیس ہو گیا، تو آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے۔ شیطان ان ایمانیات کے متعلق وسوسے ڈالتا ہے۔

بعض نوجوان آتے ہیں کہ مولانا! ہم کو خیالات آتے ہیں۔ جب پوچھتے ہیں کہ بھائی! کیا خیالات آتے ہیں؟ نہیں مولانا! میں نہیں بول سکتا۔ ارے بھائی! بول تو سہی، تو

بولے تو ہم اس کا کوئی علاج کریں۔ نہیں، نہیں مولانا! میں بول ہی نہیں سکتا، میں انھیں زبان پر نہیں لا سکتا۔ اس کو کتنا ہی سمجھاؤ؛ لیکن وہ بولے گا ہی نہیں۔ وہی صحابہؓ والی بات کہ **یتعاضم أحدنا أن يتكلم به** وہ خیال اتنا خطرناک ہے کہ ہم میں سے کوئی اس کو اپنی زبان پر لانا بہت گراں سمجھتا ہے۔

## یہ کھلم کھلا ایمان ہے:

کبھی نعوذ باللہ! یہ خیال آتا ہے کہ اللہ میاں ہے بھی یا نہیں؟ حضور ﷺ کبھی آئے بھی کہ نہیں آئے؟ بعضوں کے دل میں نبیوں کے متعلق ایسا وسوسہ آتا ہے۔ یہ ایمانیات کے متعلق وسوسے ہیں۔ جب کسی دیندار آدمی کو ایسا وسوسہ آتا ہے، تو وہ گھبراتا ہے، روتا ہے۔ اور یوں سمجھتا ہے کہ میں تو ایمان سے نکل گیا۔ اور اس کو جب پوچھا جائے تو کہے گا کہ میری تکلیف ایسی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس کے متعلق صحابہؓ نے حضور ﷺ سے پوچھ لیا، دوسرے نمبر پر جو حدیث بیان کی تھی **إن ناسا من أصحاب رسول الله ﷺ سألوا النبي ﷺ إننا نجد في أنفسنا ما يتعاضم أحدنا أن يتكلم به**، (ہم اپنے دلوں میں کچھ ایسی باتیں پاتے ہیں جن کو اپنی زبان سے بولنا اور ظاہر کرنا ہم کو بہت بھاری اور گراں معلوم ہوتا ہے) <sup>(۱)</sup> یا وہ روایت **أحدث نفسي بالشئ لأن أكون حممة أحب إلي من أن أتكلم به** <sup>(۲)</sup> (میں اپنے دل ہی دل میں کچھ باتیں کرتا ہوں، میں جل کر کوئلہ ہو جاؤں یہ مجھے زیادہ پسند ہے نسبت اس کے کہ میں ان باتوں کو اپنی زبان سے بولوں) تو نبی کریم ﷺ

(۱) قدمّرفی ص: ۶۷۔

(۲) قدمّرفی ص: ۶۷۔

نے کیسا عجیب و غریب جواب دیا کہ **ذاک صریح الایمان**۔ (یہ تو کھلم کھلا ایمان ہے) یعنی ایسا وسوسہ آنے پر تم کو جو تکلیف ہوئی اور تمہارا یہ احساس ہے کہ یہ زبان پر نہیں لا سکتے، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارے دل میں ایمان موجود ہے۔ اگر ایمان نہ ہوتا تو آپ اس کو زبان پر لانا بھاری نہ سمجھتے۔ اسی کو حضور ﷺ نے ایمان کی دلیل بتلایا۔

## چور اُسی گھر میں جاتا ہے:

ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے یہی شکایت کی۔ تو حضرت نے فرمایا کہ دیکھو بھائی! چور اسی گھر میں جاتا ہے، جہاں مال ہوتا ہے۔ مال نہیں ہوگا وہاں چور کیوں قدم رکھے گا؟ یہ شیطان تمہارے پاس وسوسہ ڈالنے کے لیے آیا، تو معلوم ہوا کہ تمہارے دل میں ایمان ہے، تبھی تو اس ایمان سے ہٹانے کی وہ کوشش کر رہا ہے۔ اسی کو گویا حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ دو باتیں ہیں: ایک تو شیطان کا اس طرح آ کر محنت کرنا اور دوسرا آپ لوگوں کا ان وسوسوں کو بھاری سمجھنا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارے دل میں ایمان موجود ہے۔ اگر ایمان نہ ہوتا تو یہ خیال نہ آتا۔ جیسے کافروں کو ایسے خیالات نہیں آتے، خیالات تو کیا، بلکہ وہ تو زبان سے ایسی باتیں بولتے ہیں مگر ان کو کچھ بھاری معلوم نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ ایمان ہے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ ایمان نکل گیا، یہ درست نہیں ہے؛ بلکہ یہ تو ایمان کی دلیل ہے۔ ہمارا عقیدہ اپنی جگہ پر ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ صرف اس طرح کے خیالات سے ایمان نہیں جاتا۔

## آبیل مجھے مار:

البتہ ایک بات کہوں گا کہ ایمان ایک بہت قیمتی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا

فرمائی۔ اور کسی بھی آدمی کے پاس جب کوئی قیمتی چیز ہوتی ہے تو اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کو میں ہر طرح بچاؤں، اس کی حفاظت کروں۔ ہمیں اپنے ایمان کی حفاظت بہت محنت سے کرنی ہے، بہت دھیان سے (ہشامیہ) ایمان کی حفاظت کے لیے بہت چوکنا رہنا ہے۔ بہت سے لوگ غلط مضمون نگاروں (مضمون نگاروں) کے مضامین پڑھتے ہیں۔ آج کل تو میڈیا پر مستقل ایسے پروگرام آتے ہیں اور لوگ ان پروگراموں کو دیکھتے ہیں سنتے ہیں، ارے بھائی! شیطان نے تو ہمارے ایمان پر حملہ کرنے کے لیے ہی یہ جاری کیا ہے اور ہم خود جا کر سنیں!!! گویا ہم اپنے ایمان کو خطرے کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ اس سے تو ہمیں اپنے ایمان کو بچانا ہے۔

## ایمان سوز لٹریچر سے بچئے:

آج کل یہ ہو گیا ہے کہ جتنے بھی اخبارات ہیں، گجراتی اخبار: گجرات متر (ગુજરાત મિત્ર)، گجرات سماچار (ગુજરાત સમાચાર) سندیش (સંદેશ) ہیں۔ ان میں ایک دھارمک اضافیہ (ધાર્મિક પુર્ણ) آتی ہے، تو اس کو A to Z پڑھ ڈالیں گے؛ لیکن ان کو کوئی دینی کتاب دیں گے، تو نہیں پڑھیں گے۔ **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاٰجِعُونَ**۔ ان کے پاس اللہ اور اس کے رسول کی باتوں کو پڑھنے کی فرصت نہیں ہے، اور پیسے خرید کر ان اخبارات کو لے کر پڑھتے ہیں۔ اور یہ دین کی کتابیں اللہ کے بندے چھواتے ہیں اور مفت تقسیم ہوتی ہیں، لوگ لے بھی لیتے ہیں؛ لیکن ان کو پڑھنے کی فرصت نہیں۔ آپ میں اکثر وہ ہوں گے جن کے پاس ایسی مفت کی کتابیں آئی ہوں گی، جن کو آج تک کبھی کھول کر بھی



نہیں دیکھا۔ اور اخبار شوق سے دیکھیں گے۔ یہ سب کیا ہے؟ گویا ہم خود اپنے ایمان کو خطرے پر پیش کر رہے ہیں۔

## امام محمد بن سیرینؒ کی احتیاط:

بڑے بڑے علماء، بڑے بڑے تابعین اپنے ایمان کی کیسی حفاظت کرتے تھے؟ حیرت ہوتی ہے۔ امام محمد بن سیرینؒ جو خواب کی تعبیر کے امام ہیں، بہت بڑے تابعی تھے، ان کے پاس ایک مرتبہ گمراہ فرقہ سے تعلق رکھنے والے دو آدمی آئے۔ تابعین کے زمانہ میں ہی گمراہ فرقے پیدا ہو چکے تھے۔ انہوں نے آکر حضرت امام محمد بن سیرینؒ سے کہا کہ ہم آپ کو صرف ایک حدیث سنانا چاہتے ہیں، آپ نے انکار کیا، پھر انہوں نے کہا: ہمیں صرف قرآن کی ایک آیت سنانے دیجیے، بس! اس کے علاوہ ہم اپنی زبان سے کچھ نہیں بولیں گے۔ آیت سنا کر چلے جائیں گے۔ تو حضرت نے کہا: میں تمہاری زبان سے اس آیت کو سننا نہیں چاہتا، ان کے اصرار کرنے پر آپ نے فرمایا: یا تو تم یہاں سے چلے جاؤ یا پھر میں چلا جاتا ہوں۔ چنانچہ وہ دونوں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد کسی نے پوچھا کہ حضرت! وہ اگرچہ گمراہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے؛ لیکن انہوں نے تو ایک ہی بات کہی تھی کہ ہم آپ کو قرآن پاک کی صرف ایک ہی آیت سنانا چاہتے ہیں، تو قرآن کی آیت سننے میں کیا پر اہم تھا؟ تو اس پر حضرت نے کیا جواب دیا؟ ہم لوگوں کے لیے بڑی عبرت ہے۔ ہم تو ان کے علم کے مقابلہ میں انگوٹھا چھاپ (ان پڑھ) ہیں، ان کا علم اتنا عظیم تھا کہ ان کے سامنے ہماری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ پھر بھی انہوں نے کیا جواب دیا؟ کہ ایک گمراہ عقیدے والے آدمی کی زبان سے قرآن پاک کی آیت سن کر ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید

کی اس آیت کے سلسلہ میں میرے دل میں کوئی اعتراض پیدا ہو جائے۔<sup>(۱)</sup> اور ایسا اعتراض کہ بعد میں اس کا حل میری نگاہوں میں نہ ہو اور میں اس کی وجہ سے ایمان سے محروم ہو جاؤں۔ اس لیے میں اس کی زبان سے یہ آیت بھی سننا گوارہ نہیں کرتا۔

## ایسا نہیں کرنا چاہیے:

زبان۔ زبان کا بھی فرق ہوتا ہے۔ چیز ایک ہی ہے؛ لیکن ایک کی زبان سے اس کا اثر اور ہے، دوسرے کی زبان سے اس کا اثر اور ہے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ انہوں نے کتنی احتیاط برتی؟ اب ان کی اس احتیاط کے مقابلہ میں ہمارا کیا حال ہے؟ ہمارا حال تو یہ ہے کہ کھاتے ہیں اگر کم بگڑم، تو پڑھتے بھی ہیں اگر کم بگڑم! جو آیا پڑھ لیا۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے؛ بلکہ پڑھنے کے معاملے میں بھی پہلے تحقیق کر لو۔ ایسا نہیں کہ جو آیا پڑھ لیا، اخبار میں جو مضمون آیا پڑھ لیا۔ آج تو میڈیا نے یہ طے کر لیا ہے کہ مسلمانوں کو ان کے عقائد کے سلسلے میں ایسے شک و شبہ میں ڈالا جائے کہ دھیرے دھیرے وہ اپنے ایمان سے محروم ہو جائیں۔

## ایمان سے محرومی کا سبب:

آج میڈیا کی جانب سے جو باتیں پھیلائی جا رہی ہیں وہ سب گمراہ کن ہیں۔ جیسے طلاق کے سلسلے میں میڈیا جو باتیں چلاتا ہے، ان کو بہت سے لوگ سنتے ہیں، ان کے پاس اپنا تو کوئی علم ہے نہیں، اب سننے کے بعد ان میڈیا والوں نے اس پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ دل میں بیٹھ جاتے ہیں، پھر آ کر پوچھتا ہے کہ مولانا! ان سب سوالات کا کیا؟ ارے یہ

(۱) نقلہ الدارمی عن سعید بن عامر عن اسماء بن عبید (سنن الدارمی: ۱/ ۱۲۱، ط: دارالکتاب العربی، بیروت)۔

سب اعتراضات تو، تو نے اپنے دل میں بٹھالیے! یہ چیز تو ایمان سے محرومی کا سبب ہے۔ کیا ضرورت تھی اس کو سننے کی؟ کبھی کسی عالم دین کے پاس، کسی ماہر کے پاس جا کر کوئی اچھی بات سننے کی توفیق تو ہوئی نہیں، اور یہ سب سن رہے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ یہ سب چیزیں ایمان کو ختم کرنے والی ہیں۔ ہمارا ایمان معمولی نہیں ہے، بہت قیمتی چیز ہے، اس کی حفاظت کا تقاضہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا میں جو پروگرام آتے ہیں، ان کو مت دیکھو، یا پرنٹ میڈیا میں جو مضامین آتے ہیں ان سے بچو، ان کو مت پڑھو۔ خبر پڑھ لی، ٹھیک ہے۔ مگر دین کی باتوں کو تو ہمیں اپنے معتبر علما سے سن کر اس کے مطابق یقین رکھنا ہے۔ آج تو کیا ہو گیا کہ ہر آدمی ہر آدمی کی بات سنتا ہے، پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتا ہے، اور پھر دھیرے دھیرے دین سے ہٹ جاتا ہے۔ اس لیے اپنی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ ان سب چیزوں سے بچو۔

### حضور ﷺ کا غصہ:

مشکوٰۃ شریف میں ایک واقعہ ہے کہ حضور ﷺ کے پاس ایک مرتبہ حضرت عمرؓ توریت کا ایک نسخہ (copy) لے کر آئے۔ اب توریت تو آسمانی کتاب ہے؛ لیکن چوں کہ قرآن میں بھی آ گیا کہ ان لوگوں نے اس میں تحریف کر دی تھی، ادلا بدلی کر دی (Perversions) تھی۔ اس لیے اس کا بھروسہ نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو نسخہ حضرت عمرؓ لے کر آئے تھے وہ ایسا ہی تحریف والا تھا۔ حضرت عمرؓ نے لا کر کہا کہ اللہ کے رسول! یہ توریت کا نسخہ ہے۔ حضور ﷺ خاموش رہے، کچھ بولے نہیں اور حضرت عمرؓ نے اس کو پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ تو اندر دیکھ کر پڑھ رہے ہیں اور ادھر نبی کریم ﷺ کا چہرہ غصہ سے لال ہو رہا ہے۔

حضرت عمرؓ تو پڑھنے میں مشغول ہیں، ان کو پتہ نہیں ہے کہ حضور ﷺ غصہ میں ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ قریب ہی تھے، انہوں نے کہا: **ثکلتک الثواکل یا ابن الخطاب!** (اے ابن خطاب! رونے والی عورتیں تم کو روئیں) یعنی تم کو موت آوے۔ تم نہیں دیکھتے کہ حضور ﷺ کے چہرے کا کیا حال ہے؟ جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ بات کہی تو حضرت عمرؓ نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو حضور ﷺ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ فوراً اس کو بند کیا اور کہا: **أعوذ بالله من غضب الله ومن غضب رسوله رضينا بالله رباً وبالإسلام ديناً وبمحمد ﷺ نبياً.** (میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کے غضب سے اور اس کے رسول کے غضب سے، میں اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور نبی کریم ﷺ کے اللہ کا نبی ہونے پر دل سے راضی ہوں) پھر حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے اگر آج حضرت موسیٰؑ آجائیں، اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرو تب بھی تم گمراہ سمجھے جاؤ گے، اور اگر میرے دور نبوت میں حضرت موسیٰؑ زندہ ہوتے، تو ان کو میری ہی پیروی کرنی پڑتی۔<sup>(۱)</sup> آپ ﷺ نے یہ بات اس لیے فرمائی کہ توریت تو آسمانی کتاب تھی؛ لیکن اس میں بھی تحریف ہو چکی تھی۔ اب آج کل کے رائٹر کی کتابوں کا کیا مطلب ہے؟

اس لیے دیکھو! جس کا علم گہرا ہو، جس نے دین کو سمجھ کر پڑھا ہو، دین کے سارے دلائل اس کے پاس موجود ہوں، وہ اگر ایسی کوئی چیز پڑھتا ہے تو پڑھے! پڑھ کر اس کی خرابیوں کا اس کو پتہ چلے گا تو وہ اس کا جواب تیار کرے گا، لوگوں کو بھی بتائے گا؛ لیکن جس کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے اس کی تو سلامتی اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو ان سے دور رکھے۔

(۱) أخرجه الدارمي برقم: ۴۴۹ (ط: دار المغني للنشر والتوزيع، المملكة العربية السعودية).

الحاصل ایسے اسباب جن سے ایمان میں شک و شبہ پیدا ہو سکتا ہے، وسوسے آسکتے ہیں ان سے بھی اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

## کھڑکی کھلی رہ گئی:

مجھ پر بہت ہوں تو لوگ کیا کرتے ہیں؟ عصر کے وقت سے کھڑکیاں بند کر دیتے ہیں، اور اگر ایک آدھ کھڑکی بھی کھلی رہ گئی تو کیا کہیں گے؟ یار! آج تو مجھروں نے سونے نہیں دیا۔ کیوں بھائی؟ تو کہیں گے: کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ تو آپ اس طرح کھڑکیاں کھلی رکھیں گے تو ایسا ہی ہوگا۔

یہ وسوسہ کی پہلی قسم ہوئی کہ اگر وسوسے ویسے ہی آگئے اور ہم ان کو برا سمجھ رہے ہیں تو ان کو برا سمجھنا یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہمارے دل میں ایمان ہے۔ اگر کوئی شخص اس کو برا نہیں سمجھے گا تو گویا ہاتھ سے۔ یہ وسوسہ کی پہلی قسم کا حل ہے۔

## (۲) گناہ اور فسق و فجور سے متعلق:

(۲) وسوسہ کی دوسری قسم یہ ہے کہ گناہوں اور فسق و فجور کے وسوسے آئیں۔ یعنی آدمی کے دل میں خیال آئے کہ چوری کر لوں، شراب پی لوں، زنا کر لوں، قتل کر لوں۔ جو شخص اس لائن میں رہا ہو اور توبہ کر چکا ہو اس کو ایسے خیالات بہت آتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ ”چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے۔“

چنانچہ گناہوں اور فسق و فجور کے خیالات کے متعلق میں نے پہلی حدیث پڑھی تھی اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں جارہی ہیں، آپ کے دل میں خیال آیا کہ میں دیکھوں، بدنگاہی کروں۔ دیکھنے کا خیال آیا، دیکھا نہیں؛ اپنے آپ پر کنٹرول کیا، اور نہیں دیکھا تو اس

وسوسہ کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اسی کو حضور ﷺ نے فرمایا: **إِنَّ اللَّهَ تَجَاوَزَ لِي عَنْ أُمَّتِي** ما وسوست به صدورها ما لم تعمل أو تكلم. (قدم تخریجہ ص: ۶۷) (اللہ تبارک و تعالیٰ نے میری امت سے معاف کر دیا ان چیزوں کو جن کے ان کے دلوں میں وسوسے آتے ہیں، جب کہ وہ ان پر عمل نہ کریں) جیسے کسی کو دیکھنے یا زنا کرنے کا خیال آیا کہ میں فلاں عورت سے زنا کروں؛ لیکن اپنے آپ کو اس سے روکا اور زنا نہیں کیا۔ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، دل نے چاہا کہ ذرا فلاں کی برائی کر لوں، لیکن اپنے آپ کو روک دیا، کنٹرول کر لیا، تو محض اس خیال سے گناہ نہیں ہوگا جب تک اس کو اپنی زبان سے ادا نہ کریں۔ بولنے کی چیز ہے اور بولو گے تو گناہ ہوگا، کرنے کی چیز ہے کرو گے تو گناہ ہوگا۔ کرنے کا گناہ تھا، نہیں کیا تو گناہ نہیں، بولنے کا گناہ تھا، نہیں بولے تو گناہ نہیں۔ چنانچہ یہ فسق و فجور کے خیالات کا حل ہے۔

### ..... تو کوئی گناہ نہیں:

کون ایسا ہے جس کو گناہ کا خیال نہ آتا ہو؟ کوئی بڑے سے بڑا بزرگ بھی ہوگا تو اس کے دل میں بھی خیالات اور وسوسے تو آئیں گے۔ دوسری حدیث حضرت ابن عباسؓ کی پیش کی: **أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ أَحَدُثَ نَفْسِي بِالشَّيْءِ لِأَنِّي أَكُونُ حَمِيمَةً أَحِبُّ إِلَى مَنْ أَنَا أَتَكَلَّمُ بِهِ.** (۱) (ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: میں اپنے جی میں کچھ باتیں کرتا ہوں، میں جل کر کوئلہ ہو جاؤں یہ مجھے زیادہ پسند ہے بنسبت اس کے کہ میں ان باتوں کو اپنی زبان سے بولوں) جیسے بعضوں کے دل میں چکر چلتا ہے کہ فلاں عورت سے صحبت کا موقع مل جائے تو مزہ آجائے، یہ دل میں خیال آیا، غیر اختیاری خیال بھی آتا ہے۔ اسی طرح کسی کو

چوری کی عادت رہی ہو اور توبہ کر چکا ہو تو اب خیالات آتے ہیں کہ فلاں جگہ بڑا اچھا مال ہے، فلاں مول (Mall)، شوروم میں ہاتھ مارنے کا بڑا اچھا موقع ہے، ذرا مار لینا چاہیے۔ یہ صرف دل میں خیال آیا اور اس سے اپنے آپ کو روکا، عمل نہیں کیا تو کوئی گناہ نہیں۔

## اللہ کا شکر ہے کہ.....:

جو شخص نیکی میں مشہور ہو جیسے میں کہوں کہ میرے دل میں خیال آیا کہ فلاں عورت کو دیکھوں، یا کوئی اور آدمی جو نیکی میں مشہور ہے، کیا کسی کے سامنے ایسے خیال کا اظہار کر سکتا ہے؟ اپنے پکے اور لنگوٹھے دوست کے سامنے بھی اظہار نہیں کرے گا۔ یہ تو وہ جانے اور اللہ جانے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ بولوں گا تو وہ کہے گا کہ ایسے ہی بزرگ بنا پھرتا ہے!!! حاصل یہ ہے کہ ایسے خیال پر بھی حضور ﷺ نے فرمایا: الحمد للہ الذی رد امرہ الی الوسوسة۔ (قدم تخریجہ فی ص: ۶۸) (اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس کا معاملہ وسوسے تک رکھا) یعنی شیطان تو آیا تھا؛ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

دیکھیے! شیطان صرف وسوسہ ڈالنے کے لیے نہیں آتا؛ بلکہ وہ تو اس لیے آتا ہے کہ میں اس کے پاس یہ کام کروا کر ہی جاؤں گا؛ لیکن اس نے شیطان کا اتنا تو مقابلہ کیا کہ وہ کام اس نے نہیں کیا۔ وسوسہ سے تو اپنے آپ کو بچا نہیں سکا؛ لیکن اس کام سے اس نے اپنے آپ کو بچا لیا۔

## اثر یکاں نہیں ہوتا:

دیکھیے! جیسی چیز ہوتی ہے اثر بھی اسی کے مطابق ہوتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اثر کرنے والے کا اثر، اور جو چیز اس

کا اثر قبول کرتی ہے دونوں سے بڑا فرق پڑتا ہے۔<sup>(۱)</sup> جیسے ایک بڑا پتھر لے کر آپ نے مارا، سامنے اگر شیشہ ہے تو چکنا چور ہو جائے گا۔ اور اگر شیشہ نہیں؛ بلکہ کوئی اور خوب صورت چیز ہے، تو وہاں نشان پڑ جائے گا؛ لیکن وہ ٹوٹے گا نہیں۔ یا جیسے دو پہر کی سخت گرمی ہے، جون کی گرمی ہے، اوپر سے سورج کی شعاعیں آتی ہیں تو کیا ہوتا ہے؟ پتھر ہے تو گرم ہو جائے گا، اور اگر پیتل ہے تو اور زیادہ گرم ہوگا۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ پیتل کا بھیجا ہے، بہت جلدی گرم ہو جاتا ہے۔ لکڑی ہے تو وہ بھی گرم ہو جائے گی، یہاں تک کہ یہ زمین، مٹی وہ بھی گرم ہوتی ہے؛ لیکن پتھر زیادہ گرم ہوگا، پیتل اس سے زیادہ گرم ہوگا، لکڑی ان سے کم گرم ہوگی۔ مٹی گرم ہوتی ہے تو اس پر ہم جیسے شہر میں رہنے والے جو کھلے پاؤں چلنے کے عادی نہیں ہوتے، نہیں چل پاتے۔ دیہات والے تو چل لیتے ہیں۔ جیسی جگہ اس کے مطابق اثر ہوتا ہے۔ اور پتھر کی ایک قسم وہ بھی ہے جو کسی قسم کا اثر قبول نہیں کرتی، آپ حج و عمرہ کرنے گئے ہوں گے، وہاں مطاف میں سفید پتھر لگے ہوئے ہیں، وہ مصنوعی (artificial) نہیں ہیں، قدرتی ہیں، ایسا پہاڑ اللہ نے پیدا کیا ہے جو سورج کی شعاعوں کو اپنے اندر جذب ہی نہیں ہونے دیتا، ٹھنڈا ہی رہتا ہے، ان شعاعوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسے ہی شیطان آدمیوں پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ اب آدمی آدمی میں فرق ہے، کوئی پیتل جیسا، کوئی لوہے جیسا، کوئی پتھر جیسا، کوئی لکڑی جیسا اور کوئی حرم میں لگے ہوئے مرمر کے پتھر کی طرح ہوتا ہے۔ ورنہ شیطان تو آتا ہے، اور پورے حوصلے کے ساتھ آتا ہے کہ اس سے تو میں یہ کام کروا کر ہی جاؤں گا۔ زنا کروا کر ہی جاؤں گا؛ لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتا۔ دل میں صرف

(۱) حجة الله البالغة: ۱/ ۲۸۲ (ط: دار العیل، بیروت، لبنان)



وسوسہ آیا تو اس کو حضور ﷺ نے فرمایا: الحمد لله الذي رد أمره إلى الوسوسة. (اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس معاملہ کو وسوسہ تک رکھا)

## حسان تو بچ گئی:

اس کو ایک مثال سے یوں سمجھو کہ کسی کے گھر پر رات کو چوروں نے حملہ کیا، خوب پٹائی کی، ٹانگیں توڑ ڈالیں، ہاتھ توڑ ڈالے، وہ اسپتال میں داخل ہے، آپ اس کی عیادت کے لیے گئے اور پوچھا کہ بھائی! کیا حال ہے؟ تو کہتا ہے کہ الحمد للہ! جان بچ گئی۔ یہ الحمد للہ کس چیز پر ہے؟ تیری ٹانگیں ٹوٹ گئیں، تیرا ہاتھ ٹوٹ گیا!! تو وہ کہتا ہے: ٹانگیں اور ہاتھ ٹوٹ گئے اس کا تو علاج ہو جائے گا، جان تو بچ گئی۔ چنانچہ صرف وسوسہ آیا؛ لیکن وہ کام نہیں کیا، تو بہت سی مرتبہ اللہ تعالیٰ خالی وسوسہ کے ذریعہ سے ہم کو بچا لیتے ہیں۔

## بانیکاں بنشیں:

بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ مولانا! دعا کیجئے نا! یہ برے برے خیالات آویں ہی نہیں۔ نہ رہے بانس نہ بچے بانسری۔ ارے اللہ نے انسان کو پیدا ہی ایسا کیا ہے، تنہی تو انسان کا کمال ہے کہ اس میں گناہ کی صلاحیت ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اس سے بچاتا ہے۔ یہ دوسری قسم جس میں گناہوں اور فسق و فجور کے خیالات آتے ہیں، ان میں اپنے آپ پر کنٹرول کیا تو ان خیالات کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ بہت سے لوگ ایسے خیالات کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں۔ البتہ یہ ضرورت ہے کہ ایسے خیالات بھی نہیں آنے چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں اپنا ماحول سدھارنے کی ضرورت ہے۔ بہت سے لوگ دین دار ہوتے ہیں؛ لیکن پھر بھی تھوڑی دیر چاشنی حاصل کرنے کے لیے دوسری پارٹی میں

بیٹھ جاتے ہیں، اور وہاں باتیں ہونے کی وجہ سے اس کا دماغ بھی ٹک ٹک کرتا ہے کہ ان کی بات تو صحیح ہے، ذرا ایک مرتبہ ان کے ساتھ چوپاٹی پر ہو آویں۔ بھائی! آپ کو تو اس ماحول میں جانا ہی نہیں تھا۔ جیسے میں نے کہا کہ ہمیں اپنے ایمان اور اپنے نیک عمل کی حفاظت ہیرے جواہرت سے زیادہ کرنی ہے۔ نہ ایسے آدمیوں کی صحبت میں رہو، نہ ایسا ماحول اختیار کرو، ہر برائی سے اپنے آپ کو دور رکھو۔

بہر حال! یہ وسوسہ کی دوسری قسم ہے، اس کا حکم بھی یہی ہے کہ ہم اس کے تقاضہ پر عمل نہ کریں۔ لیکن یاد رکھنا! آدمی اگر اپنا ماحول نہیں بدلے گا تو پھر دھیرے دھیرے وہ پھنس ہی جائے گا، اور اس کا نظریہ بدل جائے گا۔

### (۳) بے موقع وسوسہ:

(۳) وسوسہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ وہ وسوسہ تو ہے؛ لیکن گناہ کا نہیں ہے۔ بلکہ بے موقع آیا۔ اللہ اکبر کہہ کر نماز کی نیت باندھی، اور پہنچ گئے دکان پر۔ تو دکان کا خیال کوئی گناہ کا خیال نہیں ہے۔ گھر میں پہنچ گئے، بیوی کے ساتھ باتیں ہو رہی ہیں، اور الحمد بھی پڑھی جا رہی ہے، تو بیوی کے ساتھ باتیں کرنا کوئی گناہ کا کام نہیں ہے؛ لیکن وہ نماز میں ہو رہا ہے، بے موقع ہو رہا ہے۔ یہ تیسری قسم ہے۔ اس سے بھی لوگ بہت پریشان ہیں۔ اور اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ ہم نے اپنی نماز پر جو محنت کرنی چاہیے تھی وہ نہیں کی ہے۔ نماز میں ایسے خیالات نہ آویں، یہ مفت میں نہیں ہوگا۔ اس دھیان کے لیے محنت کرنی پڑے گی، نماز میں جو پڑھا جا رہا ہے اس کی طرف توجہ کرنی پڑے گی۔

## نماز؛ ایک شیڈیول:

نماز کا ایک شیڈیول ہے۔ آپ استنجا کرتے ہیں، اس کے بعد وضو کرتے ہیں، اس کے بعد فرض نماز سے پہلے سنت پڑھتے ہیں، پھر فرض پڑھنے تک کا پورا پروگرام ہے۔ آپ دعوت کھانے جاتے ہیں، تو شاندار قسم کی دعوتوں میں کیا ہوتا ہے؟ پہلے سوپ آیا، وہ ابھی تھوڑا سا چکھا کہ کچھ اور آیا۔ ایک ساتھ سب نہیں آتا، دھیرے دھیرے لایا جاتا ہے، وہ آپ کی بھوک کو کھولنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح نماز کی بھی شریعت نے ایک ترتیب رکھی ہے۔

ہمارا حال کیا ہے؟ اذان تو کب سے سن لی ہے، اب اگر ہم اذان سنتے ہی تیاری کر لیتے، یا اذان سے پہلے ہی تیاری کر لیتے تو آسان تھا؛ لیکن اذان سننے کے بعد بھی بیٹھے رہیں گے۔ پانچ دس منٹ باقی ہے اس وقت آئے، اب پیشاب کا تقاضہ ہے، تو سیدھے استنجا خانہ میں چلے گئے، یہاں نماز کھڑی ہو گئی، اور ابھی تو قطرے بند ہوئے بھی نہیں کہ پانی ڈال دیا۔

## شیطان بڑا چٹور یا ہے:

باقی رہنے والے قطروں کا مستقلاً مسئلہ ہے، اہل علم سے پوچھو، جب تک مکمل طور پر قطرہ نکلنا بند نہ ہو جائے تب تک پانی ڈالنا درست نہیں ہے۔ اس کو استبراء کہتے ہیں، یعنی پیشاب پوری پوری نکل جائے۔ آدھی نگلی اور آدھی باقی رہی اور پاجامہ پہن لیا تو پاجامہ بھی ناپاک ہوگا، جب پاجامہ ناپاک ہے تو نماز کہاں درست ہوئی؟ یہ بھی ایک شیڈیول ہے، ہمیں اس کو اپنانا ہے۔ تو شیطان کے وسوسوں کی شروعات یہیں سے ہوتی ہے کہ شیطان خود ناپاک ہے، اور ہم نے ناپاک کی شروع سے ہی رکھی، تو شیطان کو وسوسے ڈالنے کا مزید موقع

مل گیا۔ شیطان بڑا چٹور یا ہے، اس کو یہ گندگی بہت اچھی لگتی ہے۔ اس لیے ہمیں استنجاء کے معاملے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ احتیاط بھی نہیں جو وہم والے کرتے ہیں کہ ایک ایک گھنٹہ تک ختم نہ ہو، لیکن شریعت کی حد میں رہ کر احتیاط رکھنا ہے۔

## وضو میں اسراف؛ خشوع ختم:

ہمارے وضو کے طریقے، اللہ کی پناہ!!! باتیں ہو رہی ہیں، نل کھول دیا ہے، پانی گرتا جا رہا ہے۔ آپ کتابوں میں پڑھیے! وضو میں ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کرنا جس کو پانی کی فضول خرچی کہتے ہیں، اگر یہ پانی اپنا ہو تو مکروہ تحریمی ہے اور مسجد کا ہو تو حرام ہے۔ مسجد کا پانی وقف ہے، ہمیں اتنا ہی پانی استعمال کرنے کی اجازت ہے، جس سے ہمارا وضو ہو جائے، اور ہم نل کھول کر بیٹھے ہیں، باتیں کر رہے ہیں۔ وضو شروع کرنے سے پہلے دس بالٹیاں پانی تو ویسے ہی ضائع ہو جاتا ہے۔

پانی کے ضیاع اور بربادی کی نحوست یہ ہوتی ہے کہ آدمی کی نماز سے خشوع اور خضوع نکل جاتا ہے۔ پانی کے بے جا استعمال کو خشوع کے نکالنے میں بڑا دخل ہے۔ جس نماز کی شروعات ہی حرام کام سے ہوئی وہ نماز کیسی ہوگی؟ اس لیے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ نماز میں پڑھنا شروع کریں تو ہمیں اپنا دھیان پڑھنے میں لگانا چاہیے۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ اللہ اکبر کہا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹیپ ریکارڈ کی سوچ آج آن کر دی، ادھر ہماری زبان چل رہی ہے **سبحانک اللہم وبحمدک الخ۔۔۔** اور دل کہاں گھوم پھر رہا ہے؟ کہاں باتیں ہو رہی ہیں؟ کہیں چائنا خریدی کرنے جانا تھا تو اسی نماز میں پورا سفر بھی ہو گیا۔ یہ کیا ہے؟ نماز میں دھیان لگانے کے لیے جو محنت کرنی تھی وہ آج تک کبھی ہم نے کی ہی نہیں۔

## لگے رہو.....:

ابھی میری تقریر سنی تو ہر ایک کو دل میں خیال آئے گا کہ یار! بات تو صحیح ہے، نماز میں دھیان لگانا چاہیے۔ تو اب کیا کریں گے؟ اب تو میں صبح کی نماز بہت دھیان لگا کر پڑھوں گا۔ اب نیت باندھی اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (الفاتحہ: ۱) پڑھا، بہت دھیان سے پڑھا۔ اور الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (الفاتحہ: ۲) پڑھے اتنی دیر میں تو گاڑی پٹری سے اتر گئی۔ کہاں دھیان چلا گیا وہ بھی یاد نہیں رہا، ایسا دھیان گیا کہ ساری نماز پوری ہو گئی تو بھی یاد نہیں آیا، دودن کے بعد یاد آیا کہ ارے! نماز تو دھیان سے پڑھنی تھی۔ آج سے دودن پہلے خیال آیا تھا وہ اب آیا، کوئی بات نہیں! آپ لگے رہو۔ بھول ہو گئی، ٹھیک ہے۔ آج یہ ہوگا کہ الرحمن الرحیم تک گاڑی پٹری پر رہی۔ پھر مُلکِ یوم الدین آیا اور اتر گئی؛ لیکن آپ لگے رہو۔۔۔۔۔ لگے رہو۔۔۔۔۔ ایک دن آئے گا کہ آپ کا دھیان نماز میں لگ جائے گا۔

## من جد و جد:

ہر چیز کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ ایک آدمی بڑا تاجر ہے، اس کی بڑی دکان ہے تو کیا ایک دن میں وہ بڑا تاجر بن گیا؟ دکان بن گئی؟ نہیں۔ نو ساری کے ہمارے ایک ملنے والے دوست تھے، ان کی کپڑے کی بڑی اچھی دکان تھی، وہ اپنا واقعہ بڑے شوق سے بیان کرتے تھے کہ مولانا! میں تو پہلے وہاں فٹ پاتھ کے اوپر پتھار الگا کر مارجس بیچتا تھا۔ اس کے بعد یوں ہوا۔۔۔ اس کے بعد یوں ہوا۔۔۔۔۔

یہ امبانی پہلے دن میں بن گیا؟ نہیں، اس نے معلوم نہیں کتنی محنتیں کی ہوں گی۔ حاصل یہ ہے کہ دنیا ہو یا کوئی اور چیز ہو، آپ کو محنت کے بغیر ملتی نہیں ہے۔ تو نماز میں جی

لگانے کے لیے محنت کرنی پڑے گی، جو آج تک ہم نے نہیں کی۔ ہم تو یوں چاہتے ہیں کہ بس ایک ہی دن میں ہمارا ایسا جی لگے کہ ہم ساتویں آسمان پر پہنچ جائیں۔ نہیں بھائی! ساتویں آسمان پر پہنچنا آسان نہیں ہے۔

آدمی کا ذہن کیسا بنا ہے؟ کوئی چیز آدمی کے شوق کی ہو، جیسے آپ کو کرکٹ کا شوق ہے اور اخبار میں کرکٹ کی تفصیل آئی ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ اس تفصیل کے پڑھنے کے دوران کوئی دوسرا خیال بھولے سے بھی آپ کو نہیں آئے گا۔ کیوں؟ اس لیے کہ کسی چیز کو پڑھنے کے لیے جتنا دھیان دینے کی ضرورت ہے، وہ ۱۰۰% دھیان آپ اس وقت لگا رہے ہیں۔ اس لیے کہ آپ کے شوق کی چیز ہے، اس میں آپ کا دھیان لگتا ہے تو دوسرا خیال آئے گا ہی نہیں۔ اور جو چیز آپ کے دھیان کی نہیں ہے، جیسے قرآن لے کر بیٹھے، آپ کا جی نہیں لگتا تو ہماری توجہ کے سو (۱۰۰) حصے ہیں، ان میں سے ۱۰ حصے قرآن کی پڑھائی میں لگے ہیں تو باقی کے ۹۰ بے کار نہیں رہیں گے، وہ اپنی جگہ ڈھونڈیں گے، چناں چہ اس میں دوسرے خیالات آئیں گے۔ اس لیے ہمیں محنت کرنی ہے اور کرتے کرتے 100 فی صد ہمارا دھیان نماز میں آجائے تب تک ہم چین سے نہ بیٹھیں۔ پھر کوئی خیال نہیں آئے گا۔

## ایں سعادت بزورِ بازو نیست:

ایسے خیالات کی وجہ سے نماز ٹوٹتی تو نہیں ہے؛ لیکن ان سے غافل بھی نہیں ہونا چاہیے، اور پریشان بھی نہیں ہونا چاہیے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ میری نماز کیا ہے؟ خالی اٹھک بیٹھک ہے، خالی سر ٹکرانا ہے۔ ارے بھائی! سر ٹکرانا ہے تب بھی کیا ہوا؟ اللہ نے آپ کو اپنے دربار میں حاضری کی توفیق دی، تو اس کا شکر ادا کرو، بہت سارے وہ ہیں جن کو یہ

سعدت نصیب نہیں ہوتی۔ اللہ نے ہم کو توفیق دی اس معنی کر یہ بڑی سعادت کی چیز ہے۔  
البتہ اس کے لیے جتنی محنت کرنی چاہیے تھی وہ نہیں ہو سکی، یہ ہماری کمزوری ہے، ہمارا  
فلٹ (fault) ہے اس کو ہمیں دور کرنا ہے۔

## من آنم کہ من دانم:

بہر حال! ان خیالات کی وجہ سے اگرچہ نماز نہ ٹوٹے؛ لیکن ہمیں کوشش یہی کرنی  
چاہیے کہ اس کی بھی نوبت نہ آنے پائے۔ اور کوشش کے باوجود خدا نہ کرے، خدا نہ کرے  
خیالات آتے ہیں، تو اس کی وجہ سے۔ ان شاء اللہ۔ نماز فاسد نہ ہوگی، ہمارا فریضہ ادا ہو  
جائے گا۔ ہماری ایسی نماز جس میں دو منٹ بھی ہمارا دھیان نہیں ہوتا، اس کے باوجود ہم  
دوسروں کو کتنا حقیر سمجھتے ہیں!! اللہ نے دو رکعت پڑھنے کی توفیق دی؛ حالاں کہ وہ دو رکعت  
کیسی ہیں، وہ تو ہم ہی جانتے ہیں! اللہ جانتا ہے! لیکن دو رکعت پڑھ کر دوسروں کو ہم حقیر  
سمجھتے ہیں کہ میں کچھ ہوں، میں بڑا اچھا ہوں، مجھ جیسا کوئی نہیں۔ اب جس نماز کو پڑھ کر  
دوسروں کی تحقیر آئے آپ بتائیے! پھر کیا ہوگا؟

بہر حال! نماز میں خیالات کی یہ تین چیزیں تھیں، اس میں اور بھی بہت کچھ تفصیل  
ہے، مختصر طور پر آپ کو بتا دیا۔ اس سلسلہ میں محنت کرو، نماز میں دھیان لگاؤ، اللہ سے دعائیں  
کرو، شیطان سے بچنے کے لیے بھی سورہ ناس پڑھتے رہو، اس کے شر اور اثرات سے بچنے  
کے لیے بار بار اس کو پڑھو۔ ایسا ماحول، ایسی چیزیں جن کی وجہ سے یہ برائیاں آسکتی ہیں ان  
سے اپنے آپ کو دور رکھو ان شاء اللہ ایمان کی بھی حفاظت ہوگی، اور اعمال کو بھی صحیح طریقہ  
سے انجام دینے کی توفیق ہوگی۔

اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

## ادارے کی دیگر مطبوعات

نمبر شمار	اسماء کتب
۱	جدید معاملات کے شرعی احکام
۲	بہار نبوت (اول) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب جوہپوری نمبر (انٹرنیٹ پر دستیاب ہے)
۳	بہار نبوت (ثانی) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب جوہپوری نمبر
۴	برما اور عالمی حالات اپنا طرز زندگی درست کیجیے (اردو، گجراتی)
۵	آئیے! نماز صحیح کریں
۶	علمی و عرفانی شہ پارے
۷	چراغِ سہارنپور
۸	دعا ایسے مانگیں (گجراتی، اردو)
۹	آسان درس قرآن (جزء اول)
۱۰	آسان درس قرآن (جزء ثانی)
۱۱	بیعت ہونے والوں کو ہدایات

DARUL HAMD RESEARCH INSTITUTE

SODAGARWADA, SURAT, GUJARAT (INDIA)

MO: 91731 03824 darulhamd2017@gmail.com



# آسان درس قرآن

(سورة الكافرون تا معوذتین)



حضرت اقدس مولانا مفتی احمد رضا خان پوری دایرہ کا تہم  
سابق صدر مفتی و حال شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل

ناشر: دارالاحمد ریسرچ انسٹیٹیوٹ  
سودا گرواڑہ، سورت، گجرات۔ (الحمد)